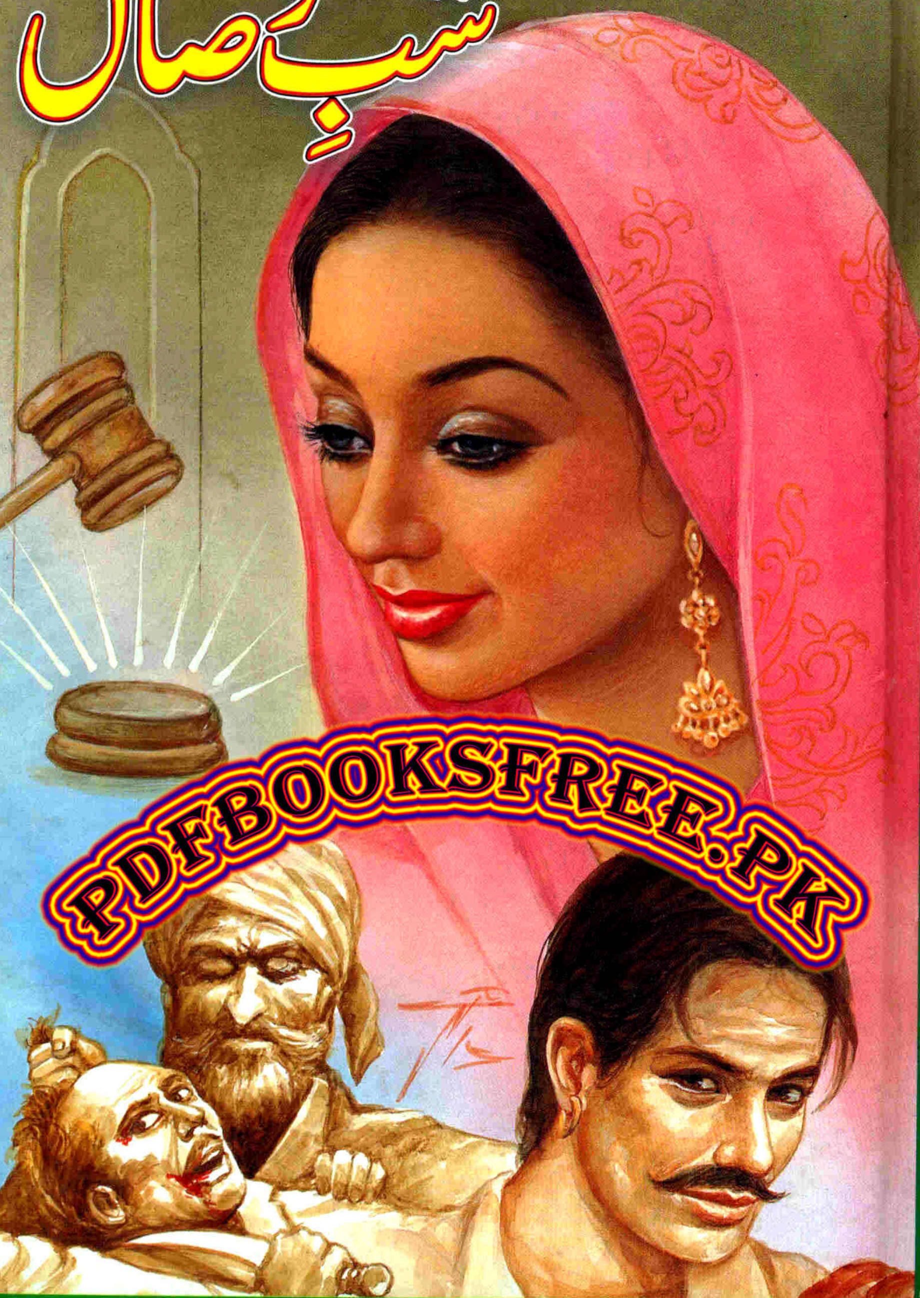
# شبِ وصال




مرزا امجد بیگ (ایڈووکیٹ)

# فہرست

# شبِ وصال

ایک معتبر تجزیہ نگار کے مطابق شام کے اخبارات میں شائع ہونے والی پچاس فیصد خبریں صبح کے اخبارات سے لی گئی ہوتی ہیں۔ باقی پچاس فیصد میں غالب اکثریت مصالحے دار خبروں کی ہوتی ہے' جن میں عموماً جعلی پیروں کے ہوس ناک قصے' شوبز سے متعلق خواتین کی بے باکیاں' آشنائی اور ناشنائی کے ضمن میں ہونے والے عبرت ناک اور لرزہ خیز قتل' مختلف قسم کے ایجنٹوں کے ہاتھوں لٹنے والے سادہ لوح لوگوں کے واقعات اور بدکاری کے اڈوں کی رونمائی وغیرہ شامل ہے۔ بعض اخبارات تو مادر پدر آزاد تصاویر بھی خاص اہتمام سے شائع کرتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد میں اصل واقعہ کی طرف آتا ہوں۔ میں عموماً شام کے اخبارات نہیں دیکھتا' البتہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ اخبارات بڑے چٹ پٹے اور سنسنی خیز ہوتے ہیں۔ زیرِ نظر کہانی چونکہ شام کے اخبار کی ایک خبر سے گہرا تعلق رکھتی ہے' اس لئے میں نے آغاز میں مذکورہ اخبارات اور ان کے مزاج کا ذکر کر دیا۔ وہ اخبار اتفاق سے میرے سامنے آیا تھا' اور اس کی جس خبر نے میری توجہ اپنی جانب مبذول کرائی' وہ کچھ اس طرح سے تھی۔ ''پنڈی بھٹیاں کا نائی' کراچی میں کمائی!''

یہ سرخی بظاہر غیر دلچسپ نظر آتی ہے' لیکن جب میں نے اس سے جڑی خبر کو تفصیلاً پڑھا' تو صورتِ حال یکسر تبدیل ہوگئی۔ اس خبر کے مطابق پنڈی بھٹیاں کا رہنے والا ایک

شخص کراچی میں آ کر اپنی شخصیت تبدیل کر لیتا ہے۔ اس کا نام عبدالرشید تھا' اور پنڈی بھٹیاں میں شیدا نائی کے نام سے مشہور تھا۔ ''نائی'' اس کی ذات تھی۔ برسوں پہلے جب وہ کراچی آیا' تو شیدا نائی سے اے۔ آر۔ بھٹی بن گیا۔ اپنے اصل نام عبدالرشید کو اس نے اے۔ آر میں بدلا اور ذات کو نائی سے بھٹی بنالیا۔ کوئی بھی ذات یا پیشہ بُرا نہیں ہوتا۔ اگر انسان اپنی اصل ذات اور پیشے سے منسلک رہے تو معاشرے میں اس کی شناخت برقرار رہتی ہے' اور اسی میں اس کا وقار بھی ہے۔ جو لوگ اپنی ذات بدل کر دوسروں کو دھوکا دیتے ہیں' اور سمجھتے ہیں کہ اس طرح وہ معزز بن جائیں گے' انہیں ایک روز بری طرح پچھتانا پڑتا ہے' پھر ان کا حشر بھی شیدا نائی سے مختلف نہیں ہوتا۔ کوا چاہے کچھ بھی کر لے' مگر ہنس نہیں بن سکتا' اور اس کوشش میں وہ اپنی چال بھی بھول جاتا ہے' پھر ایک روز اس ہٹ دھرمی کا خمیازہ اسے بھگتنا ہی پڑتا ہے۔

تو میں آپ کو بتا رہا تھا کہ شیدا نامی شخص کراچی آ کر اے۔ آر بھٹی بن گیا اور مختلف قسم کے چھوٹے موٹے کام کرنے کے بعد وہ بالآخر ریکروٹنگ ایجنٹ بن گیا۔ اس بزنس کے لئے اس نے کمرشل ایریا میں ایک عمدہ فلیٹ حاصل کر لیا تھا' جس کے ایک کمرے میں آفس کے ساتھ اس کی رہائش بھی تھی۔ اس کا ''بزنس'' عروج پر تھا کہ ایک روز اسے اس کی رہائش گاہ پر قتل کر دیا گیا۔

شام کے اخبار میں شائع ہونے والی یہ اسٹوری دیگر کہانیوں کی طرح میرے ذہن سے اتر جاتی' اگر میں اس کا حصہ نہ بنا ہوتا۔ جی ہاں! جس شخص کو شیدا نائی کا قاتل ٹھہرایا جا رہا تھا' حالات نے اسے میرا مؤکل بنا دیا۔ اس طرح میں بھی اس کہانی کا ایک کردار بن گیا۔ ملزم کا نام تھا' خالد بھٹی!

ایک روز میں اپنے آفس میں موجود تھا' کہ دو افراد میرے چیمبر میں داخل ہوئے۔ ظاہر ہے' وہ اپنی باری پر اور میری سیکرٹری کے بھیجنے پر ہی مجھ تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ ان پر نگاہ پڑتے ہی میں جان گیا کہ وہ کراچی سے تعلق نہیں رکھتے تھے' اور ازاں بعد میرا یہ اندازہ صد فیصد درست ثابت ہوا۔

میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ ان کا استقبال کیا اور میز کی دوسری جانب



بچھی کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہیں بیٹھنے کے لئے کہا۔ وہ خاموشی سے بیٹھ گئے۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''آپ غالباً کسی دوسرے شہر سے آئے ہیں۔ اگر میں غلطی نہیں کر رہا' تو آپ کا تعلق صوبہ پنجاب کے کسی ضلع سے ہے۔''

ان دونوں میں سے بڑی عمر کے شخص نے اثبات میں گردن ہلائی' اور بڑی رسان سے بولا۔ ''آپ کوئی غلطی نہیں کر رہے وکیل صاحب! ہمارا تعلق پنجاب کے علاقے پنڈی بھٹیاں سے ہے' لیکن یہ بتائیں کہ آپ نے یہ اندازہ کس بنا پر لگایا ہے۔ میرا مطلب ہے کراچی پاکستان کا ایسا شہر ہے کہ جہاں ملک بھر سے مختلف رنگ و نسل اور قومیتوں کے لوگ آ کر آباد ہوئے ہیں' بلکہ بڑی تعداد غیر ملکیوں کی بھی یہاں رہائش پذیر ہے۔ کراچی کو ''منی پاکستان'' کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔'' وہ ذرا سا رکا' اور پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ''جب کراچی میں ملک کے کونے کونے کے افراد آباد ہیں' تو ہمیں دیکھ کر آپ نے کیونکر اندازہ قائم کیا کہ ہم کہیں باہر سے آئے ہیں؟''

''آپ اسے میرا مشاہدہ' تجربہ یا چھٹی حِس...... کچھ بھی کہہ لیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں بندے کو دیکھ کر اندازہ لگا لیتا ہوں۔ بہرحال' بتائیں میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

''میرا نام سردار بھٹی ہے' اور یہ میرا چھوٹا بیٹا امتیاز بھٹی ہے۔'' اس شخص نے اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا۔ ''سچی بات یہ ہے وکیل صاحب کہ مجھے ایک مصیبت کھینچ کر آپ کے پاس لے آئی ہے' اور مجھے آپ کے تعاون اور مدد کی ضرورت ہے۔''

میں نے کاغذ قلم سنبھال لیا' اور سوالیہ نظروں سے سردار بھٹی کو دیکھنے لگا۔

سردار کی عمر پچپن کے قریب ہوگی۔ وہ دراز قامت اور ہاتھ پاؤں کا مضبوط شخص تھا۔ عمر کی مناسبت سے صحت بھی قابلِ رشک تھی۔ تاہم کن پٹیوں پر چاندی چمکنے لگی تھی۔ اس کی کاٹھی اور جسامت کو دیکھ کر لگتا تھا کہ یا تو وہ فنِ پہلوانی کا شوقین رہا تھا' یا پھر اس کا تعلق پاک افواج سے تھا۔

امتیاز بھٹی کی عمر کم و بیش بیس سال تھی۔ وہ ایک میانہ قد اور دبلا پتلا نوجوان تھا۔ وہ

خاصا الجھا ہوا اور کم گو دکھائی دیتا تھا۔ چند لمحات کی خاموشی کے بعد سردار بھٹی نے بتانا شروع کیا۔

''وکیل صاحب! میں امتیاز کے ساتھ کل رات ہی کراچی پہنچا ہوں اور ہم صدر ایک ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ میرے صرف دو بیٹے ہیں۔ ایک یہ امتیاز اور دوسرا خالد۔ خالد امتیاز سے آٹھ سال بڑا ہے اور اسی کی وجہ سے ہمیں کراچی آنا پڑا ہے۔ یہاں کی پولیس نے خالد کو قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا ہے۔''

''اوہ......!'' وہ تھما تو میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ واقعہ کب کا ہے؟''

''دو...... بلکہ تین......نہیں...... چار دن پہلے کا۔'' سردار بھٹی نے جواب دیا۔

''آپ کے بیٹے نے کس کو قتل...... میرا مطلب ہے اس پر کسے قتل کرنے کا الزام ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس بدبخت کا نام ہے......شیدا نائی!'' سردار بھٹی نے دانت پیستے ہوئے بتایا۔

یہ سن کر شام کے اخبار میں شائع ہونے والی خبر میری یادداشت میں تازہ ہوگئی۔ میں نے اضطراری لہجے میں سردار بھٹی سے پوچھا۔

''کہیں آپ اس شیدا نائی کی بات تو نہیں کر رہے جو اے۔ آر بھٹی کے نام سے کراچی میں ریکروٹنگ ایجنسی کر رہا تھا۔ اس نے لوگوں کو بیرون ملک بھیجنے کی باقاعدہ ایجنسی بنا رکھی تھی۔ ''بھٹی اوورسیز کارپوریشن!''

انہوں نے چونک کر ایک دوسرے کی صورت دیکھی پھر سردار بھٹی نے سرسراتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ''وکیل صاحب! کیا آپ اس کمینے مردود کو جانتے ہیں؟''

میں نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''میں اس شخص کو محض اخباری خبر کی حد تک جانتا ہوں۔ پچھلے دنوں میں نے شام کے ایک اخبار میں یہ خبر پڑھی تھی۔ ''پنڈی بھٹیاں کا نائی کراچی میں کمائی۔'' اس خبر کی تفصیل میں بتایا گیا تھا کہ عبدالرشید عرف شیدا نائی برسوں پہلے کراچی آیا اور ایک نیا نام اے۔ آر بھٹی اختیار کر کے رہنے لگا پھر بتدریج ترقی کرتے ہوئے وہ ریکروٹنگ ایجنٹ بن گیا...... وغیرہ وغیرہ!''



''اس کو ترقی نہیں کہتے جناب!'' سردار بھٹی نے میری بات پوری ہونے سے پہلے زہر خند لہجے میں کہا۔ ''ہر وہ کام جس کی بنیاد جھوٹ اور فراڈ پر رکھی جائے وہ قابلِ مذمت ہے اور اس کے مرتکب کو کڑی سے کڑی سزا ملنی چاہیے۔'' وہ ذرا رکا ایک گہری سانس خارج کی اور سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''واقعی۔ وہ ذلیل پنڈی بھٹیاں کا نائی تھا اس نے کراچی میں کمائی بھی کی لیکن اس کی وجہ سے ہم خوامخواہ مصیبت میں پھنس گئے۔ خود تو مر گیا اور میرے بیٹے پر عذاب ڈال گیا۔''

سردار بھٹی اپنی وضع قطع اور رکھ رکھاؤ سے پنجاب کے کسی قصبے کا رہنے والا ضرور نظر آتا تھا لیکن میں نے ایک بات محسوس کی کہ وہ صحیح تلفظ کے ساتھ بہت اچھی اور صاف اردو بول رہا تھا۔ اس بات نے نہ صرف مجھے چونکنے پر مجبور کیا بلکہ میں اس سے پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''بھٹی صاحب! آپ نے تعلیم کہاں تک حاصل کی ہے؟''

''میں صرف پرائمری تک پڑھ سکا اور یہ پرائمری انگریزوں کے زمانے کی ہے۔'' اس نے فخریہ لہجے میں جواب دیا۔ ''پھر میں برٹش آرمی میں چلا گیا۔ عملی زندگی ساری کی ساری آرمی میں گزری۔ ہمارے ساتھ ایک صمد بخاری ہوتے تھے جن کا تعلق لکھنؤ سے تھا۔ بخاری سے میری گہری دوستی تھی اسی سبب میری اردو بہتر ہوگئی۔ آرمی میں ہم اردو بولتے تھے یا پھر انگلش۔'' وہ سانس ہموار کرنے کے لئے رکا پھر گفتگو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''پاکستان معرض وجود میں آیا تو میں پاک آرمی میں شامل ہوگیا اور پھر پینسٹھ کی جنگ لڑنے کے بعد ریٹائر ہوا۔''

میں نے پوری توجہ سے اس کی بات سنی اور سوال کیا۔ ''آپ کی ریٹائرمنٹ کس عہدے پر ہوئی؟''

''جناب! عہدے کے اعتبار سے میں لانس نائیک تھا اور ریکوری ڈرائیور کے طور پر خدمات انجام دے رہا تھا۔'' اس نے فخریہ لہجے میں بتایا۔ ''جنگ کے دوران میں فرنٹ لائن پر لڑنے والے فوجی جوانوں کو اسلحہ اور گولہ بارود وغیرہ پہنچاتا تھا اور بعض اوقات تو

میں نے گن اٹھا کر فائٹ بھی کی۔''

''آج کل آپ کا شغل کیا ہے۔ریٹائرمنٹ کی زندگی خاصی بور محسوس ہوتی ہوگی؟'' میں نے پوچھا۔

''اگر میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتا' تو بوریت کا شکار ہوکر زندگی گزارنا شاید میرے لئے مشکل ہو جاتا۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔''لہٰذا میں نے خودکو مصروف رکھنا ضروری جانا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد میں نے اُدھر پنڈی بھٹیاں ہی میں مٹھائی کی ایک دکان کھول لی۔شروع میں چھوٹی سی دکان تھی' لیکن گزشتہ چند برسوں میں بڑھتے بڑھتے یہ اب ایک کشادہ اور شاندار دکان کا روپ دھار چکی ہے۔لوگ بڑے چاؤ سے میری دکان کی مٹھائیاں لے جاتے ہیں۔ میری زندگی میں کوئی جھمیلا' کوئی پریشانی نہیں۔بس ایک خلش ہے۔''

میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔''کیسی خلش؟''

وہ بھرّائی ہوئی آواز میں بولا۔''میری شدت سے یہ خواہش تھی کہ میرے بیٹوں میں سے کوئی ایک ضرور فوج میں جائے' لیکن افسوس کہ میری یہ تمنا پوری نہ ہوسکی۔امتیاز کو تو کسی بھی قسم کی فورس جوائن کرنے کا قطعاً شوق نہیں۔خالد کو پولیس میں جانے کا جنون تھا۔اس کے ماموں نے اس سلسلے میں کوشش بھی کی لیکن...... خیر چھوڑیں اس قصے کو ورنہ ایک نئی کہانی شروع ہوجائے گی!'' وہ بات کو جلدی سے سمیٹ کر خاموش ہوگیا۔

میں نے بھی اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے سوال کیا۔

''بھٹی صاحب! آپ کے بیٹے خالد بھٹی کو چار دن پہلے اے۔آر۔ بھٹی یعنی شیدا نائی کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا ہے۔آپ مجھے یہ بتائیں کہ کیا وہ کراچی گھومنے پھرنے آیا تھا' یا مستقل طور پر یہاں رہ رہا تھا؟''

سردار بھٹی نے جواب دیا۔''ہماری معلومات کے مطابق تو وہ پچھلے ایک سال سے سعودی عرب میں تھا۔اس کی گرفتاری کے بعد ہمیں پتا چلا کہ وہ گزشتہ کچھ دنوں سے کراچی میں تھا۔''

''یہ ایک الجھی ہوئی صورتِ حال ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے



کہا۔''اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ کے بیٹے کی رہائی کے لئے آپ کا ساتھ دوں' تو آپ پوری تفصیل سے مجھے آگاہ کریں۔''

وہ چند لمحے سوچتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھتا رہا' پھر ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔''وکیل صاحب! یہ ایک طویل اور دکھ بھرا قصہ ہے کہ خالد سعودی عرب کیوں گیا تھا۔ چونکہ موجودہ واقعے سے اس کا کوئی تعلق نہیں' لہٰذا میں اس تفصیل میں جا کر خوانخواہ آپ کا وقت ضائع نہیں کروں گا۔ چار روز پہلے جب خالد کو شیدا نائی کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا' اور اس سے پوچھ گچھ کی گئی' تو اس کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں دو دن پہلے یہاں کی پولیس نے وہاں کی پولیس سے اور وہاں کی پولیس نے ہم سے رابطہ کیا' چنانچہ میں پہلی فرصت میں کراچی چلا آیا۔ میں نے رات ہی متعلقہ تھانے جا کر خالد سے ملاقات بھی کی۔اس کی زبانی تازہ ترین حالات کے بارے میں مجھے جو پتا چلا' وہ میں آپ کو بتا دیتا ہوں' باقی تفصیل آپ اس سے مل کر معلوم کر لیجیے گا۔''

وہ چند ثانیے خاموش رہا' پھر ایک مضمحل سی سانس خارج کی اور بات کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔''خالد کے مطابق لگ بھگ ایک ماہ پہلے وہ سعودی عرب سے واپس پاکستان یعنی کراچی آ گیا تھا۔ وہاں کسی بات پر اپنے کفیل سے اس کا جھگڑا ہو گیا تھا۔ بات زبانی کلامی لڑائی سے ہاتھا پائی پر آ گئی' جس کے نتیجے میں خالد کو جبراً ڈی پورٹ کر دیا گیا۔''

وہ خاموش ہوا تو میں نے سرسری لہجے میں کہا۔''بہر حال...... آپ خالد کے بارے میں مزید بتائیں؟''

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔''وکیل صاحب! خالد نے مجھے بتایا ہے کہ وہ اپنے اس طرح واپس آنے پر سخت پریشان تھا' اور نہیں چاہتا تھا کہ پنڈی بھٹیاں آ کر ہمیں صورتِ حال سے آگاہ کرے۔ لہٰذا اس نے فیصلہ کیا کہ وہ کراچی ہی میں اپنے قدم جمانے کی کوشش کرے گا۔ یہ اس کا ایک جذباتی فیصلہ تھا' لیکن میرا خیال ہے کہ اسے سیدھا ہمارے پاس آنا چاہیے تھا۔ ہمیں اس کے حالات جان کر افسوس ضرور ہوتا' لیکن وہ اس مصیبت سے دوچار نہ ہوتا۔ بہر حال' کیا کیا جاسکتا ہے۔ ہونے والی بات تو آخر ہو کر ہی رہتی ہے۔'' اس نے ذرا سی خاموشی اختیار کر کے ایک بوجھل سانس خارج کی' اور

سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"خالد کی وطن واپسی کوئی ایک ماہ پہلے ہوئی۔ وہ سعودیہ سے تقریباً لُٹ پُٹ کر آیا تھا' تاہم اس کی جیب میں تھوڑی بہت رقم موجود تھی۔ نوکری کی تلاش میں جیب بڑی تیزی سے خالی ہوتی جارہی تھی۔ نوکری تو نہ ملی' مگر ایک روز اسے شیدا نائی نظر آگیا۔ خالد نے اسے پہلی نگاہ ہی میں پہچان لیا' حالانکہ شیدا نائی نے خود کو بالکل ہی بدل ڈالا تھا۔ وہ شیدا نائی' جو پنڈی بھٹیاں کی ایک چھوٹی سی دکان پر بیٹھا استرے کو پتھر پر گھستا رہتا تھا' گاؤں کے لوگوں کی داڑھیاں مونڈتا' حجامت بناتا اور شادی بیاہ وغیرہ میں دیگیں پکایا کرتا تھا۔ اب شہری بابو نظر آرہا تھا۔ خالد کو یہ تو پتا تھا کہ برسوں پہلے شیدا نائی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پنڈی بھٹیاں سے غائب ہوگیا تھا۔

سردار بھٹی نے اتنا بتانے کے بعد میری طرف دیکھا اور پوچھا۔ "وکیل صاحب! آپ میری باتوں سے بور تو نہیں ہورہے؟"

"بالکل نہیں بھٹی صاحب!" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "اپنے مؤکل کی باتوں کو پوری توجہ سے سننا میرے پیشے کا تقاضا ہے' اور آپ چونکہ میری ہی فرمائش پر یہ سب بتارہے ہیں' لہٰذا کسی فکر میں پڑنے کے بجائے بات جاری رکھیں۔"

"شکریہ وکیل صاحب!" اس نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا اور بتانے لگا۔ "جب خالد بھٹی اور شیدا نائی کا آمنا سامنا ہوا' تو خالد نے اس کی آنکھوں میں بھی شناسائی کی بڑی واضح چمک دیکھی' لیکن جب خالد گرم جوشی سے اس کی جانب بڑھا تو شیدے نے بڑی سردمہری کا مظاہرہ کیا' اور اس نے خالد کو بتایا کہ اس کا نام اے۔ آر۔ بھٹی ہے اور وہ کسی شیدا نائی کو نہیں جانتا۔ یہ کہتے ہی وہ تیزی سے مڑا اور ہجوم میں گم ہوگیا۔" سردار بھٹی سانس ہموار کرنے کے لئے تھما' پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"یہ شیدا نائی کا خیال تھا کہ اس نے خود کو ہجوم میں گم کرلیا تھا' جب کہ حقیقت یہ تھی کہ خالد نے ایک لمحے کے لئے بھی اسے اپنی نگاہ سے اوجھل نہیں ہونے دیا' اور تعاقب کر کے اس کے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ تب خالد کو پتا چلا کہ شیدا نائی اپنی ذات تبدیل کر کے اے۔ آر۔ بھٹی بن گیا ہے' اور کراچی کے ایک معروف کاروباری علاقے میں "بھٹی



اوورسیز کارپوریشن" کے نام سے ایک ریکروٹنگ ایجنسی چلا رہا ہے۔ خالد نے یہ پتا بھی لگا لیا تھا' کہ شیدا نائی کی رہائش بھی اسی فلیٹ میں ہے' جس کے ایک کمرے کو اس نے آفس بنا رکھا ہے۔"

سردار بھٹی نے ایک مرتبہ پھر توقف کیا' اور اپنے بیان کو اختتام کی طرف لاتے ہوئے بتانے لگا۔ "رات کو خالد اس سے ملنے پہنچا تو ان دونوں میں خاصی طویل گفتگو ہوئی' جس میں خالد نے بڑے واضح الفاظ میں شیدا نائی کو بتایا کہ اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ وہ نائی سے بھٹی بن گیا ہے۔ کیونکہ یہ اس کا ذاتی معاملہ ہے۔ وہ تو اس سے صرف اتنا چاہتا ہے کہ اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کے لئے وہ اس کی مدد کرے۔ خالد نے شیدا نائی کو اپنے سعودی عرب سے واپس آنے کی مصیبت بھری کہانی بھی سنائی' اور اس سے تعاون کی اپیل کی۔ اس کی خواہش تھی کہ شیدا نائی اپنے اثر و رسوخ سے اسے کہیں کوئی نوکری وغیرہ دلا دے۔ شیدا نائی ریکروٹنگ کی لائن میں رہتے ہوئے بڑا کائیاں اور چلتا پرزہ بن چکا تھا۔ بھانت بھانت کے چکر بازوں سے اس کا واسطہ رہتا تھا۔ اس کے ذہن میں یہی خیال آیا ہوگا' کہ جب تک خالد کراچی میں رہے گا' اس کے سر پر تلوار سی لٹکتی رہے گی' اور اگر وہ کبھی پنڈی بھٹیاں جاتا ہے تو بھی اس کا راز منکشف ہوجائے گا۔ اس نے فوری طور پر خالد کو اپنے ساتھ رکھنے کا فیصلہ کرلیا' اور بڑی ہوشیاری سے بولا۔

"یار خالد! تمہیں اِدھر اُدھر کہیں نوکری کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم میرے ساتھ ہی لگ جاؤ۔ اس طرح تمہاری رہائش کا مسئلہ بھی حل ہوجائے گا۔"

"اس سے اچھی اور کیا بات ہوسکتی ہے۔" خالد نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "لیکن یار' یہ تو بتاؤ' تمہارے پاس کام کرنے والے کی گنجائش تو ہے نا۔۔۔ میں کہیں تم پر بوجھ نہ بن جاؤں؟"

"گنجائش کام میں نہیں' بلکہ دل میں ہونی چاہیے خالد!" اس نے کسی فلسفی کے انداز میں کہا۔ "تم فکر نہ کرو' میں تمہیں خود پر بوجھ نہیں بننے دوں گا۔ تم پر اتنا کام لاد کر رکھوں گا کہ تمہیں سر کھجانے کی فرصت نہیں ملے گی۔"

"یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔" خالد نے تشکر آمیز انداز میں کہا۔ "میں کام سے

گھبرانے والا نہیں ہوں۔ تمہیں پتا نہیں، وہاں سعودیہ میں مزدوروں سے کتنی مشقت لی جاتی ہے!"

"یہ مجھے پتا نہیں ہوگا یار!" شیدانائی بڑے عجیب سے انداز میں ہنسا۔ "میں لوگوں کو سعودی عرب، مسقط، بحرین، کویت اور عراق بھیجتا ہوں۔ میں ان ملکوں کے حالات اور وہاں جا کر کام کرنے والوں کے معاملات سے اچھی طرح واقف ہوں۔" وہ بڑے ڈرامائی انداز میں رک کر پھر گہری سنجیدگی سے بولا۔ "خالد! میں تمہارے کام تو آرہا ہوں، لیکن اس سلسلے میں میری ایک شرط ہے!"

خالد نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "کیسی شرط؟"

"زبان بندی کی شرط!"

"زبان بندی...... کیا مطلب؟" خالد نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔

شیدانائی بدستور گہری سنجیدگی سے بولا۔ "تم میرے ماضی کے بارے میں کبھی کسی کے سامنے زبان نہیں کھولو گے، اس بات کا تمہیں وعدہ کرنا ہوگا!"

خالد نے گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ "یار! میں اتنا کم ظرف نہیں ہوں کہ جس تھالی میں کھاؤں، اسی کو چھیدنے بیٹھ جاؤں۔ تمہارا یہ راز آخری سانس تک یہاں دفن رہے گا۔" بات ختم کرتے ہی خالد نے اپنا سینہ ٹھونکا۔

شیدانائی نے چالاکی سے کہا۔ "میری یہ فرمائش صرف کراچی ہی تک محدود نہیں ہے، بلکہ جب کبھی تم پنڈی بھٹیاں جاؤ تو بھی تمہاری زبان بند ہی رہے۔"

"اس سلسلے میں تم بالکل بے فکر ہوجاؤ۔" خالد نے اسے یقین دلانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "اوّل تو میرا پنڈی بھٹیاں جانے کا ارادہ ہی نہیں، اور اگر کبھی ایسا پروگرام بن بھی گیا، تو میں تم سے کیے گئے وعدے کا پاس رکھوں گا۔"

شیدانائی مطمئن ہوگیا۔ اسی روز سے خالد اس کے فلیٹ میں رہنے لگا، اور کام میں اس کا ہاتھ بٹانے لگا۔ شیدانائی بظاہر تو مطمئن ہوگیا تھا، لیکن خالد نے مجھے بتایا ہے، اسے لگتا تھا کہ شیدانائی کا اطمینان اداکاری سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس دوران ایک دو ناخوش گوار اور عجیب سے واقعات بھی رونما ہوئے، جن کی تفصیل آپ کو خالد ہی بتائے گا۔



بہرحال...... آٹھ نومبر کی رات شیدانائی کو کسی نے اس کی خواب گاہ میں قتل کر دیا، اور خالد کو پولیس نے اس کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا...... یہ ہے ساری کہانی وکیل صاحب!"

"آٹھ نومبر کی رات......" میں نے پُر سوچ انداز میں کہا۔ "آج تیرہ نومبر ہے۔ اس کا مطلب ہے، خالد کا ریمانڈ بھی اب تک آدھا گزر چکا ہوگا۔"

"جی ہاں، آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔" سردار بھٹی نے تائیدی انداز میں کہا۔

"آنے والے پیر کو پولیس چالان عدالت میں پیش کردے گی۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے رف پیڈ پر اہم نوٹس لیتے ہوئے سرسری سے لہجے میں کہا۔

"میں آج ہی...... یا کل کسی وقت خالد بھٹی سے ملتا ہوں۔ آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ تازہ ترین حالات و واقعات کے بارے میں وہی صحیح طور پر مجھے بتا سکے گا۔ وہ اس وقت کس تھانے میں ہے؟"

سردار بھٹی نے متعلقہ تھانے کا نام بتایا۔

میں نے فیس کے معاملات طے کیے۔ سردار بھٹی پنڈی بھٹیاں سے آتے ہوئے اچھی خاصی رقم ساتھ لے کر آیا تھا۔ اس نے فوراً میری فیس ادا کر دی۔ میں نے اسے فیس کی وصولی کی رسید دی اور پوچھا۔

"بھٹی صاحب! کیا آپ کو کسی نے خاص طور پر میرے پاس بھیجا ہے، یا یہ اتفاق ہے کہ آپ اس بلڈنگ میں واقع بہت سے وکیلوں کے دفاتر کے سامنے سے گزر کر مجھ تک پہنچے ہیں؟"

"یہ ہے تو اتفاق ہی، لیکن ذرا دوسری قسم کا۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ "اس دوسری قسم کی تفصیل کیا ہے؟"

اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "وہ جناب! بات دراصل یہ ہے کہ جس ہوٹل میں ہم ٹھہرے ہیں، وہیں پر لاہور کا رہنے والا ایک مسافر بھی رکا ہوا تھا۔ اس بھلے آدمی کا نام ایم۔ اے۔ قریشی ہے۔ لاہور میں اس کا پبلشنگ وغیرہ کا بزنس ہے، اور کاروباری سلسلے میں وہ کراچی آیا ہوا تھا۔ کل رات ہی ٹی وی روم میں ہماری ملاقات ہوئی، اور قریشی

صاحب نے ہماری مصیبت کا سن کر آپ کے بارے میں بتایا۔ وہ آپ کے دفتر کا ایڈریس تو نہیں جانتا تھا۔ بس اسے اتنا پتا تھا کہ سٹی کورٹ کے قریب ہی کسی عمارت میں آپ کا آفس ہے۔ بہرحال، ہم پوچھتے پاچھتے آپ تک پہنچ گئے ہیں۔"

اس زمانے میں صدر کے چھوٹے اور متوسط ہوٹلوں کے کمروں میں ٹی وی کی سہولت موجود نہیں تھی۔ ایک بڑے سے ہال نما کمرے کو ٹی وی روم بنا دیا جاتا تھا، جہاں مسافر مختلف پروگرامز سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ یہ ہال نما کمرہ...... بہ یک وقت تین قسم کی سہولیات فراہم کرتا تھا۔ نمبر ایک، استقبالیہ۔ نمبر دو، ویٹنگ روم۔ نمبر تین، ٹی وی روم۔ گویا وہ زمانہ آج کے زمانے سے چار ہاتھ آگے تھا، جب ٹو ان ون کے بجائے تھری ان ون کا رواج عام تھا۔ یہ الگ بات کہ اس اصطلاح کو استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔

میں نے سردار بھٹی سے پوچھا۔ "آپ نے مقتول شیدا نائی عرف اے۔ آر۔ بھٹی کی فیملی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ کیا پنڈی بھٹیاں سے اس کی فیملی کے لوگوں کو بھی یہاں بلایا گیا ہے؟"

"وہاں پنڈی بھٹیاں میں اس کا صرف ایک چاچا تھا رحمو نائی۔" سردار بھٹی نے جواب دیا۔ "ماں باپ کی وفات کے بعد شیدا نائی قصبے سے غائب ہو گیا تھا، اور اس کا کوئی بہن بھائی بھی نہیں تھا۔ پولیس والوں کا کہنا ہے کہ انہوں نے رحمو نائی کو کراچی بلا لیا ہے، لیکن جب میں نے کہا کہ مجھے رحمو سے ملوایا جائے، تو انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ پولیس والے غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں، کیونکہ اگر رحمو کو بلوا لایا گیا ہوتا، تو یہ بات مجھ سے چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ آخر میں بھی تو وہیں سے آیا ہوں۔ ہمیں جو اطلاع پہنچائی گئی تھی، وہ یہ تھی کہ خالد نے وہاں کراچی میں کسی کو قتل کر دیا ہے۔ مقتول کا نام اے۔ آر بھٹی بتایا گیا تھا۔ یہ تو یہاں آ کر پتا چلا کہ مقتول کوئی اور نہیں، بلکہ پنڈی بھٹیاں کا گمشدہ شیدا نائی ہے۔ میرا خیال ہے کہ پولیس نے مقتول کے بارے میں خالد سے جو پوچھ گچھ کی ہے، اسی کی روشنی میں وہ مجھے چکر دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ رحمو نائی کو پنڈی بھٹیاں سے بلایا ہی نہیں گیا...... اور اگر واقعی اسے کراچی بلایا گیا ہے، تو پھر وہ ابھی تک یہاں پہنچا نہیں، ورنہ وہ مجھ سے ضرور ملوا دیتے!"



"اگر پولیس دانستہ ایسا کر رہی ہے، تو اس کے پیچھے ان کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟" میں نے الجھن زدہ انداز میں پیشانی سہلاتے ہوئے کہا۔

"مقصد میں بڑی اچھی طرح سمجھ چکا ہوں وکیل صاحب!" وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ "وہ لوگ سودے بازی کے چکر میں ہیں۔"

"کیسی سودے بازی؟" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ مجھے بے وقوف بنا کر تگڑی رقم بٹورنے کے چکر میں ہیں۔"

"ذرا تفصیل سے بتائیں۔" میں نے اضطراری لہجے میں کہا۔

سردار بھٹی بہ دستور معنی خیز انداز میں بتانے لگا۔ "پولیس کے ایک ذمے دار اہلکار نے بڑے خفیہ انداز میں مجھے پیش کش کی ہے، کہ اگر میں پچاس ہزار روپے کا بندوبست کر لوں، تو میرے بیٹے کے سر پر آئی بلا ٹل سکتی ہے۔" وہ ایک لمحے کے لئے سانس درست کرنے کو رکا اور گویا ہوا۔ "پولیس کے مطابق رحمو نائی ایک لالچی شخص ہے۔ اس کو کچھ دے دلا کر خاموش کیا جا سکتا ہے۔ باقی رقم سے پولیس کی خدمت ہو جائے گی، جس کے بدلے میں وہ کیس کو توڑ مروڑ کر اتنا پیچیدہ اور کمزور کر دیں گے کہ کوئی بھی وکیل بڑی آسانی سے خالد کو دو چار پیشیوں میں بری کروا لے گا۔"

"پھر آپ نے پولیس والوں کی پیش کش کے جواب میں کیا کہا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ اگرچہ مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہے ہیں، لیکن انہیں پتا نہیں میں نے اپنی زندگی کن کن دشتوں کی سیاحی میں گزاری ہے۔ میں ایک لمحے میں ان کی چال کو سمجھ گیا، اور ان سے کہا کہ وہ مجھے رحمو نائی سے ملوا دیں۔ میں خود اس سے معاملات طے کر لیتا ہوں، اور یہ میرا وعدہ ہے کہ میں رقم میں سے پولیس کا حصّہ ضرور نکالوں گا۔ میری یہ بات سن کر وہ بدک گئے، اور خاصی خفگی سے کہا کہ مجھے اپنے بیٹے سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ اب جو کچھ بھی ہوگا، کورٹ ہی میں ہوگا اور...... وہ اچھا نہیں ہوگا!"

"یہ آپ نے بہت اچھا کیا کہ پولیس کے ہاتھ میں کوئی رقم نہیں دی۔" اس کے خاموش ہونے پر میں نے کہا۔ "ورنہ اس قسم کے معاملات میں دی جانے والی رقم اکثر کھوہ کھاتے ہی میں چلی جاتی ہے۔"

"جانتا ہوں وکیل صاحب!" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "زندگی کا بیشتر حصہ برٹش آرمی میں گزارا ہے' اور ایک پولیس والے کا بہنوئی بھی ہوں۔ خالد کا ماموں طفیل بھٹی بھی اسی محکمے سے وابستہ رہا ہے' آج کل وہ ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہا ہے۔"

میں نے مشورہ دینے والے انداز میں کہا۔ "بھٹی صاحب! پولیس کے چالان پیش کرنے میں زیادہ دن باقی نہیں ہیں۔ جب تک تو آپ کراچی ہی میں مقیم رہیں۔ میں آنے والی پیشی پر آپ کے بیٹے کی ضمانت کروانے کی پوری کوشش کروں گا' اور فرض کریں' اگر ایسا نہ ہوسکا' تو پھر آپ واپس پنڈی بھٹیاں چلے جائیں' اور رحمونائی سے مل کر صورتِ حال جاننے کی کوشش کریں۔ انشاء اللہ! آج یا کل خالد سے ملاقات کرتا ہوں۔ تازہ ترین حالات کے بارے میں وہی مجھے بتا سکے گا۔"

سردار بھٹی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "وکیل صاحب! رحمونائی کو تو ڈالیں کھڈے میں۔ مجھے اس آدمی سے کوئی بات نہیں کرنی۔ وہ اگر سامنے آجاتا ہے' تو دیکھا جائے گا' ورنہ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ پولیس نے اسے کراچی بلوا لیا ہے' یا ابھی تک وہ اُدھر ہی بیٹھا ہوا ہے۔ اگر وہ واقعی اس کیس کا مدعی ہے' تو اسے کراچی میں موجود ہونا چاہیے' جس کا واضح مطلب یہی ہے کہ وہ آئندہ پیشی پر عدالت میں نظر آئے گا۔" اس نے لمحہ بھر توقف کیا' اور گہری سنجیدگی سے بولا۔

"وکیل صاحب! یہ کیس میں نے آپ کے ہاتھ میں دے دیا ہے۔ اب آپ جانیں اور یہ کیس...... مجھے تو یہ بتائیں کہ اس معاملے میں کتنا خرچ ہوگا' میں آپ کو ایک قدم بھی پیچھے ہٹتا نظر نہیں آؤں گا۔ جب تک یہ کیس کوئی تسلی بخش صورت اختیار نہیں کر لیتا' میں واپس جانے والا نہیں ہوں البتہ...... آئندہ پیشی کے بعد میں امتیاز بھٹی کو دو چار دن کے لئے ضرور پنڈی بھٹیاں روانہ کروں گا' تاکہ طفیل بھٹی کو صورتِ حال سے آگاہ کیا جا سکے۔ میرا سالا طفیل جوڑوں کے درد میں مبتلا ہے' اور موسم سرما میں اس کی تکلیف اتنی بڑھ جاتی ہے کہ وہ بستر کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کی بڑی خواہش تھی' کہ میرے ساتھ کراچی آتا' لیکن جوڑوں کی سوجن نے اسے مجبور کر دیا۔"



"ٹھیک ہے بھٹی صاحب! آپ خالد کی طرف سے تو بے فکر ہو جائیں۔" میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "اور اپنے سالے طفیل بھٹی کی جانب سے بھی!"

"طفیل کی جانب سے......" اس نے حیرت سے میری سمت دیکھا۔ "میں کچھ سمجھا نہیں جناب؟"

"میں سمجھاتا ہوں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میرے پاس ایک دیسی نسخہ ہے' اگر طفیل بھٹی اس نسخے کے مطابق عمل کرے' تو جوڑوں کے درد سے اسے نجات مل جائے گی۔"

"وکیل صاحب! دیسی نسخہ اور آپ کے پاس!" اس کی حیرت دو چند ہو گئی۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "میرا براہِ راست تو حکمت سے کوئی تعلق نہیں' اور نہ ہی مجھے اس میں کوئی خاص دلچسپی ہے۔ البتہ میری والدہ کے ایک ماموں زاد بھائی مرحوم مرزا وارث بیگ بڑے پائے کے حکیم تھے۔ انہوں نے والد صاحب کو یہ نسخہ بتایا تھا۔ وہ ہمارا نوجوانی کا زمانہ تھا۔ والد صاحب کو بھی ٹخنوں کے ورم کی شکایت تھی۔ انگریزی دوائیں سب ناکام ہو گئی تھیں' بس اسی نسخے سے آرام ملتا تھا۔"

سردار بھٹی نے کہا۔ "وکیل صاحب! اگر آپ وہ نسخہ مجھے عنایت کر دیں تو مہربانی ہوگی۔"

"ضرور...... کیوں نہیں" میں نے جلدی سے کہا۔ "یہ تو نیک کام ہے۔ اگر اس نسخے کے استعمال سے کسی کا بھلا ہو جاتا ہے' تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔"

پھر میں نے مذکورہ نسخہ لکھ کر سردار بھٹی کے حوالے کیا' اور ترکیب بھی سمجھا دی۔ جوڑوں اور پٹھوں کی کوئی خطرناک موچ ہو یا سوجن ورم وغیرہ...... یہ نسخہ سب کے لئے یکساں مفید اور مؤثر ہے۔ آما ہلدی اور چوٹ سجی ایک ایک چھٹانک لے کر پیس لیں۔ جب یہ سفوف کی شکل اختیار کر لے' تو انہیں الگ الگ شیشیوں میں ڈال کر ٹائٹ ڈھکن لگا دیں۔ جسم کے متاثرہ حصے کو پندرہ منٹ تک قابلِ برداشت گرم پانی میں ڈبو کر رکھیں پھر باہر نکال کر کسی کپڑے سے خشک کر لیں۔ متاثر حصے کی مناسبت سے دونوں سفوف کی ہم وزن مقدار پانی میں ڈال کر پکالیں' تاکہ یہ لیپ کی شکل اختیار کر لے۔ اس لیپ کو متاثرہ

حصے پر لگائیں' اور لیپ کے اوپر ارنڈی کا پتا رکھیں' پھر اس کے اوپر روئی وغیرہ رکھ کر گرم پٹی باندھ دیں۔ یہ عمل روزانہ ایک مرتبہ کریں۔ تین سے پانچ روز کے اندر حیرت انگیز اور شاندار شفا حاصل ہوگی۔ تکلیف کے دنوں میں بڑے جانور کے گوشت کا پرہیز بھی ضروری ہے۔

سردار بھٹی اور اس کے بیٹے امتیاز بھٹی نے میرا شکریہ ادا کیا اور گرم جوش مصافحہ کر کے رخصت ہوگئے۔



آئندہ پیشی پر پولیس نے اس کیس کا چالان پیش کر دیا۔ اس دوران میں تھانے میں ملزم خالد بھٹی سے ایک ملاقات کر چکا تھا' اور اس ملاقات کے نتیجے میں نہایت ہی اہم معلومات مجھے حاصل ہوئی تھیں' جن کا ذکر عدالتی کارروائی کے دوران مناسب مقامات پر گاہے بہ گاہے کیا جائے گا تاکہ کہانی میں تجسس کا عنصر اور دلچسپی کا پہلو برقرار رہے' جو ان صفحات میں پیش کی جانے والی کتھاؤں کا خاصہ ہے۔

میں نے اس پیشی پر اپنے وکالت نامے کے ساتھ ملزم کی درخواست ضمانت بھی دائر کر دی تھی۔ جج کی آمد کے بعد عدالتی کارروائی کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ وکیل استغاثہ نے ایک طویل تقریر کی صورت میں درخواست ضمانت کے خلاف دلائل دیتے ہوئے عدالت کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ کیس کے ابتدائی مرحلے پر ملزم کو رہا کرنے سے مقدمے میں پیچیدگیاں پیدا ہوسکتی ہیں۔ استغاثہ کے پاس ایسے شواہد اور ثبوت موجود ہیں' جن کی روشنی میں ملزم خالد کو بآسانی مجرم ثابت کیا جاسکتا ہے' اور معزز عدالت سے پرزور اپیل کی کہ ملزم کو جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا جائے' تاکہ عدالتی عمل کو آگے بڑھایا جاسکے۔

میں نے خالد بھٹی سے جو تفصیلی ملاقات کی تھی' اس میں بعض ایسے پوائنٹ سامنے آئے تھے' جن کی بنا پر ملزم کو باعزت بری کروایا جاسکتا تھا' لیکن ان پوائنٹس کے استعمال کے لئے عدالتی کارروائی کے دوران مناسب مواقع کے انتظار کی ضرورت تھی۔ تاہم اس کے باوجود میں نے اپنے مؤکل کی ضمانت کرانے کی پوری کوشش کی' لیکن یہ کوشش ناکام ہوگئی تھی' اور عدالت نے ملزم کو جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیجتے ہوئے دس دن بعد کی تاریخ



دی۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتول شیدا نائی کی موت آٹھ نومبر کی رات دس اور گیارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ اسے سائیلنسر لگے ریوالور کی مدد سے اس کی خواب گاہ میں قتل کیا گیا تھا۔ مذکورہ ریوالور کی دو گولیاں مقتول کی کھوپڑی میں اتریں' اور اسے اس دنیا سے اُس دنیا میں لے گئیں۔

استغاثہ کی رپورٹ میں بڑی تفصیل سے یہ ذکر کیا گیا تھا' کہ ملزم سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مقتول کے قریب ہوا تھا۔ ملزم کی سعودیہ سے ناخوشگوار واپسی کا ذکر کیے بغیر اس بات پر زور دیا گیا' کہ کچھ عرصہ پہلے جب ملزم نے مقتول کو بدلی ہوئی شخصیت کے ساتھ کراچی میں دیکھا' تو اس کے عیار ذہن نے فوراً ایک سازش تیار کر لی......مقتول کو بلیک میل کرنے کی سازش۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ مقتول نے خود کو ''بدلنے'' کے بعد بہت ترقی کی ہے' اور بڑا آسودہ حال ہوگیا ہے۔ پنڈی بھٹیاں کا ایک معمولی سا نائی' جس کی زندگی پتھر اور کچے چمڑے کے ٹکڑے پر استرا گھستے گزری تھی' وہ لکھ پتی بن کر سوٹ بوٹ میں گھوم رہا تھا' جبکہ بقول ملزم' وہ لٹ پٹ کر سعودی عرب سے آیا تھا۔ احساسِ محرومی اور نامساعد حالات نے ملزم کو یہ راہ سجھائی کہ اگر وہ مقتول کو بلیک میل کرنا شروع کر دے' تو اس کے تمام معاشی مسائل حل ہوجائیں گے۔ اگر وہ مقتول کی اصلیت اور اوقات کو منظر عام پر لے آئے' تو یقیناً مقتول کی ساکھ اور کاروبار کو بڑا شدید دھچکا پہنچ سکتا ہے۔ اس نے مقتول سے تفصیلی ملاقات کی' اور اسے شخصیت کی تبدیلی کے حوالے سے ڈرانے کی کوشش کی۔ مقتول نے صورتِ حال کی نزاکت کو فوراً بھانپ لیا۔ اس طرح ملزم کی چال کامیاب ہوگئی۔ ملزم نے زبان بندی کے وعدے پر مقتول سے سودے بازی کی۔ مقتول اس بات کے لئے راضی ہوگیا کہ ملزم اس کے ساتھ ہی قیام کرلے۔ اس کے علاوہ اس نے ملزم کو ہر ماہ ایک معقول رقم دینے کی ہامی بھی بھر لی۔ مقتول کے فلیٹ پر' قیام کے دوران چند ہی دن میں ملزم کو مقتول کی آمدنی کا اندازہ ہوگیا۔ مقتول پر تو گویا ہن برس رہا تھا۔ وہ کسی شخص کو ملک سے باہر بھجوانے کے بیس ہزار روپے وصول کرتا تھا' اور ہفتے میں ایک دو بندے تو اس کے چنگل میں پھنس ہی جاتے تھے۔ اگر ہفتے کا کم از کم ایک آدمی بھی شمار کیا

جائے، تو ایک ماہ میں چار فرد ہو گئے۔ چار افراد سے حاصل ہونے والی رقم اسی ہزار روپے بنتی ہے۔ اگر ہر قسم کے اخراجات، ویزا ایجنٹ کو دی جانے والی ادائیگی اور مختلف دفتروں کے چکروں میں خرچ ہونے والی رقم کا تخمینہ تیس ہزار بھی جوڑا جاتا، تو مقتول کو پچاس ہزار روپے ماہانہ کی بچت ہو رہی تھی، اور یہ بڑی شاندار اور قابلِ توجہ آمدنی تھی۔ ملزم نے مقتول کے اطراف دولت کی ریل پیل دیکھی، تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ظاہر ہے، اس نے اپنے بلیک میلنگ کے مطالبات کو بھی بلند کر دیا ہوگا۔ وقوعہ کے دن...... سہ پہر میں مقتول اور ملزم کے مابین خاصی گرما گرمی ہوئی تھی، کیونکہ تھوڑی دیر پہلے مقتول نے تین کلائنٹس سے رقم وصول کی تھی۔ ساٹھ ہزار روپے کی بھاری رقم مقتول کی میز کی دراز ہی میں رکھی تھی۔ اس وقت بینک بند ہو چکے تھے، اور اگلے روز ہی مذکورہ رقم بینک میں جمع کرائی جاسکتی تھی۔ چنانچہ ملزم نے اس موقع کو غنیمت جانا، مقتول کو موت کے گھاٹ اتارا، اور رقم لے کر فرار ہو گیا...... وغیرہ وغیرہ!

میں نے استغاثہ کی اس رپورٹ کو بڑی توجہ سے پڑھا، اور اس میں مجھے تکنیکی نوعیت کی بعض خامیاں نظر آئی تھیں۔ مجھے امید تھی، عدالتی کارروائی کے دوران میں ان نکات کو اجاگر کر کے اپنے مؤکل کے لئے بہت سی آسانیاں حاصل کر لوں گا۔

اس پیشی پر میں نے خاص طور پر، مقتول کے وارث رحمو نائی کو تلاش کرنے کی کوشش کی، لیکن میری یہ تگ و دو کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکی۔ ملزم کا باپ سردار بھٹی بھی متلاشی نظر سے رحمو ہی کو ڈھونڈ رہا تھا۔ ہم دونوں کی محنت کا نتیجہ یہ نکلا کہ پولیس نے رحمو نائی کے سلسلے میں سراسر غلط بیانی سے کام لیا تھا۔ اگر پولیس نے رحمو نائی کو پنڈی بھٹیاں سے بلایا ہوتا، تو ہر قیمت پر اسے عدالت میں موجود ہونا چاہیے تھا۔ بہر حال، سردار بھٹی سے پچاس ہزار روپے بٹورنے کی پولیس کی چال کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔

استغاثہ کی رپورٹ میں مقتول شیدا نائی کے قتل کے علاوہ ساٹھ ہزار روپے کی چوری کا بھی ذکر تھا، اور استغاثہ کا یہ دعویٰ تھا، کہ وہ رقم بھی میرے مؤکل ہی نے اُڑائی ہے۔ یہ بات میرے اور سردار بھٹی کے لئے بالکل نئی تھی۔ میں نے تھانے جا کر جب ملزم سے ملاقات کی، تو اس نے رقم کا کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا۔



آئندہ پیشی پر اس کیس کی باقاعدہ سماعت کا آغاز ہوا۔ جج نے فردِ جرم پڑھ کر سنائی، ملزم نے میری ہدایت کے مطابق صحتِ جرم سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد استغاثہ کے گواہوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ استغاثہ کی جانب سے کُل چھ گواہوں کی فہرست پیش کی گئی، جن میں زیادہ تر افراد کا تعلق اسی بلڈنگ سے تھا، جہاں مقتول کا دفتر اور رہائش تھی۔ میں ان میں سے صرف نہایت ہی اہم گواہوں کا احوال بیان کروں گا۔

اس سے پہلے کہ استغاثہ کا کوئی گواہ بیان دینے کے لئے وٹنس باکس میں قدم رکھتا، میں نے جج سے درخواست کی کہ میں اس کیس کے تفتیشی افسر سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔ جج نے میری یہ فرمائش فوراً پوری کر دی۔ انکوائری آفیسر کی حیثیت کسی بھی کیس میں استغاثہ کے گواہ جیسی ہوتی ہے، اور ہر پیشی پر اسے عدالت میں حاضر ہونا پڑتا ہے۔

اس کیس کے انکوائری آفیسر کا نام شمشاد علی تھا، اور وہ عہدے کے اعتبار سے سب انسپکٹر تھا۔ پچھلی پیشی پر میں نے ملزم کے باپ سردار بھٹی سے اس بات کی تصدیق کر لی تھی، کہ شمشاد علی پولیس اہلکار نہیں تھا، جس نے تھانے میں رحمو نائی کے حوالے سے مک مکا کی بات کی تھی۔ سردار بھٹی کے مطابق وہ کوئی اے ایس آئی تھا۔

آئی۔ او (انکوائری آفیسر) وٹنس باکس میں آیا، تو میں اس کے قریب چلا گیا۔ اس کی عمر لگ بھگ پینتیس سال ہوگی۔ وہ صحت مند جسم کا مالک دراز قد شخص تھا۔ اس کے بدن کی بناوٹ سے ظاہر ہوتا تھا، کہ وہ اسپورٹس مین...... خصوصاً تن ساز رہا ہے۔ اس نے ہلکی ہلکی داڑھی بھی رکھی ہوئی تھی۔

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''ایس۔ آئی صاحب! متعلقہ جرح کی جانب بڑھنے سے پہلے میں آپ سے ایک ذاتی نوعیت کا سوال پوچھنا چاہتا ہوں، اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو......؟''

''اگر آپ کے پوچھے گئے سوال میں اعتراض والی کوئی بات ہوگی، تو میں ضرور اعتراض کروں گا۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ ''پوچھیں، آپ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟''

میں نے پوچھا۔ ''آپ کی صحت کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ آپ بہت مستعد

اسپورٹس مین رہے ہیں مثلاً ...... باڈی بلڈر یا ویٹ لفٹر؟''

''آپ کا اندازہ بڑی حد تک درست ہے۔'' وہ فخریہ انداز میں سینہ پھلاتے ہوئے بولا۔ ''میں باڈی بلڈنگ کرتا ہوں' اور اپنے ویٹ میں تن سازی کے کئی مقابلے بھی جیت چکا ہوں۔''

''وری گڈ...... !' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''آپ جس محکمے میں خدمات انجام دے رہے ہیں' اس میں آپ کی تن سازی کی صلاحیت تو بہت کام آتی ہوگی۔ پلک جھپکتے میں آپ مجرم کو گردن سے پکڑ لیتے ہوں گے' جیسا کہ آپ نے میرے مؤکل کو گرفتار کر لیا ہے۔ مد مقابل کو تو سنبھلنے کا موقع بھی نہیں ملتا ہوگا۔''

اپنی تعریف کسی کو بھی بری نہیں لگتی' سب انسپکٹر شمشاد علی بھی خوش ہو گیا اور زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولا۔ ''بس جی اللہ کا احسان ہے۔ مجرم کو تو میں صورت دیکھتے ہی پہچان جاتا ہوں۔''

''آئی۔ او صاحب!'' میں نے متعلقہ موضوع کی جانب پیش قدمی کرتے ہوئے سوال کیا۔ ''آپ کو اس واقعے کی اطلاع کس نے دی تھی؟''

''مقتول کے ذاتی ملازم فرید حسین نے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اس نے تھانے فون کر کے اس واردات کی اطلاع دی تھی۔''

''کیا آپ بتانا پسند کریں گے کہ فرید حسین نے کتنے بجے تھانے فون کیا تھا؟''

''ہمارے روزنامچے کے مطابق صبح نو بجے فون موصول ہوا تھا۔''

''صبح نو بجے......'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''آٹھ نومبر کی صبح یا نو نومبر کی صبح؟''

''نو نومبر کی صبح!'' اس نے جواب دیا۔

''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتول شیدا نائی کی موت آٹھ نومبر کی رات دس اور گیارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔'' میں نے انکوائری آفیسر کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''اور آپ کو اگلی صبح نو بجے اس واقعہ کی اطلاع دی گئی' یعنی مقتول کی موت کے دس' گیارہ گھنٹے بعد؟''





''جی ہاں...... یہی حقیقت ہے۔''

''اور آپ جائے وقوعہ پر کتنے بجے پہنچے تھے؟''

''آدھے گھنٹے بعد...... کم و بیش ساڑھے نو بجے۔''

''جس وقت آپ جائے وقوعہ پر پہنچے' وہاں کتنے افراد موجود تھے؟''

''فلیٹ کے اندر صرف مقتول کا ذاتی ملازم فرید حسین موجود تھا۔'' آئی۔ او نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ''دائیں بائیں کے دفاتر میں کام کرنے والے افراد باہر جمع تھے' اور چہ مگوئیوں میں مصروف تھے۔'' ''ٹھیک ہے......'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی' اور سلسلۂ سوالات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے جائے وقوعہ پر پہنچنے کے بعد کیا کارروائی کی؟''

''موقع کی کارروائی ......'' اس نے بتایا۔ ''میں اپنے ساتھ دو کانسٹیبلز بھی لے گیا تھا۔ ایک کانسٹیبل کو میں نے فلیٹ کے داخلی دروازے پر متعین کر دیا' تاکہ کارروائی کے دوران کوئی شخص اندر داخل نہ ہو۔ دوسرا کانسٹیبل مختلف امور میں میرا ہاتھ بٹانے لگا تھا۔ ہم فرید حسین کی راہنمائی میں سیدھے اس بیڈ روم میں پہنچے' جہاں مقتول بیڈ پر مردہ پڑا تھا۔ کھوپڑی میں لگنے والی دو گولیوں نے اس کے سر کا کچومر نکال دیا تھا۔''

''ہوں......'' میں نے تیز نظروں سے تفتیشی افسر کو گھورا اور کہا۔ ''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کی روشنی میں آپ کم از کم دس گھنٹے بعد جائے وقوعہ پر پہنچے تھے۔ آج کل موسم بھی خاصا سرد ہے۔ اس کا مطلب ہے' مقتول کے جسم سے خارج ہونے والا خون تو جم گیا ہوگا؟''

''جی ہاں' اس کا یہی مطلب ہے۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''جب میں نے مقتول کی لاش کا معائنہ کیا' تو وہ بیڈ پر اپنے ہی خون میں لت پت پڑا تھا' تاہم خون خشک ہو چکا تھا۔''

''آپ نے جائے وقوعہ سے فنگر پرنٹس بھی اٹھائے ہوں گے؟''

''جی ہاں' مقتول کے بیڈ روم کے مختلف حصوں سے ایف۔ پی حاصل کیے گئے تھے۔'' اس نے بڑی رسان سے جواب دیا۔

"پھر اس کارروائی سے کوئی مثبت نتیجہ برآمد ہوا؟" میں نے استفسار کیا۔

اس نے سر کو اثباتی جنبش دی اور بتایا۔ "اس بیڈ روم سے ہمیں تین افراد کے ایف پی ملے تھے۔ نمبر ایک مقتول۔ نمبر دو فرید حسین۔ نمبر تین ملزم۔"

میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "اس فلیٹ میں یہی تین افراد رہائش پذیر تھے۔ مذکورہ فلیٹ تین کمروں پر مشتمل ہے۔ ایک کمرہ دفتر کے طور پر استعمال ہوتا تھا اور مقتول کا ذاتی ملازم فرید حسین اسی کمرے کے ایک صوفے پر سویا کرتا تھا۔ باقی دو بیڈ رومز میں سے ایک مقتول کا تھا جب کہ دوسرے اور نسبتاً چھوٹے کمرے میں ملزم نے رہائش اختیار کر رکھی تھی۔ مقتول جان سے گیا۔ اس فلیٹ میں رہائش پذیر زندہ بچ جانے والے دو افراد میں سے آپ نے میرے مؤکل کو نشانہ بنالیا...... کیوں۔ کیا آپ نے اس سلسلے میں مقتول کے ذاتی ملازم فرید حسین کو چیک کرنے کی زحمت کی؟"

"ہم نے فرید حسین اور خالد بھٹی دونوں کو مختلف زاویوں سے چیک کیا تھا۔" وہ بڑے مضبوط لہجے میں بولا۔ "حالات و واقعات کی روشنی میں ہمیں فرید حسین بے قصور اور خالد بھٹی اس واردات میں پیش پیش نظر آیا لہٰذا وہ اس وقت اکیوزڈ باکس میں کھڑا دکھائی دے رہا ہے۔"

"حالات و واقعات کی روشنی کیسے کیسے عجب مناظر دکھلائے گی یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا۔" میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "فی الحال ہم آلۂ قتل کی طرف آتے ہیں۔" میں نے لمحاتی توقف کیا ایک پرسکون سانس خارج کی اور سلسلۂ جرح کو دراز کرتے ہوئے پوچھا۔

"ایس۔ آئی صاحب! پوسٹ مارٹم رپورٹ کی رُو سے مقتول کو سائیلنسر لگے ریوالور سے قتل کیا گیا تھا اور ایک اچھی خبر یہ بھی ہے کہ آپ نے مذکورہ آلۂ قتل برآمد کر لیا ہے۔ کیا آپ معزز عدالت کو اس بارے میں کچھ بتانا پسند کریں گے؟"

"آلۂ قتل کے بارے میں استغاثہ کی رپورٹ میں سب کچھ تفصیلاً درج ہے۔ شاید آپ نے چالان کے مسوّدے کو توجہ سے پڑھا نہیں۔" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "بہر حال میں بتا دیتا ہوں......" وہ لمحے بھر کے لئے ٹھہرا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔



"آلۂ قتل اعشاریہ تین دو کیلی برکا ایک سائیلنسر لگا ریوالور تھا جس سے دو گولیاں...... دو بے آواز گولیاں فائر کی گئیں جنہوں نے مقتول کی کھوپڑی کو پاش پاش کر دیا اور اس کے نتیجے میں مقتول کی موت واقع ہو گئی۔ پولیس نے خانہ تلاشی کے دوران مذکورہ ریوالور برآمد کر لیا۔ بس یہ ہے آلۂ قتل کی کل کہانی۔"

"پولیس نے...... یعنی آپ نے خانہ تلاشی کے دوران سائیلنسر لگا ریوالور برآمد کر لیا۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "کیا آپ معزز عدالت کو یہ بتانا پسند فرمائیں گے کہ آلۂ قتل مقتول کے فلیٹ کے کس حصے سے برآمد ہوا تھا؟"

"ڈسٹ بن سے۔" اس نے ترت جواب دیا۔

میں نے چبھتے ہوئے لہجے مین پوچھا۔ "اور یہ ڈسٹ بن گھر کے اندر کس مقام پر رکھا تھا؟"

"داخلی دروازے کے باہر......" میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یعنی فلیٹ کی رہائشی حدود سے باہر جبکہ آپ تھوڑی دیر پہلے معزز عدالت کے روبرو یہ فرما چکے ہیں کہ آلۂ قتل خانہ تلاشی کے دوران برآمد ہوا تھا۔ خانہ کا مطلب تو آپ جانتے ہی ہوں گے سب انسپکٹر صاحب؟"

"بڑی اچھی طرح جانتا ہوں وکیل صاحب!" وہ جواباً تپتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "فلیٹ کے باہر کی گیلری اور کوریڈور چونکہ مقتول کے ہی استعمال میں تھے اس لئے وہاں رکھا ہوا ڈسٹ بن کو اندر خانہ شمار کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔ آپ تو خوامخواہ......" وہ برا سامنہ بناتے ہوئے بولا "...... بال کی کھال کھینچ رہے ہیں"

"آئی او صاحب! میں کوئی بھی کام خوامخواہ نہیں کرتا۔" میں نے اپنے لہجے میں سنگینی بھرتے ہوئے کہا۔ "بال کی کھال کیا شے ہے میں تو موقع پڑنے پر کھال کے بال بھی کھینچ سکتا ہوں...... بہر حال میں وقتی طور پر آپ کے فلسفے "اندر خانہ و باہر خانہ" سے اتفاق کر لیتا ہوں۔ آپ خوش ہو جائیں اور برہمی کو ایک طرف پھینک کر یہ بتائیں کہ آپ نے آلۂ قتل کو لیبارٹری ٹیسٹ کے لئے بھجوانے سے پہلے اس سے فنگر پرنٹس اٹھانے کی کوشش کی تھی؟"

"ظاہر ہے' یہ تو بہت ضروری تھا۔" وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔

"پھر تو آپ نے آلۂ قتل سے ملزم کی انگلیوں کے نشانات حاصل کر لیے ہوں گے؟" میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"نہیں جناب۔" اس نے مایوسی سے نفی میں گردن ہلا دی۔ "آلۂ قتل پر سے کسی کے بھی فنگر پرنٹس نہیں اٹھائے جا سکے۔ لگتا ہے' قاتل نے آلۂ قتل کو ڈسٹ بن میں پھینکنے سے پہلے اچھی طرح صاف کر دیا تھا۔"

"میں آپ کی بات سے صدفی صد اتفاق کرتا ہوں آئی۔ او صاحب!" میں نے بڑے دوستانہ انداز میں اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "اگر پوسٹ مارٹم رپورٹ اور آلۂ قتل کی لیبارٹری ٹیسٹ رپورٹ باہم یہ گواہی دیں کہ اسی ہتھیار سے مقتول کو موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے' اور آلۂ قتل پر قاتل کی انگلیوں کے نشانات نہ پائے جائیں' تو یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ چالاک قاتل نے آلۂ قتل کو پھینکنے سے پہلے اچھی طرح صاف کر دیا ہوگا۔"

آئی۔ او سمجھا کہ میں اس کی حمایت کر رہا ہوں۔ وہ خوشی سے پھول کر کُپا ہو گیا۔ میں نے اس کی خوشی کے غبارے کو پنکچر کرنے کے لئے پن اٹھائی' اور قدرے تیز لہجے میں سوال کیا۔

"آئی۔ او صاحب! آپ نے جائے وقوعہ پر پہنچ کر خانہ تلاشی لی تھی۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے' پچھلے کچھ دنوں سے ملزم خالد بھٹی' مقتول کے فلیٹ پر ہی قیام پذیر تھا۔ مذکورہ فلیٹ کے کل تین کمرے ہیں۔ ایک کمرے کو مقتول آفس کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔ آفس سے ملحقہ نسبتاً بڑے کمرے کو اس نے اپنا بیڈ روم بنا رکھا تھا' جہاں اس کی خون آلود لاش پڑی ملی' جبکہ تیسرے کمرے میں ملزم کا قیام تھا۔ کیا آپ نے مقتول کے فلیٹ کی خانہ تلاشی کے دوران ملزم کے کمرے کا جائزہ بھی لیا تھا؟"

وہ جھنجلاہٹ بھرے انداز میں بولا۔ "ملزم والا بیڈ روم چونکہ مقتول کے فلیٹ کے اندر ہی واقع تھا' لہٰذا میں نے وہاں کی مکمل اور تفصیلی تلاشی لی تھی۔"

"آپ کو وہاں کوئی قابلِ اعتراض چیز نظر آئی؟"



"نہیں' ایسی کوئی شے مجھے اس کمرے میں دکھائی نہیں دی۔"

"ملزم کے کمرے کو دیکھ کر ذہن میں کیا تاثر ابھرتا تھا؟"

"تاثر....." اس نے لمحہ بھر سوچا پھر جواب دیا۔ "یہی تاثر ابھرتا تھا کہ اس بیڈ روم میں کوئی انسان رہتا ہے' اور اسے خواب گاہ کے طور پر استعمال کرتا ہے۔"

"یعنی..... آپ نے اس بیڈ روم کی ہر شے مثلاً بیڈ' وارڈ روب اور دیگر سامانِ ضروریہ کو اچھی طرح چیک کیا تھا' جس سے یہ نتیجہ سامنے آیا کہ وہ کمرہ مکمل طور پر آباد ہے؟"

"آپ خوامخواہ گھما پھرا کر سوال نہ کریں' میرے کہنے کا وہی مطلب ہے' جو نتیجہ آپ نے اخذ کیا ہے۔" وہ ناراضگی بھرے انداز میں بولا۔ "وارڈ روب میں ملزم کے کپڑے ٹنگے ہوئے تھے۔ الماری کے اوپر ایک چھوٹا' بھورے رنگ کا سوٹ کیس بھی نظر آ رہا تھا۔ علاوہ ازیں استعمال کی دیگر چیزیں بھی بیڈ روم میں موجود تھیں۔"

"بہت بہت شکریہ آئی او صاحب! میرے سوالات سے اگر آپ کو زحمت ہوئی ہو تو میں اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔" میں نے سانس ہموار کرنے کے لئے توقف کیا پھر پوچھا۔

"آلۂ قتل..... سائیلنسر لگے اعشاریہ تین دو کیلی بر والے ریوالور کی ملکیت کا کچھ پتا چلا؟"

"جی ہاں..... آلۂ قتل ایک لائسنس یافتہ ریوالور تھا' جو مقتول کی ملکیت ثابت ہوا ہے۔" اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"اوہ! تو گویا..... گھر کو آگ لگ گئی' گھر کے چراغ سے!" میں نے متاسفانہ انداز میں کہا۔

وہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ میں نے پوچھا۔

"مقتول شیدا نائی کئی سال پہلے کراچی آیا تھا۔ اس نے اپنی اصلی شناخت کو ختم کر کے خود کو اے۔ آر۔ بھٹی بنا لیا تھا۔ آپ پر اس کی اصلیت کا راز کیسے کھلا؟"

"یہ حقیقت ملزم کی زبانی ہمیں پتا چلی تھی۔" آئی۔ او نے جواب دیا۔

میں نے سوال کیا۔ ''استغاثہ نے آنکھیں بند کر کے ملزم کی بیان کردہ کہانی پر یقین کرلیا' یا اپنے طور پر اس کی تصدیق بھی کی؟''

''جناب وکیل صاحب! ہم بات کی تصدیق کرنے کے بعد ہی کوئی عملی قدم اٹھاتے ہیں۔'' وہ تیکھے لہجے میں بولا۔ ''ہم نے ملزم کی زبان پر یقین کر کے مقتول کو عبدالرشید عرف شیدا نائی تسلیم نہیں کیا' بلکہ اس کے آبائی علاقے پنڈی بھٹیاں سے باقاعدہ انکوائری کرائی۔''

''آپ اس کام کے لئے پنڈی بھٹیاں پہنچ گئے!'' میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا یہاں کراچی میں مقتول کے بیوی بچے یا کوئی اور رشتے دار موجود نہیں تھا؟''

انکوائری آفیسر نے میرے استفسار کے جواب میں بتایا۔ ''مقتول نے شادی نہیں کی تھی' اس لئے بیوی بچوں کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس دنیا میں اس کا صرف ایک ہی رشتے دار زندہ بچا ہے' اور وہ ہے اس کا سگا چچا رحم دین عرف رحمونائی' جو اُدھر پنڈی بھٹیاں میں رہتا ہے۔ ہم نے صرف اسی سے رابطہ کر کے اس امر کی تصدیق کی تھی۔''

''اوہ!'' میں نے متاملانہ انداز میں ایک گہری سانس خارج کی' اور چونکے ہوئے لہجے میں جاننا چاہا۔ ''کہیں یہ وہی رحمونائی تو نہیں' جو اس کیس کو رفع دفع کرنے کے لئے ملزم کے وارثوں سے مبلغ پچاس ہزار روپے کا طلب گار تھا؟''

''جی' میں اسی رحمونائی کی بات کر رہا ہوں۔'' وہ بے دھیانی میں اقرار کر بیٹھا۔

میں نے جلدی سے پوچھا۔ ''اور آپ کے تھانے کے ایک اے ایس آئی نے رحمونائی کی ڈیمانڈ کو ملزم کے باپ سردار بھٹی کے سامنے بھی رکھا تھا' لیکن اس نے ایسا کوئی بھی مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا تھا' ہیں نا؟''

''پتا نہیں' آپ کیا الٹا سیدھا بول رہے ہیں!'' وہ سنبھلتے ہوئے بولا۔ چہرے کے تاثرات سے لگتا تھا' کہ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو چکا ہے۔ ''ہم ...... ہم ایسے کسی معاملے میں ...... ملوث نہیں رہے ...... ہمارے تھانے میں ایسا کوئی ...... واقعہ پیش نہیں آیا ...... آپ خوامخواہ ہم پر الزام لگا رہے ہیں وکیل صاحب!''



بات ختم کر کے وہ پریشان نظروں سے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھنے لگا۔ سرد موسم کے باوجود بھی آئی۔ او کی پیشانی عرق آلود ہوگئی تھی۔ اس کے متضاد بیان نے جج سمیت حاضرین عدالت کو چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں نے اس سچویشن کا بھرپور فائدہ اٹھایا' اور قدرے جارحانہ لہجے میں کہا۔

''شمشاد علی صاحب! خدا کا خوف کریں۔ میں آپ پر قطعاً کوئی الزام نہیں لگا رہا' بلکہ آپ کے بیان کو وضاحت سے پیش کر رہا ہوں۔ تھوڑی دیر پہلے آپ نے معزز عدالت کے روبرو اس بات کا اقرار کیا ہے' رحمونائی نے یہ کیس رفع دفع کرنے کے لئے ملزم کے وارثوں سے پچاس ہزار روپے کا مطالبہ کیا تھا۔ ٹھیک ہے' میں آپ کی بات کو درست مان لیتا ہوں ...... کہ آپ کے تھانے میں کسی اے ایس آئی کے توسط سے رحمونائی کا ایسا کوئی مطالبہ ملزم کے باپ سردار بھٹی تک نہیں پہنچایا گیا۔ آپ اور آپ کا تھانہ اس معاملے میں ملوث نہیں تو پھر بتائیں' آپ کو یہ کیسے پتا چلا کہ رحمونائی پچاس ہزار روپے کے عوض یہ کیس رفع دفع کرنے کا ارادہ رکھتا ہے؟''

''میں ...... میں سمجھتا ہوں کہ ...... آپ کے سوال کے جواب میں بے دھیانی میں' میرے منہ سے نکل گیا تھا ...... جی ہاں' میں اسی رحمونائی کی بات کر رہا ہوں۔'' اس نے اپنے تئیں لیپاپوتی کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''اِٹ واز جسٹ اے سلپ آف ٹنگ ......!''

''انگلش میں اپنی غلطی کی وضاحت کرنے کا بہت بہت شکریہ آئی او صاحب!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''لیکن آپ کو ہر لمحے اس بات کا احساس رہنا چاہیے' کہ آپ اس کیس کے ایک اہم کردار ہیں۔ آپ کی کسی کوتاہی سے کیس پر بڑے منفی اثرات مرتب ہو سکتے ہیں' خصوصاً میرے مؤکل اور اس کیس کے ملزم مسٹر خالد بھٹی پر۔'' میں نے لمحے بھر توقف کیا' پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

آئی۔ او جز بز ہو کر رہ گیا۔ اس نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا' تاہم اس کے چہرے پر ابھرنے والے خجالت آمیز تاثرات اس بات کا کھلا اعلان کر رہے تھے' کہ وہ اپنی غلطی پر خاصا پریشان اور الجھا ہوا ہے۔ میں نے اس کی پریشانی میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"آئی۔ او صاحب! آپ کی محکمہ جاتی تفتیش و تحقیق کے مطابق رحمونائی...... مقتول کا اکلوتا رشتے دار ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ رحمونائی کو اس کیس میں مدعی کی حیثیت حاصل ہے' لیکن حیرت اس بات کی ہے' کہ وہ شروع سے اب تک کسی بھی پیشی پر عدالت میں نظر نہیں آیا۔ ایسا کیوں؟"

"اس کا ایک سبب ہے۔" آئی۔ او تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ "ہمارے بلانے پر رحمو نائی یہاں آیا ضرور تھا' لیکن اس نے اس بکھیڑے میں پڑنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ وہ یہ کہہ کر واپس چلا گیا تھا' کہ ہم اس کیس کو اپنے طور پر جیسے چاہیں' ہینڈل کریں۔ اسے اس معاملے سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

"گویا اس کیس میں مدعی کے فرائض اب مکمل طور پر استغاثہ کو ادا کرنے ہیں؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

اس نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ "آپ نے اپنی تفتیش کے نتیجے میں آلۂ قتل تو برآمد کر لیا تھا' لیکن استغاثہ کی رپورٹ میں کہیں ان ساٹھ ہزار روپوں کی برآمدگی کا ذکر نہیں ملتا' جو میرے مؤکل کے کھاتے میں ڈالے گئے ہیں۔ کیا آپ نے چوری شدہ رقم بازیاب نہیں کرائی؟"

اس نے نفی میں گردن ہلائی' اور تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ملزم نے اس رقم کو بڑی ہوشیاری سے کہیں ٹھکانے لگا دیا ہے!"

"ہوں......!" میں نے محض ایک لفظ پر اکتفا کیا۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔ جج نے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔ "دی کورٹ از اڈجارنڈ!"





آئندہ پیشی پر استغاثہ کی جانب سے تین گواہوں کے بیانات ہوئے۔ وکیلِ استغاثہ نے بھرپور اور میں نے سرسری انداز میں جرح کی۔ ان تین گواہوں کے نام علی الترتیب اکمل خان' پرویز بزمی اور فدا حسین تھے۔ اکمل خان اور پرویز بزمی کا وہاں بزنس تھا...... یعنی مقتول جس بلڈنگ میں رہتا تھا' اس کے گراؤنڈ فلور پر ان کے دفاتر تھے' جب کہ فدا حسین اسی بلڈنگ کے سیکنڈ فلور پر رہائش پذیر تھا۔

وکیلِ استغاثہ نے ملزم کی ذات کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے ایک مخصوص زاویے سے جرح کی' اور وہ زاویہ بلاواسطہ یا بالواسطہ استغاثہ کی جزوی حمایت میں جاتا تھا' لیکن اس تمام تر جرح کے خلاصے میں کوئی بھی ایسا خطرناک پوائنٹ موجود نہیں تھا' جو کسی مرحلے پر میرے مؤکل کے لئے نقصان دہ ثابت ہوتا۔ لہٰذا میں مطمئن تھا' اور جانتا تھا کہ ان گواہوں کی شہادت خانہ پُری سے زیادہ اہمیت کی حامل نہیں۔

میں نے گزشتہ پیشی پر اس کیس کے انکوائری آفیسر کو اپنی جرح کی چکی میں پیس ڈالا تھا۔ مختلف نازک مقامات پر اس نے بعض ایسی بیانی غلطیاں کیں' جو استغاثہ کو کمزور کرنے کے ساتھ ہی میرے مؤکل کے لئے خاصی مفید ثابت ہونے والی تھیں۔

اس کیس کو عدالت میں لگے اب چھ ماہ سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا تھا۔ ابتدائی چند پیشیاں تو تکنیکی امور میں گزر جاتی ہیں' اور باقاعدہ عدالتی کارروائی عمل میں نہیں آتی' اسی لیے میں نے ان غیر دلچسپ کارروائیوں کا احوال بیان نہیں کیا۔ میرے مؤکل کا باپ ریٹائرڈ لانس نائیک سردار بھٹی ایک سمجھدار' بردبار اور جہاں دیدہ شخص تھا۔ وہ میری اب تک کی کارکردگی سے پوری طرح مطمئن دکھائی دیتا تھا' اس دوران وہ دو چکر اپنے علاقے

کے بھی لگا آیا تھا۔ میرے بتائے ہوئے دیسی نسخے نے اس کے سالے طفیل بھٹی کی تکلیف کو جادوئی انداز میں دور کر دیا تھا۔ وہ میرا بے حد شکر گزار تھا' اور پچھلی مرتبہ جب سردار بھٹی پنڈی بھٹیاں سے لوٹا' تو طفیل بھٹی نے اس کے ہاتھ میرے لئے کچھ تحائف بھی بھیجے تھے۔ جن میں ایک کاٹن سوٹ' اصلی دیسی گھی' کاغذی باداموں کی ایک صحت مند تھیلی اور شہد کی ایک بڑی بوتل شامل تھی۔ میں نے طفیل بھٹی کی محبت کی قدر اور اس کے دلی جذبات کا احساس کرتے ہوئے تحائف خوشی سے قبول کر لیے تھے۔

سردار بھٹی نے اور بعدازاں خالد بھٹی نے مجھے جو مفید معلومات فراہم کیں' میں ان کی روشنی میں قدم قدم آگے بڑھ رہا تھا' خاص طور پر خالد بھٹی نے جو لگ بھگ ایک ماہ مقتول کے فلیٹ پر گزارا تھا' اس دوران ہونے والے اس کے تجربات اور مشاہدات بڑی اہمیت کے حامل تھے۔ ان میں سے میں بعض پوائنٹس کی مار انکوائری آفیسر کو مار چکا تھا' اور باقی میزائل میں نے استغاثہ کے سب سے اہم اور آخری گواہ مسٹر فرید حسین کے لئے بچا رکھے تھے۔ میری نظر میں فرید حسین کی ذات صاف وشفاف نہیں تھی۔ اگر میں اس پر کڑی جرح کرتا' تو مجھے پوری امید تھی کہ اس کیس کی کوئی شکل ضرور نکل کر سامنے آجاتی۔

منظر اسی عدالت کا تھا' اور گواہی کے لئے وٹنس باکس میں فرید حسین کھڑا دکھائی دے رہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق فرید حسین استغاثہ کا آخری گواہ تھا۔ لہٰذا میں اس کی گھسائی اور منجھائی کے لئے پوری طرح تیار تھا۔ فرید حسین مقتول کا گھریلو ملازم بھی تھا' جو مقتول کے لئے کُل وقتی خدمات انجام دیتا تھا' اور اس کی رہائش بھی مستقل طور پر مقتول کے گھر ہی میں تھی۔

فرید حسین کی عمر لگ بھگ تیس سال تھی۔ وہ مائل بہ فربہی بدن کا ایک درمیانہ قد شخص تھا۔

فرید حسین نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کرا دیا' تو وکیلِ استغاثہ جرح کے لئے اس کے قریب چلا گیا۔ فرید حسین چونکہ استغاثہ کا گواہ تھا' لہٰذا وکیل استغاثہ کا رویہ اس کے ساتھ خاصا دوستانہ تھا۔ اس نے سوالات کا سلسلہ آغاز کرتے ہوئے پوچھا۔



''فرید صاحب! آپ ملزم کے بارے میں کیا کہیں گے؟''

گواہ نے اکیوزڈ باکس میں کھڑے ملزم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

''اس شخص سے میرا زیادہ واسطہ تو نہیں رہا' لیکن مختصر سے عرصے کے دوران ہی میں نے اسے خاصا سازشی اور جھگڑالو پایا تھا۔ اس کی چال کا نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔''

آخری جملہ اس نے بڑے تیکھے انداز میں ادا کیا تھا۔ وکیل استغاثہ نے پوچھا۔

''ملزم وقوعہ سے لگ بھگ ایک ماہ پہلے منظرِ عام پر آیا تھا۔ کیا آپ نے اس سے پہلے کبھی اسے کہیں دیکھا تھا؟''

استغاثہ کے گواہ نے نفی میں گردن ہلا دی۔

وکیل استغاثہ نے کہا۔ ''جیسا کہ آپ نے بتایا کہ ملزم کو آپ نے سازشی اور چال باز شخص پایا تھا۔ واقعات وشواہد بتاتے ہیں' کہ ملزم اور مقتول کے درمیان کسی حوالے سے اندر ہی اندر کھچڑی سی پک رہی تھی۔ یہ کھچڑی مخالفت کی تھی۔ گویا کسی طوفان کی آمد آمد تھی۔ کیا آپ معزز عدالت کو بتانا پسند کریں گے کہ ان دونوں میں کس سلسلے میں تناؤ چل رہا تھا؟''

''دیکھیں جی' مجھے مرنے کے بعد اپنی قبر میں جانا ہے۔'' فرید حسین نے حد سے زیادہ سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ یہ ایک اتفاق ہے کہ میں نے ایک روز ان دونوں کو کسی معاملے پر الجھتے ہوئے سن لیا تھا۔ میرا اندازہ ہے کہ کسی خاص حوالے سے ملزم' بھٹی صاحب کو بلیک میل کر رہا تھا۔''

''کیا آپ کو اس خاص معاملے کی خبر نہیں تھی؟'' وکیل استغاثہ نے پوچھا۔

''اس وقت تو نہیں تھی جناب!'' گواہ نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''لیکن اب تو ساری بات کھل چکی ہے۔ بھٹی صاحب شیدا نائی تھے یا اے۔ آر بھٹی' مجھے اس سے کوئی غرض نہیں جناب۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں' کہ وہ بہت اچھے انسان تھے۔ میں ان کا ادنیٰ سا ملازم تھا' لیکن وہ مجھے اپنا چھوٹا بھائی سمجھتے تھے۔ ان کی موت کا سب سے زیادہ دکھ مجھے ہوا ہے وکیل صاحب!''

''وقوعہ کے روز مقتول نے تین کلائنٹس سے رقم وصول کی تھی۔'' وکیلِ استغاثہ نے

پوچھا۔ ’’یہ بات تو تمہارے علم میں ہوگی؟‘‘

’’جی ہاں!‘‘ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ’’اگرچہ بھٹی صاحب نے تو مجھے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا‘ لیکن رقم دینے والوں سے میری بات ہوئی تھی۔‘‘ کچھ دیر رک کر وہ پھر بتانے لگا۔

’’وہ جناب! بات دراصل یہ ہے کہ بھٹی صاحب کے کمرے میں تو لوگ ایک ایک کر کے جاتے تھے۔ باقی انتظار گاہ میں میرے پاس بیٹھتے تھے‘ لہٰذا مجھے ان سے گپ شپ کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔ اس روز میری اکرم‘ شہباز اور امتیاز سے خاصی تفصیلی بات ہوئی تھی۔ اکرم کا تعلق گجرات سے‘ جب کہ شہباز کا تعلق ساہیوال سے ہے‘ اور وہ دونوں سعودی عرب جانا چاہتے تھے۔ امتیاز اِدھر کراچی ہی کا رہنے والا ہے‘ اور وہ مسقط جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ انہوں نے وقوعہ کے روز بیس بیس ہزار کے حساب سے بھٹی صاحب کو کُل ساٹھ ہزار روپے دیئے تھے۔‘‘

’’اور وقوعہ ہی کے روز ملزم اور مقتول کے درمیان جھگڑا بھی ہوا تھا؟‘‘ وکیلِ استغاثہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

’’بالکل جھگڑا ہوا تھا جناب!‘‘ وہ پُر اعتماد لہجے میں بولا۔ ’’اس وقت سہ پہر کے تقریباً پانچ بجے تھے۔ وہ دونوں دفتر کے اندر بیٹھے تھے‘ اور میں باہر انتظار گاہ میں موجود تھا۔ مجھے یہ تو پتا نہیں‘ کہ وہ کس مسئلے پر لڑائی کر رہے تھے‘ تاہم اس گرما گرمی سے ظاہر ہوتا تھا‘ کہ ان کے درمیان کوئی سنگین مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا ہے۔‘‘

’’پھر اس جھگڑے کا نتیجہ کیا برآمد ہوا تھا؟‘‘ وکیل استغاثہ نے پوچھا۔ ’’آپ تو دفتر کے باہر انتظار گاہ میں موجود تھے۔ نتیجہ آپ سے چھپا نہیں رہ سکتا تھا!‘‘

انتظار گاہ سے وکیل استغاثہ اور فرید حسین کی مراد فلیٹ کا وہ حصہ تھا‘ جو داخلی دروازے اور آفس کے درمیان واقع تھا۔ یہ درحقیقت فلیٹ کا لاؤنج تھا‘ جسے مقتول نے وزیٹرز لابی کی شکل دے رکھی تھی‘ کلائنٹس کے لئے وہاں دو صوفے ڈال دیے گئے تھے۔ فرید حسین عموماً وہیں موجود ہوتا تھا‘ اور انتظار گاہ میں بیٹھے بیرون ملک جانے کے امیدواروں سے گپ شپ کرتا رہتا تھا۔



گواہ نے وکیل استغاثہ کے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا۔ ’’جناب! میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا‘ اس گرما گرمی کے نتیجے میں ملزم کمرے سے باہر نکلا‘ اور غصّے کے عالم میں وہاں سے رخصت ہوگیا۔‘‘

’’کہاں سے رخصت ہوگیا؟‘‘ وکیلِ استغاثہ نے تفریح لینے والے انداز میں پوچھا۔

’’اس دفتر سے ...... یعنی اس فلیٹ سے......‘‘ استغاثہ کے گواہ نے تیز لہجے میں جواب دیا۔ ’’مجھے اس بات پر شدید حیرت بھی ہوئی کہ جب میں نے جاتے ہوئے ملزم کو آواز دی‘ تو اس نے پلٹ کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا‘ اور بندوق سے نکلی ہوئی گولی کی طرح وہاں سے رخصت ہوگیا۔‘‘

’’آپ نے یقیناً اپنی حیرت دور کرنے کی کوشش تو کی ہوگی۔‘‘ وکیلِ استغاثہ نے پوچھا۔ ’’مقتول سے یہ ضرور پوچھا ہوگا کہ آخر ایسی کیا بات ہوگئی‘ جو ملزم یوں پاؤں پٹخ کر اور سر جھٹک کر چلا گیا؟‘‘

’’جی ہاں‘ میں نے اس بارے میں بھٹی صاحب سے پوچھا تھا۔‘‘ فرید حسین نے جواب دیا۔ ’’اور انہوں نے بتایا تھا کہ اس کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔‘‘

’’دماغ خراب ہوگیا ہے...... کیا مطلب؟‘‘ وکیلِ استغاثہ نے حیرت آمیز نظروں سے فرید حسین کو دیکھا۔

’’آپ ذرا اس امر کی وضاحت تو کریں؟‘‘

’’جناب وکیل صاحب! بھٹی صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ ساٹھ ہزار کی رقم دیکھ کر خالد بھٹی کی نیت میں فتور آ گیا ہے۔ کہہ رہا تھا‘ یہ رقم میں اس کے حوالے کر دوں۔‘‘ فرید حسین نے گہری سنجیدگی سے بتانا شروع کیا۔ ’’میں نے بھٹی صاحب سے پوچھا‘ کہ وہ اتنی بھاری رقم کا مطالبہ کس بنا پر کر رہا ہے؟‘‘

بھٹی صاحب نے جواب دیا۔‘‘ وہ مجھے دھمکی دے رہا تھا‘ کہ اگر میں نے اس کی بات نہ مانی تو وہ سب کو میری اصلیت کے بارے میں بتا دے گا۔‘‘

’’آپ کی اصلیت کے بارے میں......‘‘ میں نے الجھن زدہ انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا۔

انہوں نے کہا۔ ”ہاں‘ اس پاگل کا خیال ہے کہ میں اے۔ آر بھٹی نہیں ہوں۔“

”اگر آپ بھٹی صاحب نہیں ہیں تو پھر کیا ہیں؟“ میں نے متذبذب لہجے میں پوچھا۔

انہوں نے بتایا۔ ”یہ کمینہ مجھے ڈرا دھمکا کر بلیک میل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔“

”آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے بھٹی صاحب!“ میں نے جوش بھرے لہجے میں ان سے کہا۔ ”اگر آپ کا حکم ہو تو میں اسے فلیٹ میں قدم بھی نہیں رکھنے دوں گا۔ یہ بندہ تو مجھے شروع ہی سے اچھا نہیں لگا تھا۔ آپ نے اپنی خوشی سے اسے یہاں رہنے کی اجازت دے دی‘ اس لئے میں خاموش رہا ورنہ......“

”نہیں......اتنا جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں‘ بھٹی صاحب میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول پڑے۔ ”میں نے بڑے واضح الفاظ میں اس سے کہہ دیا ہے‘ کہ وہ اپنی رہائش کا کہیں اور بندوبست کر لے۔ اس فلیٹ میں اب اس کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے اور ...... یہ بات بھی وہ اپنے ذہن سے جھٹک دے کہ میں اس کی کسی بلیک میلنگ میں آؤں گا۔ مجھ سے وہ ایسی کوئی توقع نہ رکھے۔ یہ سنتے ہی وہ کہیں چلا گیا ہے۔“

استغاثہ کا گواہ فرید حسین یہ من گھڑت کہانی سنا کر خاموش ہو گیا۔ اس کے بیان کو من گھڑت میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ خالد بھٹی کی زبانی مجھے جو حالات پتا چلے تھے‘ وہ اس کہانی سے مماثلت نہیں رکھتے تھے۔ وقوعہ کی سہ پہر خالد اور مقتول کے درمیان تھوڑی تلخ کلامی ضرور ہوئی تھی‘ لیکن وہ کوئی اور ایشو تھا۔ مقتول کے چند ریکروٹنگ سے متعلق فراڈ میرے مؤکل کی نظر میں آ گئے تھے۔ یہ جان کر اسے بڑا افسوس ہوا تھا‘ کہ مقتول بعض لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر تگڑی تگڑی رقمیں بٹور رہا تھا۔ وہ جتنے افراد کو بیرون ملک بھجوانے کا آسرا دیتا تھا‘ ان میں سے آدھے تو گر پڑ کر باہر چلے جاتے تھے اور باقی نصف کی رقم مقتول کے پاس پھنس کر رہ جاتی تھی۔ وہ وعدے پر وعدے کر کے انہیں ٹالتا رہتا۔ یہ صورتِ حال ملزم کے لیے تکلیف دہ تھی۔ اس نے تلخ کلامی کے بعد مقتول سے دو ٹوک الفاظ میں کہا‘ کہ اگر اس نے بے ایمانی اور فراڈ کی روش ترک نہ کی‘ تو وہ اس کے ساتھ نہیں رہ سکے گا۔ اس پر مقتول نے اس سے کہہ دیا‘ کہ ٹھیک ہے‘ وہ اپنا بندوبست کہیں



اور کر لے‘ اور یوں خالد مقتول کے دفتر سے نکل آیا تھا۔

گواہ کے خاموش ہونے پر وکیل استغاثہ نے قدرے بلند آواز میں کہا۔ ”فرید صاحب! وقوعہ کی سہ پہر مقتول نے بڑی وضاحت کے ساتھ آپ کو ملزم کی برہمی اور بلیک میلنگ کے بارے میں بتا دیا تھا۔ آپ معزز عدالت کو یہ بتائیں کہ ملزم کے رخصت ہونے کے بعد وہاں کیا حالات پیش آئے تھے؟“

”میں نے حسبِ معمول بھٹی صاحب کے لئے رات کے کھانے کا بندوبست کیا۔“ گواہ نے بتایا۔ ”رات کے کھانے کے بعد انہوں نے چائے پی اور مجھ سے کہا کہ وہ تھک گئے ہیں‘ اس لیے اپنے بیڈروم میں آرام کرنے جا رہے ہیں۔ وہ جب اپنے بیڈروم میں داخل ہو گئے‘ تو میں بھی لیٹ گیا تھا۔“

”آپ لیٹتے ہی سو گئے تھے یا دیر سے نیند آئی تھی؟“ وکیلِ استغاثہ نے پوچھا۔

”نیند کہاں آئی تھی جناب!“ وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ”مجھے صوفے پر لیٹے چند منٹ ہی گزرے تھے‘ کہ ملزم واپس آ گیا۔ میں نے اس کے لئے دروازہ کھولا اور میرے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی اس نے بتایا کہ وہ اپنی رہائش کا بندوبست کر کے آ رہا ہے۔ وہ بھٹی صاحب سے چند باتیں کرے گا‘ اور اپنا ضروری سامان لے کر چلا جائے گا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد وہ واپس آیا‘ اور تیز قدموں کے ساتھ چلتے ہوئے فلیٹ سے نکل گیا۔ میں نے اس کی آمد اور رخصت کو زیادہ اہمیت نہ دی‘ اور فلیٹ کے داخلی دروازے کو بند کر کے دوبارہ لیٹ گیا‘ پھر تھوڑی دیر کے بعد مجھے نیند آ گئی تھی۔“

کسی بھی کیس میں سب سے زیادہ قابلِ رحم حالت ملزم کی ہوتی ہے۔ اسے ہر پیشی پر عدالت میں موجود رہنا ہوتا ہے اور وہ بھی بالکل چپ چاپ۔ استغاثہ کی جانب سے اس کے لئے جتنا بھی زہر اگلا جائے‘ اسے خاموشی سے پینا پڑتا ہے۔ استغاثہ کے گواہ اس کی ذات کے حوالے سے لاکھ غلط بیانیاں کرتے رہیں‘ مگر اسے اپنے دفاع یا حمایت میں زبان سے ایک لفظ ادا کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اس کی طرف سے صرف اور صرف وکیلِ صفائی ہی بول سکتا ہے‘ یا پھر صفائی کے گواہ اس کی بے گناہی ثابت کرنے میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

ایک آدھ مزید سوال کے بعد وکیلِ استغاثہ نے جرح ختم کر دی۔ اپنی باری پر میں نے جج سے اجازت حاصل کی اور وٹنس باکس کے قریب جا کر کھڑا ہوگیا۔ میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا' اور گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''فرید صاحب! کیا آپ کا تعلق کراچی ہی سے ہے؟''

''نہیں جناب' میں بنیادی طور پر حیدر آباد کا رہنے والا ہوں۔''

''حیدر آباد دکن یا......؟'' میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

وہ جلدی سے بولا۔'' میں اس حیدر آباد کی بات کر رہا ہوں' جو کوٹری کے قریب واقع ہے' دریائے سندھ کے کنارے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا' پھر پوچھا۔'' آپ مقتول کے پاس کتنے عرصے سے کام کر رہے تھے؟''

''لگ بھگ پانچ سال سے۔'' اس نے جواب دیا۔

''وقوعہ کے بارے میں آپ نے فون کر کے تھانے میں اطلاع دی تھی۔'' میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔'' کیا آپ کے پاس تھانے کا نمبر موجود تھا؟''

میں جان بوجھ کر ہلکے پھلکے اور غیر متعلقہ سوالات سے اسے اپنے لیے تیار کر رہا تھا' کہ جب میں اس کی زبان سے کوئی راز کی بات اگلوانا چاہوں' تو وہ بے دھیانی میں مارا جائے۔ میرے سوال کے جواب میں اس نے بتایا۔

''تھانے کا نمبر مجھے تو معلوم نہیں تھا۔ میں نے پرویز بزمی کے دفتر سے پولیس کو فون کیا تھا۔''

پرویز بزمی اور اکمل خان کے نام استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں موجود تھے' اور ان کی شہادتیں پچھلی پیشی پر ہو چکی تھیں۔

میں نے فرید حسین پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے کہا۔''فرید صاحب! آپ نے نو نومبر کی صبح پرویز بزمی کے آفس سے ٹھیک نو بجے تھانے فون کر کے اس واقعے کی اطلاع دی' اور ساڑھے نو بجے پولیس نے موقع پر پہنچ کر کارروائی شروع کر دی۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں؟''



''نہیں جناب...... بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔''

میں نے پوچھا۔''فرید صاحب! آپ گزشتہ پانچ سال سے مقتول کے ہاں کُل وقتی ملازم تھے' اور آپ کی رہائش بھی اس فلیٹ میں تھی۔ آپ مقتول کے لئے ناشتے کا بندوبست کرتے' کھانے پینے کے معاملات دیکھتے' اور اس کی چھوٹی بڑی ہر ضرورت کا خیال رکھتے تھے۔ عموماً کھانا آپ گھر میں اپنے ہاتھوں سے بناتے تھے اور اگر ضرورت محسوس ہوتی' یا مقتول کی طرف سے کوئی فرمائش ہوتی' تو آپ ہوٹل سے کھانا بھی لے آتے تھے......'' میں نے لمحے بھر کے لیے توقف کیا' ایک گہری سانس خارج کی' اور اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

'' آپ نے اپنی خدمات کی بدولت مقتول کے گھر میں فرد کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ وہ آپ کو اپنا چھوٹا بھائی سمجھتا تھا' اور چھوٹی بڑی بات آپ سے شیئر کرتا تھا' جیسا کہ وقوعہ کے روز ہوا......'' میں نے دوبارہ چھوٹا سا توقف کیا' پھر دوستانہ انداز میں اضافہ کرتے ہوئے مزید کہا۔

''وقوعہ کی سہ پہر یعنی آٹھ نومبر کو ملزم اور مقتول کے درمیان خاصی گرما گرمی ہوگئی تھی۔ جس کے نتیجے میں ملزم بھنائے ہوئے انداز میں دفتر سے باہر چلا گیا تھا۔ بعد ازاں جب آپ نے مقتول سے اس واقعے کا سبب جاننا چاہا' تو اس نے آپ کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ آپ پر پورا بھروسا کرتا تھا۔ فرید صاحب...... اگر میں ذرا بھی غلط کہوں تو آپ فوراً مجھے ٹوک دیجیے گا۔''

''نہیں وکیل صاحب! آپ تو لفظ لفظ درست فرما رہے ہیں۔'' وہ جلدی سے بولا۔

''یہی حقیقت تھی لیکن......'' اس نے افسردگی سے ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔''اب تو بھٹی صاحب ہی زندہ نہیں رہے۔''

میں نے جرح کے زاویے کو تبدیل کیا' اور سوالات میں تیزی لاتے ہوئے استغاثہ کے گواہ سے پوچھا۔''فرید صاحب! وقوعہ کی رات مقتول خاصی تھکن محسوس کر رہا تھا۔ آپ نے استغاثہ کے وکیل کو بتایا ہے کہ اس رات وہ کھانا کھاتے ہی اپنے بیڈ روم میں چلا گیا تھا۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وقوعہ کی رات آپ نے مقتول کے لئے کتنے بجے کھانا لگایا

تھا؟"

"میرا خیال ہے' اس وقت رات کے نو بج رہے تھے۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ "کھانے اور چائے سے فارغ ہونے کے بعد مقتول سونے کے لئے اپنے بیڈروم میں داخل ہو گیا تھا' اور آپ آفس والے صوفے پر لیٹ گئے تھے۔ کیا آپ مجھے بتانا پسند کریں گے کہ مقتول کتنے بجے اپنے بیڈروم میں گیا تھا؟"

"ساڑھے نو بجے......"

"اور چند منٹ کے بعد ملزم واپس آ گیا تھا؟"

"جی ہاں......اس کی واپسی رات دس بجے ہوئی تھی۔"

"ملزم نے آپ کو بتایا تھا' کہ اس نے اپنے لیے الگ رہائش کا بندوبست کر لیا ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "وہ اپنا سامان لینے کے لیے واپس آیا تھا' اور اس نے کہا تھا' کہ وہ مقتول سے چند باتیں کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے وہاں سے چلا جائے گا۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟"

"جی ہاں......!" اس نے اثبات میں جواب دیا۔

"اور آپ کو ملزم کی روانگی کا اس وقت پتا چلا' جب وہ فلیٹ سے رخصت ہو چکا تھا' لہٰذا آپ نہیں دیکھ سکے کہ وہ کون کون سا سامان لے گیا تھا۔ ویسے انکوائری آفیسر کے مطابق تو وہ اس فلیٹ سے اپنا کوئی بھی سامان لے کر نہیں گیا تھا۔ جب سب انسپکٹر شمشاد علی نے اس کے بیڈروم کا معائنہ کیا' تو وہاں ہر شے جوں کی توں موجود تھی......!" میں نے بدستور اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں......اس بات پر مجھے حیرت ہوئی تھی۔"

"آپ کو یہ حیرت کب ہوئی تھی؟"

"جج......جی......کیا مطلب......؟" اس نے الجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "مطلب یہ ہے کہ آپ کو ملزم کے سامان نہ لے جانے پر جو حیرت ہوئی تھی' اس کا موقع کون سا تھا......رات کو ملزم کے رخصت ہوتے وقت یا پھر پولیس کی خانہ تلاشی کے وقت؟"



"جی...... میں صبح کی بات کر رہا ہوں۔" وہ قدرے سنبھلے ہوئے لہجے میں بولا۔

"رات کو تو جب ملزم وہاں سے چلا گیا' تو میں فلیٹ کا دروازہ بند کر کے واپس آفس والے صوفے پر لیٹ گیا تھا۔ ملزم کے سامان کے بارے میں تو اس وقت انکشاف ہوا' جب پولیس نے اس کے کمرے کی تلاشی لی۔"

"یعنی رات کو ملزم کے حوالے سے آپ کے اندر کوئی تجسس نہیں جاگا' کہ وہ مقتول سے کیا باتیں کر کے گیا ہے؟" میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ "آپ نے ملزم کو مقتول کے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا' اور جا کر آفس والے صوفے پر لیٹ گئے' ہیں نا؟"

"جی ہاں...... آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" وہ متذبذب لہجے میں بولا۔ "میں نے رات ملزم کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی' اس لئے اس کے حوالے سے میرے اندر کوئی تجسس پیدا نہیں ہوا تھا۔"

"چلیں' آپ ہی کی بات کو درست مان لیتے ہیں۔" میں نے سرسری انداز میں کہا' پھر پوچھا۔ "ملزم کو پولیس نے کب اور کہاں سے گرفتار کیا تھا؟"

"یہ بندہ اگلی صبح خود ہی چل کر دفتر آ گیا تھا۔" استغاثہ کے گواہ نے جواب دیا۔

"جس وقت پولیس والے موقع کی کارروائی کر رہے تھے' تو یہ وہاں پہنچا' اور ایسا بن گیا' جیسے وہاں پیش آنے والے حادثے سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔ میں نے سب انسپکٹر صاحب کی توجہ اس کی جانب مبذول کرائی' اور انہیں بتایا کہ اسی شخص کے ہاتھوں بھٹی صاحب کا یہ حشر ہوا ہے۔ پولیس نے فوراً اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنا دی۔ اس وقت دس بجے تھے۔"

میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "میرے مؤکل نے خود کو وقوعہ سے لاتعلق ظاہر کرنے کی اداکاری نہیں کی تھی' بلکہ یہ حقیقت ہے کہ شیدا نائی کے قتل اور ساٹھ ہزار روپے کے خورد برد سے اس بے چارے کا دور دور کا بھی واسطہ نہیں۔ نو نومبر کی صبح دس بجے جب خالد بھٹی مقتول کے فلیٹ پر پہنچا' تو اس کے وہم و گمان بھی نہیں تھا' کہ وہاں قتل کی واردات ہو چکی ہے۔"

فرید حسین نے آنکھیں جھپکا کر مجھے دیکھا' اور خفگی آمیز لہجے میں بولا۔ ''یہ تو آپ بڑی عجیب بات کر رہے ہیں۔''

''جو بات سرِدست عجیب نظر آ رہی ہے نا' وہ تھوڑی دیر کے بعد غریب بھی ہونے والی ہے مسٹر فرید!'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''پھر یہ عجیب وغریب صورتِ حال کسی کو بہت ہی غریب اور لاچار کر دے گی۔ آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں نا مسٹر فرید؟''

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کے منہ سے صرف اتنا نکلا۔ ''وکیل صاحب! پتا نہیں' آپ کس قسم کی معنی خیز باتیں کر رہے ہیں......!''

جج سمیت تمام حاضرینِ عدالت بشمول وکیلِ استغاثہ اور تفتیشی افسر سانس روک کر استغاثہ کے گواہ پر ہونے والی جرح کا نظارہ کر رہے تھے۔ یہ نظارہ فی الحال بڑا محظوظ کرنے والا' اور دل خوش کر دینے والا تھا' لیکن آگے چل کر یہی نظارہ استغاثہ اینڈ کمپنی کے لئے خطرناک اور تکلیف دہ ثابت ہونے والا تھا۔ میں نے گواہ کی الجھن کو سلجھن میں بدلنے کے لئے ''آپ'' سے ''تم'' تک کا سفر ایک لمحے میں طے کر لیا' اور گمبھیر انداز میں کہا۔

''فرید حسین! میری معنی خیز باتوں کے معانی بس اب کھلنے ہی والے ہیں' تم توجہ سے مجھے سنو اور بتاؤ کہ جس وقت ملزم کو پولیس گرفتار کر رہی تھی' ان لمحات میں اس کا مؤقف کیا تھا؟''

''میں نے بتایا ہے نا جناب! یہ بالکل انجان بن گیا تھا۔ اس نے پولیس سے کہا کہ وہ تو اپنا سامان لینے وہاں آیا ہے۔ وہ کسی دوسری جگہ اپنی رہائش کا بندوبست نہیں کر سکا' اور اس نے فیصلہ کیا ہے' کہ واپس اپنے گاؤں پنڈی بھٹیاں چلا جائے گا۔ اس نے بھٹی صاحب کو پیش آنے والے حادثے سے قطعی لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔''

''حالانکہ یہ تمہیں رات میں بتا چکا تھا' کہ اس نے کہیں رہائش کا انتظام کر لیا ہے۔'' میں نے سہلانے والے انداز میں کہا۔ ''وہ رات دس بجے اپنا سامان اٹھانے مقتول کے فلیٹ پر پہنچا تھا' پھر سامان لئے بغیر خاموشی سے واپس چلا گیا...... بالکل چوروں کی طرح'



ہیں نا؟''

''واقعی!'' وہ میری ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے بولا۔ ''اس کا رویہ میری سمجھ سے تو بالاتر ہے جناب!''

''بالاتر ہی نہیں...... بلکہ زیریں تر بھی!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ ''جی...... میں سمجھا نہیں؟''

میں نے اس کے حیرت بھرے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے استفسار کیا۔ ''فرید حسین! استغاثہ کے مطابق بہ الفاظ دیگر تمہارے مطابق ملزم اور مقتول کے درمیان آٹھ نومبر کی سہ پہر شدید جھگڑا ہوا' جس کے نتیجے میں ملزم ناراض ہو کر وہاں سے چلا گیا۔ اسی رات دس بجے وہ واپس آیا' اور بتایا کہ وہ اپنا سامان لے جانے آیا ہے' مگر بعد ازاں پتا چلا کہ وہ سامان لیے بغیر ہی واپس چلا گیا تھا۔ آپ کا خیال ہے' اس نے مقتول کے بیڈ روم میں داخل ہو کر اس کو اسی سائیلنسر لگے ریوالور سے قتل کیا' اور ساٹھ ہزار روپے سمیٹ کر رفو چکر ہو گیا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بھی اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ مقتول شیدا نائی کی موت آٹھ نومبر کی رات دس اور گیارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی' یعنی جس وقت آپ کی بیان کردہ کہانی کی رُو سے ملزم مقتول کے بیڈ روم میں موجود تھا۔ اچھی طرح سوچ سمجھ کر میرے سوال کا جواب دینا......'' میں سانس ہموار کرنے کے لئے متوقف ہوا' پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''ایک شخص جو رات دس اور گیارہ بجے کے درمیان کسی کو قتل کر کے چوروں کی طرح خاموشی سے ساٹھ ہزار روپے اُڑا کر رفو چکر ہو جائے' وہ اگلی صبح جائے وقوعہ کا رخ کیوں کرے گا' جب کہ وہ اس بات کا اعلان بھی کر چکا ہو کہ اس نے اپنی رہائش کا الگ بندوبست کر لیا ہے؟''

''یہ...... یہ تو آپ......'' وہ اضطراری انداز میں میرے مؤکل کی جانب انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ...... اسی سے پوچھیں۔''

''ٹھیک ہے' یہ بات میں اسی سے پوچھوں گا' لیکن بعد میں۔'' میں نے اس کی بے خبری میں اپنا کام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''فی الحال تم یہ بتاؤ کہ تمہیں یہ بات کس وقت پتا

چلی کہ مقتول شیدانائی تمہیں چھوڑ کر کسی اور ہی دنیا کی شہریت اختیار کر چکا ہے؟''

''اس افسوس ناک حقیقت کا مجھے اگلی صبح علم ہوا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔

''اگلی صبح......یعنی نو نومبر کو؟''

''جی ہاں۔'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔''صبح کتنے بجے؟''

''لگ بھگ ساڑھے آٹھ بجے۔''

''کیسے؟''

''میں عموماً صبح سات اور ساڑھے سات بجے کے درمیان اٹھ جاتا ہوں۔'' وہ وضاحتی انداز میں بولا۔''جبکہ بھٹی صاحب کم وبیش آٹھ بجے بیدار ہوتے تھے۔ ناشتہ ہم ساڑھے آٹھ بجے کیا کرتے تھے۔ اس کے بعد بھٹی صاحب اخبار وغیرہ پڑھنے میں مصروف ہوجاتے' اور میں آفس کی ڈسٹنگ اور دیگر صفائی کے کام نمٹانے لگتا۔ بھٹی صاحب تیار ہوکر ٹھیک دس بجے دفتر میں بیٹھ جاتے تھے۔''

وہ چند لمحے کے لیے رکا' تو میں یہ محسوس کیے بنا نہ رہ سکا کہ بھٹی صاحب یعنی شیدانائی کے لیے ظاہر کی جانے والی اس کی عقیدت میں بناوٹی پن پایا جاتا تھا' جیسے کوئی گن پوائنٹ پر اسے یہ اداکاری کرنے پر مجبور کر رہا ہو۔

وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔''نو نومبر کی صبح جب معمول کے مطابق بھٹی صاحب نہیں اٹھے' تو مجھے تشویش ہوئی۔ ساڑھے آٹھ بج گئے تھے' یعنی ناشتے کا وقت ہوگیا تھا۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا' لہٰذا میری تشویش بہت زیادہ بڑھ گئی۔ میں نے سوچا کہ ان کے دروازے پر دستک دیتا ہوں۔ میں نے تین چار مرتبہ دستک دی' مگر اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ اب تو میری تشویش پریشانی میں بدل گئی۔ میں نے بیڈروم کے دروازے کو دبا کر دیکھا' تو پتا چلا کہ وہ اندر سے بند ہے۔ میرا دھیان سلائیڈنگ ونڈو کی طرف چلا گیا۔ میں نے مذکورہ کھڑکی پر طبع آزمائی کی تو تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ پھسل گئی۔ اس طرح اتنا خلا پیدا ہوگیا کہ میں بیڈروم کے اندر جھانک سکوں۔ میں نے اندر جھانکا' اور میری آنکھیں خوف کے مارے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں......'' وہ ایک جھرجھری لے



کر خاموش ہوگیا۔

میں نے اس کی ہارڈ ایکٹنگ سے متاثر ہوئے بغیر سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔''تم نے مقتول کے بیڈروم میں ایسا کیا دیکھ لیا تھا' کہ تمہارے رونگٹے کھڑے ہوگئے؟''

''جناب!'' میں سراسیمہ لہجے میں بولا۔''میں نے بھٹی صاحب کو بیڈ پر مردہ پڑے پایا۔ ان کی لاش اپنے ہی خون میں لت پت پڑی تھی۔''

''یعنی سلائیڈنگ ونڈو کے خلا سے جھانکنے پر تمہیں پتا چل گیا کہ شیدانائی کی لاش اپنے ہی خون میں لت پت پڑی ہے؟'' میں نے تیز نظروں سے اسے گھورا۔

وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔''ونڈو میں سے دیکھ کر تو مجھے اندازہ ہوا تھا' پھر جب مذکورہ ونڈو کو کسی طرح کھول کر میں اندر داخل ہوا' تو بھٹی صاحب کی کھوپڑی کو دیکھ کر مجھے یقین ہوگیا کہ وہ اب باقی نہیں رہے۔''

''پھر تم نے کیا کیا؟'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

اس نے بتایا۔''میں فوراً بیڈروم سے باہر نکل آیا۔''

''اسی سلائیڈنگ ونڈو کے راستے؟''

''نہیں' میں نے بیڈروم کے دروازے کی کنڈی کھول لی تھی۔'' اس نے جواب دیا۔

''پھر......پھر تم نے مقتول کے بیڈروم سے باہر نکل کر سب سے پہلا کام کیا کیا؟''

''میں فلیٹ سے باہر نکل آیا۔'' اس نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا۔

''وہ صبح کا وقت تھا' اس لئے بلڈنگ میں واقع دیگر دفاتر ابھی کھلے نہیں تھے۔ فوراً میرے ذہن میں آیا کہ میں گراؤنڈ فلور پر جاؤں۔ وہاں پرویز بزمی کا آفس کھلا ہوگا۔ بزمی صاحب ٹائم کے بڑے پابند ہیں۔ ٹھیک آٹھ بجے وہ اپنی سیٹ پر موجود ہوتے ہیں۔ تو جناب! میں نے بزمی صاحب کے آفس سے لگ بھگ نو بجے تھانے فون کیا' اور ساڑھے نو بجے پولیس فلیٹ پر موجود تھی۔''

''ٹھیک ہے......اچھی کہانی ہے' مجھے پسند آئی!'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''جی......کون سی کہانی؟'' وہ وحشت زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔''میرے سوالات کے جواب دیتے دیتے تمہیں اپنے تمام سوالات

کے جوابات خودبخود مل جائیں گے۔"

وہ بدستور الجھی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھتا چلا گیا۔ میں نے اس کی الجھن کی پروا کیے بغیر پوچھا۔ "رات کو ملزم کے فلیٹ سے چلے جانے کے بعد تمہیں کسی قسم کا تجسس محسوس نہیں ہوا۔ اگلی صبح جب تم سلائیڈنگ ونڈو کے راستے مقتول کے بیڈروم میں داخل ہوئے' تو اس کی کھوپڑی کا حشر نشر ہو چکا تھا۔ ذرا سوچ کر بتاؤ' ملزم کی رخصت سے لے کر صبح آٹھ بجے کے دوران...... اس فلیٹ میں کوئی اور شخص بھی آیا تھا؟"

"جی نہیں...... بالکل نہیں۔" وہ کمزور سے لہجے میں بولا۔

"گویا وہ رات تم نے ایک لاش کے ساتھ اس فلیٹ میں گزاری تھی؟"

"لیکن مجھے کیا پتا تھا کہ بھٹی صاحب کو قتل کر دیا گیا ہے!" وہ نیم احتجاجی لہجے میں بولا۔

میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تمہیں حقیقت کا پتا تھا یا نہیں...... یہ سچ ہے کہ تم نے وہ رات ایک لاش کے ساتھ گزاری تھی۔ بڑا حوصلہ ہے تمہارا مسٹر فرید!"

وہ روہانسی آواز میں بولا۔ "جناب! میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھے اس بات کا بالکل پتا نہیں تھا' کہ بھٹی صاحب کو موت کے گھاٹ اتارا جا چکا ہے۔"

"اگر میں یہ کہوں کہ تمہیں شیدا نائی کی موت کی خبر تھی تو؟"

"جناب...... آپ یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں......!" وہ شکستہ لہجے میں بولا۔ "میں...... میں......"

اس کی بات کاٹتے ہوئے میں نے سنسنی خیز لہجے میں دریافت کیا۔ "فرید! تم مجھے بے وقوف سمجھتے ہو' یا یہ تمہارا پہلا جرم ہے؟"

"جی...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" وہ ہکا بکا سا ہو کر مجھے دیکھنے لگا۔ "جناب! میں نے کوئی جرم نہیں کیا اور نہ ہی......"

"اس کا مطلب ہے' تم مجھے بے وقوف سمجھتے ہو؟" میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی پوچھ لیا۔





"جناب! میں نے یہ بھی نہیں کہا......!"

"تم مجھے بے وقوف سمجھتے ہو اور نہ ہی تم نے کوئی جرم کیا ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اگر واقعی ایسا ہے' تو پھر تمہیں میرے ایک سوال کا جواب دینا ہوگا' لیکن بہت سوچ سمجھ کر......!"

اس نے ہاتھ اٹھا کر اپنی گردن کو سہلانا شروع کر دیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا' اس کا حلق خشک ہو گیا ہے۔ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے سنسنی خیز لہجے میں پوچھا۔

"فرید حسین وقوعہ کی رات ملزم کے فلیٹ سے نکل جانے کے بعد تم نے یہ ضروری نہیں سمجھا کہ مقتول کے پاس جا کر ملزم کی آمد اور اغراض و مقاصد کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتے۔ تم نے فلیٹ کا بیرونی دروازہ بند کیا اور آفس میں آ کر سو گئے' پھر اگلی صبح ہی تمہاری آنکھ کھلی۔ تم نے یہی بیان دیا ہے نا؟"

"جی ہاں' میں نے اپنے بیان میں یہی کہا ہے۔" وہ متذبذب لہجے میں بولا۔

میں نے کہا۔ "اگلی صبح جب مقتول حسبِ معمول بیدار نہیں ہوا' تو تم گہری تشویش میں مبتلا ہو گئے' اور تم نے اس کے بیڈروم میں جا کر صورتِ حال جاننے کا فیصلہ کیا' لیکن بیڈروم کے دروازے کو اندر سے بند پایا' چنانچہ تم سلائیڈنگ ونڈو کو کھسکا کر بیڈروم کے اندر پہنچے اور پھر تمہیں پتا چلا کہ مقتول کو سر میں گولیاں مار کر ہلاک کر دیا گیا ہے۔ تم وحشت کے عالم میں دروازے کی کنڈی کھول کر بیڈروم سے باہر نکل آئے' اور گراؤنڈ فلور پر جا کر تم نے پرویز بزمی کے آفس سے پولیس کو فون کر دیا۔ میں نے حقیقتِ حال بتانے میں کوئی غلطی کی ہو یا کوئی اہم نکتہ بیان ہونے سے رہ گیا ہو تو بتا دو؟"

"نہیں جناب......" وہ متاملانہ لہجے میں بولا۔ "آپ بالکل ٹھیک جا رہے ہیں۔"

"اگر میں بالکل ٹھیک جا رہا ہوں' تو تم پر بھی لازم ہے کہ میرے سوال کے جواب میں تم پٹڑی سے نیچے نہ اترنا' اور میں جو کچھ بھی پوچھوں' سچ سچ بتانا؟"

"جی...... جی پوچھیں؟" وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔

میں نے پوچھا۔ "فرید حسین! وقوعہ کی رات لگ بھگ سوا دس بجے ملزم مقتول کے فلیٹ سے رخصت ہو گیا' تو پھر مقتول کے بیڈروم کے دروازے کو اندر سے کنڈی کس نے

لگائی تھی؟''

اس کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرا کر رہ گیا...... بے حد نروس انداز میں اس نے بے ساختہ کہا۔ ''مم...... مجھے...... کیا پتا جی...... میں تو سو گیا تھا جناب۔''

''تم سو گئے تھے......'' میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''تمہارے اور استغاثہ کے مطابق ملزم سائیلنسر لگے ریوالور سے مقتول کو موت کے گھاٹ اتار کر فلیٹ سے نکل گیا تھا۔ باقی بچا مقتول شیدانائی......!'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی اور بدستور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ میرے مؤکل نے مقتول کی کھوپڑی میں دو خاموش گولیاں اتار کر اسے قیدِ حیات سے آزاد کر دیا تھا' تو پھر یہ ممکن نہیں رہتا کہ ملزم کے رخصت ہو جانے کے بعد ایک مردہ شخص اٹھ کر دروازے کو اندر سے کنڈی لگائے...... اور اگر یہ کنڈی مقتول شیدانائی ہی نے لگائی تھی' تو پھر یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ جب ملزم' مقتول کے فلیٹ سے رخصت ہوا' تو مقتول زندہ سلامت تھا۔ شیدانائی کی موت ملزم کے جانے کے بعد واقع ہوئی تھی۔ اس وقت جب فلیٹ میں صرف دو افراد موجود تھے۔ یعنی تم اور مقتول...... اب تم ہی بتاؤ' مقتول کی موت کب' کیسے اور کس کے ہاتھوں واقع ہوئی تھی؟''

اس کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ برسوں کا بیمار نظر آنے لگا۔ میں نے بڑے غیر محسوس طریقے سے جرح کی مدد سے گھیر گھار کر اسے ایک تاریک بند گلی میں لاکھڑا کیا تھا۔ اس کے پاس فرار کا کوئی راستہ بچا تھا' اور نہ ہی بچاؤ کی کوئی راہ اسے دکھائی دے رہی تھی۔ حالات کی اسی تاریکی میں ہاتھ پاؤں چلاتے ہوئے اس نے اپنے تئیں بڑی عقل کی بات کی۔ پیشانی پر نمودار ہونے والے پسینے کو ہاتھ کی پشت سے صاف کرنے کے بعد اس نے کہا۔

''جناب...... یہ بھی تو ہو سکتا ہے' بھٹی صاحب نے ملزم کے جانے کے بعد دروازے کو اندر سے کنڈی لگائی' اور خودکشی کر لی......!''

''ونڈرفل...... بہت خوب!'' میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''اگر ایسا ہو جائے تو



کیا کہنے...... اس طرح تو میرا مؤکل' شیدانائی کے قتل کے الزام سے آپوں آپ بری ہو جائے گا' لیکن افسوس کہ ایسا ہو نہیں سکتا......!''

''کیوں نہیں ہو سکتا......؟'' وہ میری بات کو سمجھے بغیر جلدی سے بولا۔ ''بھٹی صاحب نے خودکشی نہیں کی ہو گی' یا آپ کے مؤکل کے بری ہونے کا امکان نہیں؟''

مجھ سے اس نوعیت کا استفسار کر کے گویا اس نے اوکھلی میں سر دے دیا تھا۔ میں نے کہا۔

''فرید حسین! میں اپنے مؤکل کو تو ہر قیمت پر قتل کے اس الزام سے باعزت بری کروا ہی لوں گا' لیکن مجھے اس کیس میں تمہاری گردن پھنستی نظر آ رہی ہے!''

''مم...... میری گردن......!'' وہ بڑے خوف زدہ انداز میں اپنی گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ''مم...... مگر کیوں......؟''

''مگر...... اس لئے کہ تمہارے بھٹی صاحب اور میرے شیدانائی نے قطعاً خودکشی نہیں کی۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''آپ...... یہ بات اتنے یقین سے...... کیسے کہہ سکتے ہیں......؟''

''اس لیے کہہ سکتا ہوں کہ کوئی بھی شخص اپنی کھوپڑی کے پرخچے اُڑانے کے بعد اس قابل نہیں رہتا کہ اپنے بیڈروم سے باہر نکلے اور فلیٹ کے باہر رکھی ڈسٹ بن میں آلہ قتل کو پھینک سکے' اور پھر چپ چاپ چلتے ہوئے وہ اپنے بیڈ پر آ کر لیٹ جائے اس طرح کہ فلیٹ کے کسی حصے میں اس نقل و حرکت کے نتیجے میں خون کا کوئی دھبہ دکھائی نہ دے؟''

اتنا کہہ کر میں نے انکوائری آفیسر کی جانب رخ پھیرا' اور تصدیقی لہجے میں استفسار کیا۔ ''آپ نے آلۂ قتل کو ڈسٹ بن میں سے برآمد کرنے کے بارے میں تو بتایا تھا' لیکن وہ خون کے دھبے......؟''

''فرید کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔'' میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی تفتیشی افسر نے جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں کہا۔ ''یہ خودکشی کا کیس نہیں' بلکہ قتل کی واردات ہے۔''

لیکن اس سے پہلے کہ میں زبان کو زحمت دیتا' ایک عجیب واقعہ پیش آ گیا۔ استغاثہ کا گواہ فرید حسین کٹہرے کی ریلنگ کو تھامے تھامے زمین پر بیٹھ گیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا'

اسے بہت زور کا چکر آ گیا ہے۔ میں نے اس کی خرابی صحت کی پروا کیے بغیر جج سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"یور آنر! صورتِ حال روزِ روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہے۔ استغاثہ کے سب سے اہم گواہ فرید حسین کو آنے والے چکر کا سبب وہ تصور ہے' جس میں اس نے جیل کی سلاخیں اپنا مقدر ہوتے دیکھ لی ہیں۔ میری معزز عدالت سے استدعا ہے کہ فرید حسین کو شاملِ تفتیش کر کے یہ جاننے کی کوشش کی جائے' کہ شیدا نائی کو کس نے قتل کیا تھا۔ میرا مؤکل اس سلسلے میں قطعی بے گناہ ہے۔ حالات و واقعات کی روشنی میں وہ بے گناہ ثابت ہو چکا ہے۔ اگر پولیس فرید حسین پر سختی کرے تو وہ بتانے پر مجبور ہو جائے گا کہ قاتل کون ہے...... میرا دعویٰ ہے کہ اگر قتل اس نے نہیں کیا' تو وہ قاتل کو جانتا ضرور ہے۔ دیٹس آل یور آنر!"

وکیلِ استغاثہ کے پاس کسی اعتراض کی گنجائش نہیں بچی تھی' لہٰذا جج نے میری فرمائش پوری کرتے ہوئے متعلقہ عدالتی عملے' وکیلِ استغاثہ اور انکوائری آفیسر کو خاص ہدایات دے دیں۔

گزشتہ پیشی پر میں نے اپنے مؤکل خالد بھٹی کو بے قصور اور شیدا نائی مرڈر کیس سے غیر متعلق ثابت کر دیا تھا' لیکن اس وقت تو خالد بھٹی کی بے گناہی پر مہرِ تصدیق ثبت ہو گئی' جب پولیس کی کسٹڈی میں فرید حسین کی چیں بول گئی۔ وہ ان کی خاطر مدارت کو ہضم نہ کر سکا' اور اس نے بڑی شرافت سے اپنے جرم کا اقرار کر لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ساٹھ ہزار روپے کی خورد برد کو بھی تسلیم کر لیا۔

فرید حسین کے اقبالِ جرم کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں' مختصراً جان لیں کہ وہ پچھلے کچھ عرصے سے ایسی واردات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ خالد بھٹی کی وہاں آمد اور جلد ہی مقتول کے ساتھ پیدا ہو جانے والے اس کے اختلاف نے فرید کو ایک موقع فراہم کر دیا۔ اس نے اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے لیے خالد کو قربانی کا بکرا بنا دیا تھا۔

آئندہ پیشی پر عدالت نے میرے مؤکل کو بے گناہ قرار دیتے ہوئے باعزت بری کر دیا۔ اس روز سردار بھٹی بہت خوش تھا۔ ہم عدالت سے باہر آئے' تو اس نے اپنے ہمراہ



آئے ہوئے ایک عمر رسیدہ شخص کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"بیگ صاحب! اس سے ملیں ...... یہ آپ کا بہت بڑا فین ہے۔"

"فین......!" میں نے مذکورہ شخص سے مصافحہ کرتے ہوئے تعجب خیز لہجے میں کہا۔ "لیکن میں آپ کو پہچانا نہیں بزرگو...... آپ کس حوالے سے میرے فین ہیں؟"

اس شخص نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔ "یوں سمجھیں کہ میں آپ کا شکر گزار فین ہوں۔"

مجھے الجھن میں مبتلا دیکھ کر سردار بھٹی نے فوراً وضاحت کر دی۔ "بیگ صاحب! یہ میرا سالا طفیل بھٹی ہے' جس کے لئے آپ نے ایک دیسی نسخہ عنایت فرمایا تھا۔ یہ اپنے پاؤں پر چل کر پنڈی بھٹیاں سے کراچی پہنچا ہے۔ آپ کے نسخے نے اس کے گِٹّے گوڈے (ٹخنے اور گھٹنے) ایک دم جوان کر دیے ہیں۔"

مجھے مذاق سوجھا۔ میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "بھٹی صاحب! آپ تو بڑی عجیب بات بتا رہے ہیں۔ اس نسخے کا یہ کرشمہ تو میرے علم میں تھا ہی نہیں کہ اس کے استعمال سے انسان ہزار ڈیڑھ ہزار میل پیدل چلنے کے قابل ہو جاتا ہے۔"

"اوہ!" سردار بھٹی خجالت آمیز انداز میں بولا۔ "میرے کہنے کا مطلب یہ تھا' کہ طفیل بھٹی اپنے پاؤں سے چلنے لگا ہے۔ پنڈی بھٹیاں سے کراچی آنے کے لئے تو اس نے ٹرین ہی میں سفر کیا ہے۔"

"اگر ٹرین کا ذریعہ یا کسی بھی سواری کا وسیلہ نہ ہوتا' تو بھی میں پیدل چل کر کراچی ضرور آتا۔" طفیل بھٹی نے جوشیلے لہجے میں کہا۔ "اور اس کی دو وجوہات ہیں۔"

میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تو اس نے خود ہی اپنی بات کی وضاحت کر دی۔

"پہلی وجہ تو آپ سے ایک بھرپور ملاقات کی خواہش تھی' اور دوسرا مقصد اپنی آنکھوں سے اس جوان کو رہا ہوتے دیکھنا تھا' جواب بہت جلد میرا داماد بننے والا ہے!"

"داماد...... آپ خالد بھٹی کی بات کر رہے ہیں؟" میری الجھن دوچند ہو گئی۔

سردار بھٹی نے کہا۔ "آپ بالکل ٹھیک سمجھے ہیں' بیگ صاحب! طفیل بھٹی' اپنے خالد

ہی کی بات کر رہا ہے۔ جس معاملے کی وجہ سے خالد دل برداشتہ ہو کر سعودی عرب چلا گیا تھا' وہ اللہ کے فضل و کرم سے حل ہو گیا ہے۔ اب اس بات کا فیصلہ ہو گیا ہے کہ طفیل بھٹی کی بیٹی رخسانہ کی شادی خالد ہی سے ہو گی۔"

میں نے خالد بھٹی کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر یک بہ یک مختلف نوعیت کے تاثرات اکٹھا ہو گئے تھے' جن میں خوشی و مسرت کا تاثر سب سے نمایاں تھا۔ اس بات کا اندازہ لگانے میں مجھے قطعاً کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ ان دونوں نے اپنے "فیصلے" سے خالد کو ابھی اور اسی وقت آگاہ کیا تھا۔

میں نے خالد سے پوچھا۔ "تم ہی بتاؤ' میں تمہیں مبارک باد دیتے ہوئے کس قسم کے الفاظ کا استعمال کروں...... نئی زندگی مبارک ہو' مصیبت سے نجات مبارک ہو' باعزت رہائی مبارک ہو یا...... شبِ وصال مبارک ہو......" "شب" کا لفظ میں نے اس لئے چنا کہ تمہاری شادی کے موقع پر تو میں موجود نہیں ہوں گا' لہٰذا میری جانب سے شادی کی پیشگی مبارک ہو۔"

"میں آپ کو اپنی شادی میں ضرور مدعو کروں گا بیگ صاحب!" خالد بھٹی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اس لیے "شبِ وصال" کی مبارک کو ابھی آپ اپنے پاس ہی محفوظ رکھیں۔"

"ٹھیک ہے' تمہاری "شبِ وصال"...... میرا مطلب ہے' تمہاری شادی کی "مبارکباد" میرے پاس امانت کے طور پر رکھی ہے۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

ان تینوں کے چہرے خوشی سے چمکنے لگے۔





## فتنہ حسن

وہ موسم گرما کی ایک تپتی ہوئی حبس زدہ سہ پہر تھی۔ کراچی کے باسی موسم کی اس سفاکی اور زیادتی سے بخوبی واقف ہیں۔ انسان تو انسان' چرند اور پرند بھی سائے اور ٹھنڈک کی تلاش میں پریشان اور بے حال دکھائی دیتے ہیں۔ ایسی ہی ایک بے سکون اور قیامت خیز سہ پہر میں' میں اپنے ایئر کنڈیشنڈ آفس کی خوش گوار فضا میں بیٹھا تھا۔ اس وقت جو عورت مجھ سے ملنے آئی' اس کو دیکھتے ہی میرے دل میں ہمدردی کے جذبات اُمڈ آئے۔ وہ خاصی دکھی اور بدحال دکھائی دیتی تھی۔

اس نے پیشانی پر ہاتھ لے جا کر مجھے سلام کیا۔ میں نے اس کے سلام کا جواب دیا' اور بیٹھنے کے لیے کرسی کی جانب اشارہ کر دیا۔ پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے اپنے کلائنٹس کا استقبال کرنا میری کاروباری عادت بن چکی ہے۔ میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا' اور اپنے سامنے بیٹھی عورت کی جانب دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ "جی...... میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"وکیل صاحب؟ میں بہت غریب عورت ہوں۔" وہ دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے منت آمیز لہجے میں بولی۔ "ایک بہت بڑی مصیبت مجھے آپ کے پاس لے آئی ہے۔"

وہ یہ بات اپنی زبان سے نہ بھی بتاتی' تب بھی حلیے سے وہ غریب اور مصیبت زدہ ہی دکھائی دیتی تھی۔ میں نے قدرے نرم لہجے میں اس سے پوچھا۔ "میں تمہاری کیا مدد کر

سکتا ہوں؟"

"آپ میرے قاسم کو چھڑا دیں تو میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گی۔" وہ اضطراری انداز میں جلدی سے بولی۔

"قاسم......؟" میں نے الجھن زدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ میری الجھن میں چھپے ہوئے سوال کو فوراً سمجھ گئی' اور وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "قاسم میرے شوہر کا نام ہے۔"

"اوہ!" میں نے ایک گہرا سانس خارج کر کے پوچھا۔ "قاسم کو کہاں سے چھڑانا ہے؟"

"پولیس کے قبضے سے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ قاسم کو پولیس نے گرفتار کر لیا ہے؟" میں نے کاغذ قلم سنبھالتے ہوئے گہری سنجیدگی سے سوال کیا۔

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "جی......جی ہاں۔"

"قاسم کی گرفتاری کی وجہ کیا ہے؟"

"اس پر قتل کا الزام ہے۔"

"تمہارے شوہر نے کس کو قتل کیا ہے؟"

"قاسم نے کسی کو قتل نہیں کیا۔" وہ نیم احتجاجی لہجے میں بولی۔ "پولیس والوں کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔"

میں نے اپنے سوال کو دوسرے زاویے سے دُہرایا۔

"میرے پوچھنے کا مطلب یہ ہے کہ قاسم پر کس شخص کے قتل کا الزام عائد کیا گیا ہے؟"

"اس بندے کا نام فرید پتا چلا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"پتا چلا ہے......کیا مطلب؟" میں نے چونکتے ہوئے دریافت کیا۔

"وہ جی......بات یہ ہے کہ پولیس ابھی اس بندے کے بارے میں تفتیش کر رہی ہے۔" وہ بولی۔ "پولیس کا دعویٰ ہے کہ وہ لوگ ایک آدھ دن میں مقتول کے وارثوں تک



پہنچ جائیں گے۔"

"اوہ......تو اس کا مطلب ہے' فرید نامی وہ بندہ لاوارث ہے۔" میں نے معنی خیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے خود کلامی کی' پھر اپنے سامنے بیٹھی پریشان حال عورت سے استفسار کیا۔ "تمہارے شوہر قاسم کی مقتول سے کیا دشمنی تھی؟"

"کوئی دشمنی نہیں تھی۔" اس نے بتایا۔ "بلکہ قاسم تو فرید کو جانتا تک نہیں تھا۔"

"تمہارا شوہر کام کیا کرتا ہے؟" میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھ لیا۔

وہ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولی۔ "وہ......وہ جی......ہم لوگ فقیر ہیں۔"

"فقیر......تمہارا مطلب ہے بھکاری؟"

"جی ہاں......بھیک مانگنا ہی ہمارا پیشہ ہے۔" وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

میں سوچ میں پڑ گیا' اور ٹٹولتی ہوئی نظروں سے قاسم بھکاری کی بیوی کو دیکھنے لگا۔

وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ "وکیل صاحب! آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم بھکاری ضرور ہیں' لیکن آپ کی پوری فیس ادا کریں گے۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے ہمارے پاس۔ بس آپ میرے قاسم کو چھڑا لیں۔ آپ کی فیس کے علاوہ بھی جو خرچہ ہو گا' میں اس کے لیے تیار ہوں۔"

میں نے لاشعوری طور پر ایک اطمینان بھری سانس خارج کی' اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس سے پوچھا۔ "اب تم مجھے تفصیل سے سارے حالات بتاؤ۔"

"اچھا جی!" اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور بڑی رسان سے اپنی داستان بیان کرنے لگی۔



اس عورت کا نام عائشہ تھا' جو اپنے شوہر قاسم کے سلسلے میں مجھ سے ملنے آئی تھی۔ عائشہ کی عمر پینتیس اور سینتیس کے درمیان ہو گی۔ وہ لوگ موسیٰ کالونی کے ایک چھوٹے سے جھگی نما کوارٹر میں رہتے تھے۔ گداگری ان کا خاندانی پیشہ تھا' لیکن میاں بیوی نے یہ پختہ فیصلہ کر رکھا تھا کہ وہ اس پیشے کو آگے نہیں بڑھائیں گے۔ ان کی نسل بھیک مانگنے کے بجائے تعلیم حاصل کرے گی' اور زندگی کے باعزت شعبوں میں قدم رکھے گی۔

لٰہذا زیادہ سے زیادہ بھیک مانگ کر اتنا جمع کر لینا چاہتے تھے کہ ان کے بچے تعلیم کے زیور سے آراستہ ہو سکیں۔

یہ ایک انقلابی سوچ تھی۔ان کی برادری کے جس شخص نے بھی ان کے خیالات کے بارے میں سنا' بہ قول شخصے...... ''تھو تھو'' کی' لیکن انہیں کسی کے تبصرے یا مخالفت کی پروا نہیں تھی۔وہ اپنے منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ہر تکلیف' ہر دکھ اٹھانے کو تیار تھے۔وہ ہر نوعیت کی قربانی دے کر اپنی اولاد کا مستقبل تابناک بنانا چاہتے تھے۔

ان کی تین اولادیں تھیں' دو بیٹے اور ایک بیٹی۔بیٹے بڑے تھے' اور بیٹی سب سے چھوٹی۔ان کی عمریں بالترتیب بارہ' دس اور سات سال تھیں' اور وہ تینوں سکول جاتے تھے۔ والدین ان کی زندگی بنانے کے لیے دن رات سرتوڑ کوشش جاری رکھے ہوئے تھے' اور جو کماتے تھے' اسے بڑے محتاط انداز میں محفوظ کرتے جا رہے تھے۔وہ چاہتے تو جھگی کو چھوڑ کر کسی متوسط علاقے میں رہائش اختیار کر سکتے تھے' لیکن بعض مصلحتوں کی بنا پر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔وہ اپنی معاشی حیثیت کو لوگوں پر ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے۔پھر کسی متوسط علاقے میں جا کر بسنے کے بعد لوگوں کے ذہنوں میں سب سے پہلا سوال یہی پیدا ہوتا کہ قاسم کا ذریعۂ معاش کیا ہے۔وہ زیادہ عرصے تک اپنے پیشے کو محلے داروں سے چھپا کر نہیں رکھ سکتا تھا' اور جب پاس پڑوس والوں کو معلوم ہوتا کہ ان کے بیچ بھکاریوں کا ایک خاندان آبسا ہے تو ظاہر ہے' ان کا رویہ یکسر تبدیل ہو جاتا' اور وہ لوگ رویے کی اس ناخوشگوار تبدیلی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔جب کہ موسیٰ کالونی میں ان کے لیے اس قسم کے مسائل کا کوئی سوال نہیں تھا۔وہ وہاں سال ہا سال سے رہ رہے تھے' اور لوگ ان کے بارے میں اچھی طرح جانتے بھی تھے۔ویسے قاسم نے سوچ رکھا تھا کہ جب وہ اتنا پس انداز کر لے گا کہ کسی اچھے علاقے میں جا کر کوئی جنرل اسٹور وغیرہ کھول سکے' تو وہ آبائی پیشے کو خیر باد کہہ کر موسیٰ کالونی سے بڑی خاموشی کے ساتھ نقل مکانی کر جائے گا۔

کچھ عرصہ پہلے تک عائشہ بھی اپنے مخصوص رنگ ڈھنگ میں بھیک مانگا کرتی تھی' لیکن قاسم نے بہ صد اصرار اسے گھر بٹھا دیا تھا۔قاسم کا خیال تھا کہ اسے کمائی کے بجائے بچوں پر توجہ دینی چاہیے۔معاش کی گاڑی کو وہ اکیلا ہی خوش اسلوبی سے کھینچ لے گا' اور یہ



فیصلہ اس نے گلشن والا ٹھکانا حاصل کرنے کے بعد کیا تھا۔

پہلے وہ کہیں اور بیٹھ کر بھیک مانگا کرتا تھا' جہاں مناسب کمائی ہو جاتی تھی۔ایک ترقیاتی پروجیکٹ نے اس کا ٹھکانا چھین لیا' تو وہ گھومتے گھماتے گلشن اقبال والے اس ٹھکانے پر آ بیٹھا۔چند روز ہی میں اسے یقین ہو گیا' کہ اس کی کوئی لاٹری لگ گئی ہے۔یہاں ایک دن کی آمدنی (بھیک) پہلے والے ٹھکانے کی ایک ہفتے کی کمائی کے برابر تھی۔یہ جگہ اسے ایسی راس اور پسند آئی کہ وہ یہیں جم کر بیٹھ گیا۔یہ ٹھکانا گلشنِ اقبال میں ڈسکو بیکری کے قریب ہی تھا۔یہاں کی آمدنی کو دیکھتے ہوئے ہی اس نے عائشہ کو گھر بٹھا دیا تھا۔یہ اڈا اس کے لیے کسی ٹکسال' منٹ فیکٹری یا سکیورٹی پرنٹنگ پریس سے کم نہیں تھا۔گزشتہ سال' ڈیڑھ سال سے وہ یہیں بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے سمیٹ رہا تھا۔

وقت اور حالات ہمیشہ ایک جیسے نہیں رہتے۔قاسم کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی واقعہ پیش آیا تھا۔چند روز قبل جب وہ ایک صبح اپنے ٹھکانے پر پہنچا تو...... وہاں ایک اور بھکاری کو براجمان پایا۔یہ اس کے لیے بڑی تشویش کی بات تھی۔پتا نہیں' وہ کون تھا' اور کہاں سے آیا تھا' جس نے اس کے اڈے پر قبضہ جما لیا تھا۔

قاسم نے بھکاریوں کے مخصوص انداز میں اس شخص کا ''انٹرویو'' کر ڈالا' لیکن اس کے متعدد سوالات سننے کے بعد بھی وہ شخص منہ سے کچھ نہیں بولا' تو قاسم کے ذہن میں یہ خیال آیا' کہیں یہ اللہ کا بندہ گونگا تو نہیں؟

اس کے بعد وہ اس سے اشاراتی زبان میں ''مخاطب'' ہوا' لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔گداگری کے پیشے میں قاسم کو دنیا اور دنیا والوں کو پرکھنے کا اچھا خاصا تجربہ حاصل ہو چکا تھا۔اسے یہ اندازہ قائم کرنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی کہ مذکورہ شخص نہ تو گونگا ہے' نہ ہی پیشہ ور بھکاری۔اس نے کسی خاص مقصد کی خاطر بھکاریوں والا بھیس بدلا تھا۔یوں محسوس ہوتا تھا' جیسے وہ کسی خاص مشن پر ہے۔

اس خیال نے قاسم کے اندر تجسس کو بیدار کر دیا۔یہ جاننے کا تجسس کہ وہ بندۂ خدا آخر کون ہے؟ کہاں سے آیا تھا؟ اور کیوں آیا تھا؟ ویسے قاسم نے بہ خوبی یہ اندازہ قائم کر لیا تھا کہ اسے ''بھیک'' سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔اس کی پہلی ترجیح یہ تھی کہ وہ وہاں پر جم

کر بیٹھا رہے۔

قاسم شروع میں اس پر خاصا گرجا برسا' لیکن اس گرج برس کا نووارد پر ذرا اثر نہ ہوا۔ لہٰذا قاسم اس کے ساتھ مزید سختی سے باز رہا' اور بادل نخواستہ اس نے نووارد سے کچھ فاصلے پر بیٹھ کر بھیک مانگنا شروع کر دی۔ ایک دو روز ہی میں اسے اندازہ ہو گیا کہ سونے کی کان پر کسی اور کا قبضہ ہو گیا ہے۔

علاقہ وہی تھا' مقام وہی تھا' اس کی شکل صورت اور بھیک مانگنے کا انداز بھی وہی تھا' لیکن بھیک دینے والوں کی نگاہیں بدل گئی تھیں۔ اب جیسے قاسم انہیں وہاں بیٹھا دکھائی ہی نہیں دیتا تھا۔ جو بھی راہ گیر اپنی جیب میں ہاتھ ڈالتا' اس کا رخ نووارد کی جانب ہو جاتا۔ چندفٹ کے فاصلے نے قاسم کو آسمان سے زمین پر لا پٹخا تھا۔ اس کی آمدنی کا گراف بہت تیزی سے نیچے آنے لگا' جب کہ چندفٹ کے فاصلے پر موجود نووارد بھکاری پر گویا ہن برس رہا تھا۔ قاسم کی سمجھ میں آ گیا کہ زمین کے ایک ایک انچ حصے کی اپنی منفرد اور الگ اہمیت ہے۔ وہ مقام جہاں وہ پہلے بیٹھا کرتا تھا' اور جہاں پر اب کسی اور عجیب وغریب بھکاری کا قبضہ ہو گیا تھا' گداگری کے پیشے کے لیے بڑا ہی لکی مقام تھا۔

مالی نقصان تو ہو رہا تھا' اس کے ساتھ ہی قاسم کو اپنی بے توقیری اور ذلت کا بھی احساس مارے جا رہا تھا۔ اس کے سامنے کا بھکاری بڑی خوشی سے اس کے پیٹ پر لات مار رہا تھا۔ اسے آئے ہوئے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے تھے' اور اس نے آتے ہی گویا میلہ لوٹ لیا تھا۔

کئی مرتبہ قاسم کے جی میں آئی کہ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کی ایسی دھنائی کرے کہ نانی دادی اس کے خواب میں چکراتی نظر آئیں' لیکن اس نے خود کو قابو میں رکھا' اور کوئی سنگین قدم اٹھانے سے گریز کیا۔ البتہ وہ انسانی فطرت کے ہاتھوں مجبور تھا۔ موجودہ واہیات صورت حال میں غصہ آنا' اور چڑچڑانا ایک عام سی بات تھی۔ وہ نووارد بھکاری کو دیکھ دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتا' اور پیچ وتاب کھاتا رہتا تھا۔ اس چند روزہ عرصے کے دوران' نہ چاہتے ہوئے بھی قاسم کی اس بھکاری سے دو تین جھڑپیں ہو گئیں' اور ایک مرتبہ تو نوبت دست وگریبان ہونے تک بھی جا پہنچی تھی۔ آس پاس کے دکانداروں کو بیچ بچاؤ کے



لیے مداخلت کرنا پڑی۔ وہ لوگ دونوں گداگروں کے درمیان پروان چڑھنے والی چپقلش سے اچھی طرح واقف تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ قاسم اپنا اڈا چھن جانے اور آمدنی کم ہو جانے کے سبب سخت برہم اور پریشان ہے۔ لیکن ظاہر ہے' اس علاقے میں رہنے والے اور وہاں کے دکانداران بھکاریوں کے معاملات میں کچھ نہیں بول سکتے تھے' لہٰذا انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا تھا۔

قاسم کی ہمیشہ سے یہ عادت رہی تھی' کہ وہ صبح ٹھیک ٹھاک ناشتہ کر کے گھر سے نکلتا تھا' اور لگ بھگ دس بجے وہ اپنے ٹھکانے پر پہنچ جاتا۔ اس کا ماننا یہ تھا کہ انسان کو خالی پیٹ گھر سے نہیں نکلنا چاہیے' ورنہ باہر بھی ہر جگہ انکار ہی سننے کو ملتا ہے۔ وہ لنچ اپنے اڈے پر ہی کیا کرتا تھا' اور کم وبیش رات دس بجے تک وہ اپنی گداگرانہ ''ذمہ داری'' نبھاتا۔ رات کا کھانا وہ گھر آ کر اپنی فیملی کے ساتھ کھاتا تھا۔

بنے ہوئے گونگے بہرے نووارد گداگر کی ٹائمنگ قاسم کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ وہ جب صبح اڈے پر پہنچتا تو مذکورہ گداگر پہلے سے وہاں موجود ہوتا' اور جب وہ رات کو رخصت ہونے لگتا' تو بھی اسے وہیں جما ہوا پاتا۔ پتا نہیں' وہ صبح کتنے بجے وہاں آ کر بیٹھ جاتا تھا' اور رات کو کب وہاں سے ٹلتا تھا...... یا یہ کہ وہ رات کو بھی وہیں پڑ کر سو رہتا تھا۔

قاسم اس بے ہودہ صورت حال سے نمٹنے کے لیے کوئی ترکیب سوچ ہی رہا تھا' کہ ایک روز سب کچھ ختم ہو گیا۔ بارہ مئی کی صبح وہ حسبِ معمول ''تیار'' ہو کر اڈے پر پہنچا' تو وہاں بہت سے لوگوں کو ایک ٹولی کی شکل میں جمع دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا۔ ان میں دو تین باوردی پولیس والے بھی تھے۔ پولیس کی وہاں موجودگی تشویشناک بات تھی۔ وہ سب لوگ اس مقام کو گھیرے میں لیے کھڑے تھے' جہاں قاسم کا رقیب بیٹھ کر بھیک مانگا کرتا تھا۔ وہ تیز قدموں سے اسی سمت بڑھنے لگا تا کہ حقیقت کا اندازہ لگا سکے۔

اسی لمحے کسی کی اس پر نظر پڑ گئی' اور وہ شخص چلا کر بولا۔

''وہ...... وہ آ گیا قاسم!''

اس نشان دہی پر سب لوگوں کی گردنیں قاسم کی جانب مڑ گئیں' پھر اس سے پہلے کہ قاسم کچھ سمجھ پاتا' پولیس والے میکانکی انداز میں متحرک ہوئے' اور انہوں نے قاسم کو قابو کر

کے اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی۔

قاسم کو نووارد بھکاری کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا۔



عائشہ چودہ مئی کی سہ پہر میرے پاس آئی تھی' اور اس کے مطابق پولیس نے بارہ مئی کی صبح قاسم کو فرید کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا تھا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ پولیس نے اگلے روز اسے عدالت میں پیش کر کے اس کا ریمانڈ حاصل کر لیا ہوگا' اور اس وقت وہ پولیس کسٹڈی میں ہوگا۔

اسی حوالے سے میں نے عائشہ سے پوچھا۔ ''تمہارے شوہر کی گرفتاری کو دو دن گزر گئے ہیں۔

اس دوران میں تم نے اس کے لیے کیا کیا؟''

وہ جزبز ہوتے ہوئے بولی۔ ''جناب! کسی وکیل سے رابطہ کرنے کا خیال تو مجھے بہت بعد میں آیا ہے۔ پہلے تو میں دوسری نوعیت کی کوششیں کر رہی تھی۔''

''مثلاً دوسری نوعیت کی کون سی کوششیں؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''جب مجھے پتا چلا کہ قاسم کو پولیس نے گرفتار کیا ہے' تو میں سیدھی تھانے پہنچ گئی۔ اس وقت تک رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا' اور تھانہ انچارج تھانے میں موجود تھا۔ میری ظاہری حالت کو دیکھتے ہوئے پہلے تو مجھے تھانے کے اندر داخل ہونے سے روکا گیا۔ جب میں نے ان لوگوں کو بتایا کہ میں اپنے شوہر قاسم کے سلسلے میں تھانے دار صاحب سے ملنا چاہتی ہوں' تو انہیں مجھ پر ترس آ گیا۔ یہ کہہ کر مجھے آگے بڑھنے کی اجازت دی گئی کہ بے چاری فقیرنی ہے۔ یہ بھی رانجھا راضی کر لے!'' وہ سانس لینے کے لیے کچھ دیر رکی' پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں اضافہ کرتے ہوئے بولی۔ ''میں جا کر تھانے دار سے ملی' اور ہاتھ جوڑ کر اس سے عرض کی کہ میرا قاسم قاتل نہیں ہوسکتا۔ آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے' خدا کے لیے اسے چھوڑ دیں۔''

میری منت سماجت پر تھانے دار نے کہا۔ ''پولیس کو کبھی غلط فہمی نہیں ہوتی بی بی!



ہمیں جائے وقوعہ سے ایسے شواہد اور ثبوت ملے ہیں' جو تمہارے شوہر کو قتل کی اس واردات میں ملوث ظاہر کرتے ہیں۔ اس کا چھٹنا بہت مشکل ہے۔ تمہیں اب اس کی رہائی کے لیے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا ہوگا۔''

''میں کبھی قانونی بکھیڑوں میں نہیں پڑی تھی' اور نہ ہی ماضی میں کبھی کسی عدالت سے واسطہ پڑا تھا' لہٰذا تھانے دار کی سخت باتیں میری سمجھ میں نہ بیٹھ سکیں۔ ہاں! البتہ میں اتنا ضرور جانتی تھی کہ قاسم نے اس منحوس گدا گر کو قتل نہیں کیا تھا۔ میں قاسم کی رگ رگ سے واقف تھی۔ وہ ایسا سنگین قدم اٹھانے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ مجھے نئے بھکاری کے بارے میں ہر رات بتایا کرتا تھا۔ میں نے واضح طور پر محسوس کیا تھا' کہ وہ اس کی آمد سے خاصا پریشان اور الجھن زدہ تھا' اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اس بھکاری کے آنے کے بعد قاسم کی آمدنی آدھی سے بھی کم ہوگئی تھی' اور واقعی...... یہ ایک پریشان کن بات تھی۔''

وہ ایک مرتبہ پھر سانس ہموار کرنے کے لیے رکی پھر بولی۔ ''میری منت سماجت کا تھانے دار پر کوئی اثر نہ ہوا بہر حال' اس نے اتنی مہربانی کی کہ مجھے قاسم سے ملنے کی اجازت دے دی۔ میں نے لگ بھگ آدھا گھنٹہ قاسم سے ملاقات کی' اور اس سے جو بھی معلومات حاصل ہوئیں' وہ میں آپ کو بتا چکی ہوں۔

''قاسم نے مجھے بتایا کہ وہ کسی بھی طور پر بھکاری کے قتل میں ملوث نہیں۔ وہ گیارہ مئی کی رات لگ بھگ دس بجے اسے صحیح سالم اڈے پر بیٹھا چھوڑ کر گیا تھا' پھر اگلی صبح یعنی بارہ مئی کو جب وہ وہاں پہنچا' تو مذکورہ بھکاری موت کی آغوش میں جا چکا تھا۔ وہ اس کی موت یا قتل کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ میں نے جب قاسم کو تھانے دار سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا' تو وہ حیرت کا اظہار کرتے ہوئے بولا کہ پتا نہیں پولیس کو جائے وقوعہ سے میرے خلاف کون سے ثبوت اور شواہد ملے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے تو ایسی کوئی بات نہیں کی۔ مجھ سے تو وہ بار بار یہی پوچھتے ہیں کہ کیا میں بھی مقتول کی طرح لاوارث ہی ہوں؟''

''پھر تم نے انہیں کیا بتایا؟'' میں نے جلدی سے پوچھا۔

قاسم نے جواب دیا۔ "ظاہر ہے' میں نے انہیں تمہارے اور اپنے بچوں کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔
شاید تم انہی کی اطلاع پر یہاں پہنچی ہو۔"

"ہاں' بالکل یہی بات ہے۔" میں نے اثبات میں گردن ہلائی' پھر قاسم سے پوچھا۔ "تم سے انہوں نے کوئی خاص بات کی ہے؟"

وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "تھانے دار نے تو مجھ سے کوئی بات نہیں کی' البتہ دیگر ایک دو افراد نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ میں شرافت سے اس قتل کا اقرار کر لوں۔ میری اس فرماں برداری کو دیکھتے ہوئے وہ لوگ چالان میں کوئی ہلکی دفعہ لگائیں گے' لہٰذا عدالت مجھے خاصی نرم سزا سنائے گی۔ بہ صورت دیگر یہ لوگ مجھے کل صبح عدالت میں پیش کر کے ریمانڈ حاصل کر لیں گے...... پھر میری خیر نہیں۔" قاسم نے ایک جھرجھری لی اور خاموش ہو گیا۔

"جب تم نے قتل کیا ہی نہیں' تو پھر یہ لوگ تمہیں ڈرانے دھمکانے والی باتیں کیوں کر رہے ہیں؟" میں نے تشویش بھرے انداز میں کہا۔

وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے بولا۔ "وہ کہہ رہے تھے' ریمانڈ کی مدت کے دوران میں تو پتھر بھی بولنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ تمہیں اقبالِ جرم کرتے ہوئے ایک لمحہ نہیں لگے گا۔"

میں نے محسوس کیا کہ قاسم اس واقعہ اور گرفتاری کے بعد بے حد خوف زدہ ہو گیا تھا۔ اوپر سے پولیس کا دھمکی دار رویہ اسے اور زیادہ دہشت زدہ کر رہا تھا۔ میں نے اس سے تسلی دلاسے کی باتیں کیں' اور حوالات سے باہر تک لے گیا تھا' وہ اس دوران کئی مرتبہ ٹوک چکا تھا کہ میں جلدی سے بات ختم کروں' ورنہ انچارج صاحب ناراض ہوں گے۔ میں دکھی دل کے ساتھ واپسی کے لیے مڑی ہی تھی' کہ مذکورہ کانسٹیبل نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "چوہان صاحب سے مل لو۔ وہ تمہارا مسئلہ حل کر سکتے ہیں۔"

میں اس کے پیچھے چل پڑی۔ اس نے بڑی چونکا دینے والی بات کی تھی۔ کوئی چوہان صاحب میرا مسئلہ حل کر سکتے تھے' یہ میرے لیے دلچسپی کی بات تھی۔ اس وقت میرا سب سے بڑا اور اہم مسئلہ قاسم کی رہائی تھا۔ میں نے اسی سلسلے میں تھانے دار کی بھی منت



خوشامد کی تھی' لیکن وہ قاسم کے معاملے میں کوئی نرمی یا لچک دکھانے کو تیار نہیں تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا' کہ کوئی چوہان صاحب تھانے دار کی مرضی کے خلاف میرا مسئلہ کیسے حل کر سکتا تھا۔ بہر حال' جب تک سانس' تب تک آس کے مصداق میں کانسٹیبل کی تقلید میں چوہان صاحب کے پاس پہنچ گئی۔ بعد میں مجھے پتا چلا کہ اس شخص کا پورا نام دلاور چوہان تھا' اور وہ اسی تھانے میں بطور اسسٹنٹ سب انسپکٹر کام کر رہا تھا۔ کانسٹیبل مجھے اے ایس آئی چوہان کے پاس چھوڑ کر واپس چلا گیا۔

چوہان صاحب نے مجھے بیٹھنے کو کہا۔ میں بیٹھ چکی' تو وہ سرتاپا میرا تنقیدی جائزہ لینے کے بعد بولا۔ "خاصی پریشان نظر آ رہی ہو۔"

"ظاہر ہے' بات ہی پریشانی کی ہے۔" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "آپ لوگوں نے میرے شوہر کو ایک ناکردہ جرم کے الزام میں بند کر رکھا ہے۔"

"تم اس وقت کردہ اور ناکردہ جرم کے چکر میں نہ پڑو تو تمہارے لیے اچھا ہو گا۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

"صرف ذہن میں یہ بات رکھو کہ تمہارا شوہر بہت بری طرح قانون کے شکنجے میں پھنس چکا ہے۔ اس کا بچنا بہت مشکل ہے۔"

"حالات تو ایسے ہی نظر آ رہے ہیں۔" میں نے متذبذب انداز میں کہا۔ "لیکن......"

میرے ادھورے سوالیہ جملے پر اے ایس آئی دلاور چوہان نے کہا۔ "لیکن...... کیا؟"

"کانسٹیبل تو یہ کہہ کر مجھے آپ کے پاس لایا ہے کہ آپ میرے مسئلے کو حل کر دیں گے۔" میں نے الجھن زدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ "اور آپ تو ڈرانے والی باتیں کر رہے ہیں۔"

"صورت حالات واقعی ڈرنے اور خوف زدہ ہونے والی ہے۔" وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ "مگر تم چاہو تو سب ٹھیک بھی ہو سکتا ہے۔"

"میں چاہوں تو......" میں نے سوالیہ نظروں سے اے ایس آئی کی جانب

دیکھا۔ ''میں کچھ سمجھی نہیں جناب؟''

وہ بہ دستور معنی خیز نظروں سے مجھے ٹٹولتے ہوئے بولا۔ ''کیا تم یہ نہیں چاہو گی کہ تمہارے شوہر کو اس مصیبت سے چھٹکارا مل جائے؟''

''کیوں نہیں ...... میں یہی چاہتی ہوں۔'' میں نے جلدی کہا۔

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں اس سلسلے میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں' اگر تم مجھ سے تعاون کے لیے تیار ہو جاؤ!''

مجھے اس کی نیت پر شک ہونے لگا۔ میں نے نگاہ چراتے ہوئے اضطراری لہجے میں کہا۔ ''لیکن تھانے دار صاحب تو دوٹوک الفاظ میں کہہ چکے ہیں ...... کچھ نہیں ہو سکتا۔''

''میں اگر کوشش کروں گا' تو بہت کچھ ہو جائے گا۔'' وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ''بہ شرطیکہ تم مجھ سے بھرپور تعاون پر آمادہ ہو جاؤ۔''

میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

'آپ مجھ سے کس قسم کا تعاون چاہتے ہیں جناب!؟''

اس نے میرے من کے خدشات کے برعکس استفسار کیا۔ ''کچھ رقم کا بندوبست کر سکتی ہو تم؟''

''پچاس ہزار روپے۔'' اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

''پچاس ہزار!'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''یہ تو بہت بڑی رقم ہے۔''

''تمہارے لیے بڑی نہیں ہے۔'' وہ بہ دستور میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

میں نے خوشامدی لہجے میں کہا۔ ''جناب! ہم بہت غریب لوگ ہیں۔ بھیک مانگ کر اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتے ہیں ...... کوئی دو چار ہزار روپے کی بات ہو تو ......''

''میں اچھی طرح جان چکا ہوں' تم لوگ کتنے غریب ہو!'' وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''میں نے بہت کم وقت میں تمہارے شوہر پر اچھی خاصی تحقیق کر ڈالی ہے' اور میں جانتا ہوں کہ اگر تم کوشش کرو تو کل کا سورج طلوع ہونے سے پہلے مذکورہ رقم کا بندوبست بہ آسانی کر سکتی ہو!''

وہ رشوت خور پولیس والا غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ اتنی رقم تو ہمارے گھر میں محفوظ رکھی تھی'



لیکن میں نے اس کے انکشاف کے جواب میں خود کو پریشان ظاہر کرتے ہوئے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ''جناب! پچاس ہزار روپے کوئی معمولی رقم ہے۔ آپ ہم غریب بھکاریوں پر رحم کریں۔ یقین جانیں ...... میں اتنی بڑی رقم ......''

''ٹھیک ہے' تمہاری مرضی۔'' وہ رُکھائی سے بولا۔

''میں تو تمہارا اور تمہارے شوہر کا بھلا سوچ رہا تھا۔ تمہیں اگر اس معاملے سے کوئی دلچسپی نہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔''

مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے روشنی کی کوئی کرن چمکنے سے پہلے ہی بجھنے والی ہے۔ ایک فوری خیال کے تحت میں نے اے ایس آئی چوہان سے کہا۔ ''فرض کریں' اگر کسی طرح قرض ادھار کر کے میں آپ کی مطلوبہ رقم حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں' تو کیا تھانے دار صاحب اس کام کے لیے تیار ہو جائیں گے؟''

''انچارج صاحب کو راضی کرنا میری ذمے داری ہے۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

''میرے ماموں انچارج صاحب کے بڑے افسر ہیں۔ وہ میری بات ٹال نہیں سکتے ...... اور میں بھی یہ بات ابھی کہہ رہا ہوں' کیونکہ ابھی تک تمہارے شوہر کا معاملہ تھانے کی سطح پر ہے۔ اگر ایک مرتبہ اسے عدالت میں پیش کر کے ریمانڈ حاصل کر لیا گیا' تو پھر کچھ نہیں ہو سکے گا۔ یہاں تھانے میں اس کا وہ حشر ہو گا کہ یہ پچاس ہزار روپے تمہیں صرف پچاس روپے محسوس ہوں گے' اور ہاں ......'' وہ لمحے بھر کو رکا اور ...... پھر اٹل لہجے میں بولا۔ ''میری یہ پیش کش کل صبح تک کے لیے ہے۔ اس کے بعد میں بھی کچھ نہیں کر سکوں گا۔ تمہیں کل سورج طلوع ہونے سے پہلے کسی فیصلے تک پہنچنا ہو گا۔''

عائشہ نے مجھے بتایا کہ وہ چوہان کی بات سن کر مخمصے میں پڑ گئی۔ اس کی سمجھ میں فوری طور پر یہی آ رہا تھا' کہ اسے اے ایس آئی کی تجویز نما پیش کش کو فوراً قبول کر لینا چاہیے۔ اگر قاسم اس مصیبت سے نکل آتا تو دولت دوبارہ کمائی جا سکتی تھی۔ اس نے اے ایس آئی سے درخواست کی کہ وہ اپنے شوہر سے اس سلسلے میں بات کرنا چاہتی ہے۔

اے ایس آئی نے ایک لمحہ سوچا' اور گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''پانچ منٹ کا مطلب پانچ منٹ ہی ہے۔ میں اس سے زیادہ وقت نہیں دوں گا۔''

عائشہ دوبارہ حوالات میں قاسم کے پاس پہنچ گئی۔اس مرتبہ کوئی نگران کانسٹیبل اس کے ہمراہ نہیں تھا۔اس نے مختصر الفاظ میں قاسم کو تازہ ترین صورت حال کے بارے میں بتایا۔پوری بات سننے کے بعد اس نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔''لیکن عائشہ!ہم نے دن رات کی محنت سے اب تک جو کچھ بھی جمع کیا ہے'وہ ہماری اولاد کے روشن اور خوش حال مستقبل کے لیے ہے۔میں کبھی اس بات کے لیے تیار نہیں ہوں گا کہ تم اتنی بڑی رقم مجھے چھڑانے کے لیے رشوت میں دے دو۔''

''اگر تم باہر آ جاؤ گے تو رقم دوبارہ کما لو گے!''عائشہ نے دلیل دی۔

قاسم نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔''تم ان پولیس والوں کو نہیں جانتی۔اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ یہ لوگ رقم حاصل کرنے کے بعد مجھے واقعی چھوڑ دیں گے؟''

''گارنٹی!''عائشہ الجھن زدہ نظروں سے اپنے شوہر کو دیکھنے لگی۔

''میری مانو تو جلد بازی سے کام نہ لو۔''قاسم نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔''ان لوگوں کو اپنا کام کرنے دو۔میرا ضمیر مطمئن ہے۔میں جانتا ہوں'اور میرا خدا جانتا ہے کہ میں نے فرید کو قتل نہیں کیا۔کل یہ لوگ مجھے عدالت میں پیش کر کے ریمانڈ حاصل کریں گے۔اس کے بعد میں ہفتے بھر کے لیے ان کے رحم وکرم پر ہوں گا۔یہ تفتیش کے نام پر پتا نہیں میرے ساتھ کیا کیا سلوک کریں گے۔اگر تم نے ابتدا ہی میں پچاس ہزار نکال کر ان کی ہتھیلی پر رکھ دیئے تو ان کے مطالبات کے لیے ایک راہ کھل جائے گی۔ان کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا عائشہ!اور ان کے کسی وعدے پر یقین کرنا سخت حماقت ہو گی۔''

''تو......تو پھر میں کیا کروں؟''عائشہ نے متذبذب انداز میں کہا۔

''انتظار......اور صبر!''قاسم مضبوط لہجے میں بولا۔

''میں بے گناہ ہوں'اس لیے مجھے سزا نہیں ہو سکتی'یہ میرا یقین اور ایمان ہے۔پولیس والوں کی مٹھی گرم کر کے پیسہ برباد کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔اگر ضرورت محسوس ہوئی تو تم بعد میں میرے لیے کوئی اچھا سا وکیل کر لینا۔باقی اللہ مالک ہے۔''

یہ بات عائشہ کی سمجھ میں آ گئی۔واقعی!پولیس والوں کو رقم تھما دینا سنگین ترین غلطی



ہوتی۔وہ یہی رقم کیس لڑنے کے لیے خرچ کر سکتی تھی۔وہ ذہن میں ایک خاص سوچ لے کر وہاں سے واپس آ گئی۔

واپسی پر اے ایس آئی نے اس سے استفسار کیا۔

''بات ہو گئی؟''

''ہاں'ہو گئی!''اس نے مختصر سا جواب دیا۔

''پھر تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟''اس نے پوچھا۔

''کل کا سورج طلوع ہونے سے پہلے میں آپ کو بتا دوں گی۔''عائشہ نے مبہم سا جواب دیا'اور تھانے سے باہر نکل آئی۔

تیرہ مئی کی صبح پولیس نے ملزم قاسم کو عدالت میں پیش کر کے اس کا سات یوم کا ریمانڈ حاصل کر لیا۔عائشہ نے اے ایس آئی چوہان سے ''رابطہ'' کرنے کے بجائے کسی اچھے وکیل کی تلاش شروع کر دی ہے۔اس سلسلے میں اسے میرے آفس کا ایڈریس سمجھا دیا'اور اس وقت وہ میرے سامنے بیٹھی اپنی دکھ بھری روداد مجھے سنا رہی تھی۔



میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔

''ایک بات ماننا پڑے گی'تمہارا شوہر ایک عقل مند اور تجربہ کار انسان ہے۔اس نے پولیس کے حوالے سے تمہیں بالکل درست مشورہ دیا تھا۔اگر تم پچاس ہزار روپے اے ایس آئی کے حوالے کر دیتیں تو رقم بھی جاتی'اور اس بات کی واقعی کوئی گارنٹی نہیں تھی کہ وہ قاسم کو چھوڑ دیتے۔''

''وکیل صاحب!میں آپ کی فیس ایڈوانس دینے کو تیار ہوں۔''وہ جذباتی لہجے میں بولی۔

''آپ قاسم کا کیس فوراً اپنے ہاتھ میں لے لیں۔''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''فیس تو میں ایڈوانس ہی لیتا ہوں'اور تم سے لوں گا بھی پوری فیس'کیونکہ تم اس کی استطاعت رکھتی ہو۔البتہ میری پوری کوشش ہو گی کہ دیگر عدالتی اخراجات سے تم لوگوں کو

بچا لوں ۔تمہارے جتنے پیسے بھی بچیں گے' وہ تمہاری اولاد کے بہتر مستقبل کے لیے کام آئیں گے۔''

وہ ایک دم خوش ہو گئی۔ ''بہت بہت شکریہ وکیل صاحب!''

میں نے فیس کی رقم وصول کر کے اسے ایک رسید بنا دی' تاہم اس لمحے میں نے سوچ لیا تھا کہ کیس کے اختتام پر میں اسے اس عزم کے صلے میں ایک شاندار تحفہ دوں گا' جو ان لوگوں نے اپنی اولاد کے مستقبل کے ذیل میں باندھ رکھا تھا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔گداگری ایک ایسا پیشہ ہے کہ جسے ترک کرنا ناممکن کی حد تک مشکل ہے۔ان لوگوں نے ایک انقلابی فیصلہ کیا تھا' جسے سراہنا مجھ پر فرض تھا...... مجھے یہ فرض ہر حال میں ادا کرنا تھا۔

میں نے عائشہ سے کہا۔

''اگر چہ تم نے اس کیس کے پس منظر کو بڑی تفصیل سے مجھ تک پہنچایا ہے' لیکن پھر بھی اس کے بعض گوشے ابھی تک تشنہ اور ڈھکے ہوئے ہیں۔اس کے لیے مجھے پہلی فرصت میں تمہارے شوہر قاسم سے ملنا ہو گا۔''

''ٹھیک ہے وکیل صاحب! آپ تھانے جا کر قاسم سے ضرور ملیں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی پھر پوچھا۔

''ویسے آپ کے خیال میں اس کیس کا کون سا پہلو الجھا ہوا ہے؟''

میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''سب سے اہم معاملہ تو اس اجنبی پراسرار مقتول بھکاری ہی کا ہے۔وہ کون تھا' کہاں سے آیا تھا اور قاسم کی جگہ پر کیوں جم کر بیٹھ گیا تھا؟ قاسم نے تمہیں جو کچھ بتایا ہے اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کسی خاص مشن پر وہاں آیا تھا۔اس ''مشن'' کی تحقیق کرنا بھی ضروری ہے۔میرا خیال ہے' اس سلسلے میں قاسم سے بہت کچھ معلوم کیا جا سکتا ہے۔''

''میرا خیال ایسا نہیں ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

''اگر قاسم کو مقتول بھکاری کے عزائم کے بارے میں کچھ پتا ہوتا' تو وہ مجھے ضرور



بتاتا...... بہر حال' آپ اس سے ملاقات کر کے دیکھ لیں۔''

''ہوں!'' میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھا۔

''تم نے بتایا ہے کہ وقوعہ کے اگلے روز مقتول کے نام کے بارے میں پتا چل گیا تھا۔تمہارے مطابق' اس شخص کا نام فرید تھا۔میں یہ جاننا چاہوں گا کہ اس کے نام کے بارے میں کیسے پتا چلا؟''

''یہ بات مجھے کل ہی معلوم ہوئی ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔''پولیس کو اس کے لباس میں سے کچھ ایسے کاغذات ملے ہیں' جن سے اس کے نام کی شناخت ہوئی ہے۔''

''اوہ! تو یہ بات ہے۔'' میں نے بے ساختہ کہا۔''اس کا مطلب ہے' پولیس والوں کو بھی گھسنا پڑے گا۔''

''وکیل صاحب! اس مہم میں اگر آپ کو کہیں میری مدد کی ضرورت پیش آئی' تو میں حاضر ہوں۔'' عائشہ نے جذباتی لہجے میں کہا۔''میری خواہش ہے کہ قاسم جلد از جلد اس مصیبت سے نکل آئے۔''

''ہر سمجھدار اور محبت کرنے والا اپنے رفیقِ حیات کے بارے میں اسی انداز سے سوچتا ہے۔'' میں نے ستائشی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔''لگتا ہے' تم دونوں میاں بیوی میں بڑی انڈر اسٹینڈنگ...... میرا مطلب ہے' بڑا اتفاق ہے۔''

وہ زیرِ لب مسکرائی اور بولی۔''وکیل صاحب! میں ''انڈر اسٹینڈنگ'' بھی سمجھ گئی تھی۔در اصل بات یہ ہے کہ جب سے میں نے باقاعدہ ٹی وی دیکھنا شروع کیا ہے' بہت سارے انگریزی کے الفاظ بھی سمجھ میں آنے لگے ہیں۔میں آپ کو ایک دلچسپ بات بتاؤں......!'' اتنا کہہ کر وہ پُرخیال انگیز انداز میں خاموش ہوئی' تو میں سوالیہ نظروں سے اس کے چہرے کو تکنے لگا۔میں نہیں جانتا تھا' وہ ایسی کون سی دلچسپ بات مجھے بتانے جا رہی تھی۔چند لمحات کے پُراسرار توقف کے بعد اس نے بولنا شروع کیا۔

''پہلے ہم دونوں میں صبح شام لڑائی جھگڑا ہوتا رہتا تھا۔میں قاسم کی کوئی بات برداشت کرتی تھی' اور نہ ہی اس کے اندر تحمل تھا۔لیکن جب سے ہم نے یہ عزم کیا ہے کہ

ہم......اپنی اولاد کو بھکاری کے پیشے سے نجات دلا کر انہیں اس معاشرے کا باعزت اور مفید فرد بنائیں گے' ہمارے آپس کے اختلافات جیسے کہیں جا کر دفن ہو گئے ہیں۔اب ہم میں بحث وتکرار نہیں ہوتی۔"

"اولاد والدین کے درمیان ایک پُل کی طرح ہوتی ہے۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔"جو انہیں آپس میں جوڑے رکھتی ہے' اور جب اولاد کے مستقبل کے حوالے سے کسی بات پر اتفاق ہو جائے تو یہ پُل اور بھی مضبوط ہو جاتا ہے۔آپ لوگوں کے ساتھ کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔"

"دعا کریں وکیل صاحب!" وہ درخواست گزار لہجے میں بولی۔"اللہ ہمیں اس نیک مقصد میں کامیاب کرے۔"

"آمین!" میں نے تہ دل سے کہا۔"انشاء اللہ! آپ لوگوں کا یہ خواب ضرور پورا ہو گا۔"

"اب میں آپ کے پاس کب آؤں؟" اس نے پوچھا۔

میں نے کہا۔"قاسم اس وقت عدالتی ریمانڈ پر پولیس کسٹڈی میں ہے۔ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد ہی وہ لوگ عدالت میں چالان پیش کریں گے۔اس سے پہلے کوئی عملی چارہ جوئی نہیں ہو سکتی۔البتہ اس دوران میں' میں قاسم سے ملاقات کر لیتا ہوں۔چند ضروری کاغذات پر اس کے دستخط بھی لینا ہیں' اور ممکن ہے کہ کوئی نئی بات بھی سامنے آ جائے۔تم ایسا کرو......" میں لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا' ذرا غور کیا اور قاسم کی بیوی عائشہ سے کہا۔"ہاں ٹھیک ہے' تم پرسوں اسی وقت میرے پاس آ جاؤ۔دیکھتے ہیں' کیا ہوتا ہے۔اور ہاں' تم سے رابطے کا کوئی ذریعہ ہے؟"

اس نے میرے سوال پر بے بسی سے مجھے دیکھا' اور نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔"ہماری جھگی میں تو فون کی سہولت موجود نہیں۔البتہ' ہمارے گھر سے تھوڑے فاصلے پر ایک جنرل اسٹور ہے۔وہاں فون ہے۔کبھی ضرورت پڑنے پر میں وہاں سے کال کر لیتی ہوں' لیکن مجھے نمبر یاد نہیں۔اگر آپ کہیں تو پرسوں یہاں آتے ہوئے میں جنرل اسٹور والے سے وہ نمبر لکھوا لاؤں!"



"ہاں ٹھیک ہے۔" میں نے تائیدی انداز میں کہا۔

"تم وہ نمبر لے آنا' اور جنرل اسٹور والے کو یہ بھی بتا دینا کہ اگر تمہارے لیے کوئی کال آئے تو وہ تمہیں بلانے کی زحمت بھی گوارا کر لے۔"

"اچھی بات ہے۔" اس نے ایک مرتبہ پھر میرا شکریہ ادا کیا' اور سلام کر کے میرے دفتر سے رخصت ہو گئی۔

میں کافی دیر تک عائشہ اور اس کے شوہر قاسم کے بارے میں سوچتا رہا۔مجھے ایک لمحے کے لیے بھی یہ احساس نہ ہوا کہ میں نے بھکاریوں کا کوئی کیس لے لیا ہے۔شاید اس احساس یا عدمِ احساس کا سبب یہ تھا کہ وہ لوگ اپنے آبائی پیشے سے تائب ہو چکے تھے۔ان کا یہ فیصلہ یا اقدام انقلابی حیثیت کا حامل تھا۔



قاسم بھکاری کے معاملے میں میری ذاتی دلچسپی اس قدر بڑھ گئی کہ میں اسی رات دفتر سے اٹھنے کے بعد اس سے ملاقات کے لیے متعلقہ تھانے پہنچ گیا۔ میں اس کی بیوی سے اپنی خدمات کی فیس وصول کر چکا تھا' لہٰذا اصولی طور پر اب وہ میرا مؤکل تھا۔ جب میں اپنی گاڑی تھانے کی باؤنڈری وال کے ساتھ کھڑی کر کے اندر پہنچا' تو مجھے معلوم ہوا کہ انچارج صاحب تھانے میں موجود نہیں ہیں۔

تھانے دار کے کمرے میں ایک سب انسپکٹر بیٹھا تھا۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ''انچارج صاحب کب تک واپس آئیں گے؟''

''وہ جی علاقے کے راؤنڈ پر گئے ہیں۔'' ایس آئی نے رُکھائی سے جواب دیا۔

''کب واپس آئیں' یہ تو ان کی مرضی پر منحصر ہے۔'' پھر وہ ٹٹولتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے مستفسر ہوا۔ ''آپ کو انچارج صاحب سے کیا کام ہے؟''

''میری اطلاعات کے مطابق اس وقت آپ کے تھانے کے حوالات میں قاسم نامی قتل کا ایک ملزم بند ہے۔''

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں چند منٹ کے لیے اس سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔''

''آپ اس بھکاری کی بات کر رہے ہیں؟''

''بالکل...... بالکل وہی!''

''آپ کا اس بھکاری سے کیا تعلق ہے؟'' وہ اضطراری انداز میں پوچھ بیٹھا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ''میں اس کا وکیل ہوں۔''



''پھر تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' بے ساختہ اس کی زبان سے خارج ہوا۔

''کس چیز کا سوال پیدا نہیں ہوتا ایس آئی صاحب؟''

''مم...... میرا مطلب ہے......'' وہ گڑبڑائے ہوئے انداز میں بولا۔ ''انچارج صاحب تھانے میں موجود نہیں' اور ان کی اجازت کے بغیر آپ کسی حوالاتی سے ملاقات نہیں کر سکتے۔''

''تو ٹھیک ہے......'' میں نے ٹیلی فون سیٹ کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''ملاقات سے پہلے اجازت لے لیتا ہوں۔''

وہ بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''آپ کس کو فون کرنا چاہتے ہیں؟''

''ظاہر ہے' میں آپ کے تھانہ انچارج کو تو فون کروں گا نہیں۔''

''پھر...... پھر......؟'' وہ متفکر نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔ ''میرے خیال میں آئی جی صاحب سے ہی این او سی لے لیتے ہیں؟''

''او جناب...... آپ کیوں میری نوکری تیل کرانے کے چکر میں ہیں۔'' اس کی بوکھلاہٹ ساتویں آسمان تک جا پہنچی۔ ''خدا کا خوف کریں جی......''

میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''سب انسپکٹر صاحب! اگر آپ چاہتے ہو کہ آپ کی نوکری تیل نہ ہو' اور ہمیشہ شہد ہی رہے تو مجھے حوالاتی سے چند باتیں کر لینے دیں۔ میں اس کا وکیل ہوں' لہٰذا آپ مجھے اس سے ملاقات کرنے سے نہیں روک سکتے۔ اگر آپ کو اس قانون کا علم نہیں تو میں آئی جی صاحب کی سفارش کرا دیتا ہوں۔ وہ آپ کو بتائیں گے۔''

''بیگ صاحب! اتنا اوپر تک جانے کی کیا ضرورت ہے!'' وہ شرافت کی راہ پر قدم رکھتے ہوئے بولا۔ ''جائیں' حوالات میں اپنے مؤکل سے چند باتیں کر لیں' لیکن اسے جلد ہی فارغ کر دیں تو مہربانی ہو گی' انچارج صاحب کی واپسی سے پہلے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے سرسری انداز میں اس کا شکریہ ادا کیا' اور پھر حوالات کی جانب بڑھ گیا۔

ملزم عدالتی ریمانڈ پر جب پولیس کسٹڈی میں ہوتا ہے' تو اس سے ملاقات کرنا

آسان نہیں ہوتا' یا یوں سمجھیں کہ پولیس خاص مقاصد کی خاطر اس کام کو مشکل سے مشکل تر بنا دیتی ہے' لیکن ایک ہوشیار اور قابل وکیل چٹکی بجاتے میں اس دشوار کام کو اپنے لیے سہل بنا لیتا ہے۔

میں نے حوالات میں قاسم سے ایک مناسب سی ملاقات کی' لیکن کوئی نئی بات سامنے نہ آسکی۔ اس کی بیوی عائشہ مجھے جتنا کچھ بتا چکی تھی' وہ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتا تھا۔ میں نے چند ضروری کاغذات پر بشمول وکالت نامے پر اس کے دستخط لیے' اور تسلی دینے کے بعد وہاں سے نکل آیا۔ قاسم باقاعدہ لکھا پڑھا شخص نہیں تھا' تاہم وہ اپنے نام کے دستخط کرنا جانتا تھا۔ میری تشفی بھری باتوں سے وہ خاصا مطمئن دکھائی دینے لگا تھا۔

واپسی میں ایک مرتبہ پھر سب انسپکٹر سے ملاقات ہوگئی۔ میں نے چھیڑنے والے انداز میں کہا۔ "ایس آئی صاحب! میں نے حوالات میں زیادہ دیر تو نہیں لگا دی؟"

"نہیں جناب...... بس ٹھیک ہے۔" وہ سرسری انداز میں بولا' پھر کریدنے والے لہجے میں پوچھا۔ "کیا ملزم سے کوئی کام کی بات معلوم ہوئی؟"

"کوئی نہیں......" میں نے مایوسی کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ "وہ احمق کچھ بھی نہیں جانتا۔ میں تو یہ محسوس کر رہا ہوں کہ یہ کیس لے کر میں نے ایک سنگین غلطی کی ہے۔"

میں نے جان بوجھ کر ایسا ظاہر کیا تھا کہ اس کیس میں کوئی جان نہیں ہے' تاکہ پولیس خوش فہمی میں مبتلا رہے۔ میری اس ایکٹنگ کے خاطر خواہ اثرات نمودار ہوئے۔ سب انسپکٹر کے چہرے پر ایک خاص قسم کی چمک ابھری' پھر اس نے مشورہ دینے والے دھیمے لہجے میں مجھ سے کہا۔ "بیگ صاحب! اگر آپ واقعی ایسا محسوس کر رہے ہیں' تو اس میں پریشانی والی کون سی بات ہے۔ اس مسئلے کا تو بہت ہی آسان حل ہے۔"

میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "مثلاً...... کیا حل ہے؟"

"آپ اس کیس کو چھوڑ دیں...... ویری سمپل!" وہ سادگی سے بولا۔

"شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو' سب انسپکٹر صاحب!"

پھر چونکنے کی اداکاری کرتے ہوئے میں نے اس سے پوچھ لیا۔ "ایس آئی صاحب! ملزم بتا رہا تھا کہ آپ لوگوں نے اس کے خلاف بڑے مضبوط ثبوت اور شواہد جمع



کر لیے ہیں۔ وہ اچھا خاصا خوف زدہ ہے۔"

"وکیل صاحب! یہ بات تو آپ کو بھی معلوم ہوگی کہ پولیس کبھی کچا ہاتھ نہیں ڈالتی۔" وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

"کیا میں جان سکتا ہوں کہ آپ نے کون سے شواہد اور ثبوت؟"

"آئی ایم ویری سوری وکیل صاحب!" وہ معذرت کرتے ہوئے بولا۔ "آپ وکیلِ صفائی کی حیثیت سے اس کیس میں ہاتھ ڈال چکے ہیں' لہٰذا اس موضوع پر آپ سے کوئی بات نہیں ہوسکتی۔ آپ بہ خوبی سمجھ رہے ہیں کہ میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں؟"

"اٹس او کے!" میں نے مصلحت آمیز لہجے میں کہا۔

"اور...... یہ مقتول کی شناخت کا کیا قصہ ہے؟"

"شناخت...... کیسی شناخت؟" وہ آنکھیں سکیڑ کر مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ "پہلے مقتول کو ایک لاوارث اور نامعلوم بھکاری خیال کیا گیا' پھر پتا چلا کہ اس کا نام فرید ہے۔ کیا اس کے پاس سے کوئی دستاویزی ثبوت برآمد ہوا تھا؟"

میرے سوال کا جواب دینے سے پہلے وہ زیرلب مسکرایا' پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس نے کہا۔ "وکیل صاحب! شاید نہیں...... بلکہ یقیناً آپ کو یہ بات معلوم نہیں کہ میں اس کیس کا انکوائری آفیسر ہوں۔ سب انسپکٹر عبدالسلام!"

"اوہ!" میں نے اس لفظ کو خاصا کھینچ کر ادا کیا' اور مجھے آپ کو سلیوٹ کرنا چاہیے...... آپ نے ملزم سے ملاقات کروا کر خلافِ معمول مجھ پر جو احسان فرمایا ہے' وہ ایک عظیم کارنامہ ہے آپ کا۔ میرا خیال ہے' اب آپ میرے کسی سوال کا جواب نہیں دیں گے۔"

"آپ کا یہ خیال ایک سو ایک فیصد درست ہے۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ "آپ خاصے عقل مند وکیل ہیں۔"

اس کے آخری جملے میں چھپے ہوئے طنز کو میں نے واضح طور پر محسوس کر لیا' اور جواباً حساب برابر کرتے ہوئے کہا۔ "تعریف کا بے حد شکریہ آئی او صاحب! اس کا مطلب

ہے' میں نے یہ کیس لینے میں کوئی غلطی نہیں کی......ہوں؟''

''آپ کے اس سوال کا جواب میں عدالت میں جا کر دوں گا۔''

''تو ٹھیک ہے۔'' میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔'' آپ سے اب عدالت ہی میں ملاقات ہو گی' سب انسپکٹر عبدالسلام صاحب!''

وہ مجھے سرد نگاہ سے گھور کر رہ گیا۔

میں تیز قدموں سے چلتے ہوئے تھانے سے باہر نکل آیا۔ باؤنڈری وال کے ساتھ ہی میری گاڑی کھڑی تھی۔ جب میں گاڑی میں بیٹھنے لگا' تو تھانے کے گیٹ پر ایک شناسا چہرے کو دیکھ کر چونک اٹھا۔ وہ شخص پولیس کی وردی میں تھا' اور عہدے کے اعتبار سے کانسٹیبل تھا۔ وہ اس وقت تھانے میں داخل ہو رہا تھا۔ اغلب امکان اسی بات کا تھا' کہ اس کا تعلق مذکورہ تھانے سے رہا ہو گا۔ اس شخص نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ ہماری نگاہیں چار ہوئیں تو وہ مسکرایا اور سر کی مخصوص جنبش سے مجھے سلام کیا۔ مجھے فوری طور پر یاد نہ آ سکا کہ میں نے اس کانسٹیبل کو پہلے کب اور کہاں دیکھا تھا۔ میں نے سرسری انداز میں اس کے سلام کا جواب دیا' اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔

ڈرائیونگ کے دوران بار بار اس کانسٹیبل کا چہرہ میرے تصور میں ابھرتا' اور میں اپنی یادداشت میں سے اسے کھوج نکالنے کی کوشش میں مصروف ہو جاتا۔ اس عمل کا بڑا مثبت نتیجہ برآمد ہوا' اور گھر پہنچنے سے پہلے ہی مجھے یاد آ گیا کہ وہ کانسٹیبل مجھے جانا پہچانا سا کیوں لگا تھا۔

چند سال پہلے میں نے علی نواز نامی ایک شخص کا کیس لڑا تھا۔ علی نواز کسی ٹیکسٹائل ملز میں کام کرتا تھا۔ مل کے مالک نے اسے دھاگا چوری کرنے کے الزام میں پولیس کے حوالے کیا تھا۔ در اصل علی نواز کے ساتھ کام کرنے والے ایک شخص نے گہری سازش کے ذریعے اسے فیکٹری سے نکلوانے کی کوشش کی تھی۔ علی نواز بے قصور تھا۔ یہ کیس ایک معروف بزنس مین امتیاز خان کے توسط سے مجھ تک پہنچا تھا' اور صرف تین پیشیوں میں یہ کیس میں نے جیت لیا تھا۔ اس دوران علی نواز کے چھوٹے بھائی حق نواز سے بھی میری ملاقات ہوتی رہی' جو محکمہ پولیس سے وابستہ تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد آ گیا' کہ تھوڑی دیر



پہلے تھانے کے گیٹ پر جس کانسٹیبل نے مجھے سلام کیا تھا' وہ حق نواز ہی تھا۔

میرے پاس حق نواز یا علی نواز کا کوئی رابطہ نمبر نہیں تھا' البتہ امتیاز خان کے ذریعے میں ان سے رابطہ کر سکتا تھا۔ حق نواز کو دیکھ کر میرے ذہن میں ایک اسکیم آئی تھی' اگر وہ اسی تھانے میں ڈیوٹی کر رہا تھا' تو میں اس کے ذریعے خاصی مفید معلومات حاصل کر سکتا تھا۔ اپنے بھائی کے کیس کے حوالے وہ میرا بے حد شکر گزار تھا۔ مجھے امید تھی' وہ میری بات سے انکار نہیں کرے گا۔

رات کے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد' میں نے امتیاز خان کو فون کیا۔ اس نے فوراً میری آواز پہچان لی اور دوستانہ لہجے میں بولا۔'' بیگ صاحب! کیسے ہیں آپ؟''

''اللہ کا شکر ہے خان صاحب!'' میں نے جواب دیا۔

''آپ سنائیں؟''

''میں بھی ٹھیک ٹھاک ہوں!'' امتیاز خان نے پھر کہا۔

''آپ نے خیریت سے یاد کیا ہے نا بیگ صاحب؟''

میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے حق نواز اور علی نواز کے بارے میں یاد دلایا اور کہا۔'' خان صاحب! کیا آپ کے پاس ان بھائیوں کا کوئی رابطہ نمبر ہے؟''

''آپ مجھے ایک دن کی مہلت دے دیں بیگ صاحب؟'' امتیاز خان کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''مجھے اس سلسلے میں تھوڑی چھان بین کرنی پڑے گی۔''

''کیسی چھان بین خان صاحب؟'' میں نے پوچھ لیا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔'' بیگ صاحب! بات در اصل یہ ہے کہ میں ان دونوں بھائیوں کو براہ راست نہیں جانتا۔ میرے سپروائزر قمر علی کی علی نواز سے گہری دوستی تھی' اور اسی نے مجھ سے علی نواز کی مدد کرنے کی درخواست کی تھی۔ میں نے یہ کیس آپ کے حوالے کر دیا' اور جتنی ممکن ہو سکی' علی نواز کی مالی مدد بھی کر دی تھی۔ میں اپنے سپروائزر سے معلوم کر کے آپ کو بتاؤں گا۔''

''اچھی بات ہے خان صاحب!'' میں نے ممنونیت بھرے انداز میں کہا۔'' میں آپ

کے فون کا انتظار کروں گا۔"

دو چار مزید باتوں کے بعد میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

اگلے روز میں پہلے عدالت میں اور بعدازاں آفس میں اس قدر مصروف رہا کہ مجھے ایک لمحے کے لیے بھی امتیاز خان یا حق نواز کا خیال تک نہ آیا۔ اس سے اگلے روز حسبِ وعدہ عائشہ مجھ سے ملنے آئی۔

عائشہ اپنے محلے میں موجود جنرل اسٹور والے کا فون نمبر لکھوا لائی تھی۔ اس نے مجھے بتایا۔ "وکیل صاحب! میں نے طفیل صاحب سے بات کر لی ہے۔"

"کون طفیل صاحب؟" میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

اس نے بتایا۔ "جنرل اسٹور والا طفیل احمد ہے۔ اس نے وعدہ کیا ہے' جب بھی میرا کوئی فون آئے گا' وہ مجھے ضرور بلا لے گا۔ بہت اچھا انسان ہے۔ قاسم کی گرفتاری کا اسے بھی بڑا افسوس ہے۔" وہ لمحے بھر کے لیے رکی...... پھر پوچھنے لگی۔ "آپ نے قاسم سے ملاقات کر لی وکیل صاحب؟"

میں نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

اس نے اضطراری انداز میں دریافت کیا۔ "آپ کو اس کی باتوں میں سے کوئی اہم نکتہ پتا چلا؟"

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "قاسم نے مجھے کوئی نئی بات نہیں بتائی۔ تم نے مجھے پچھلی ملاقات میں جو معلومات فراہم کی تھیں' وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا۔"

"آپ نے کہا تھا نا کہ تھانے والوں کو ٹٹولنے کی کوشش کریں گے؟"

"ہاں' میں نے کہا تھا...... اور اس سلسلے میں' میں نے کوشش بھی کی ہے۔" میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "ایک منٹ...... میں ذرا خان صاحب کو چیک کرتا ہوں۔"

وہ الجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے معروف بزنس مین امتیاز خان کے نمبرز ڈائل کیے۔ جلدی رابطہ ہو گیا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے معذرت خواہانہ



انداز میں کہا۔ "سوری بیگ صاحب! آپ کے کام میں تھوڑی تاخیر ہو رہی ہے۔"

"اس تاخیر کا سبب کیا ہے خان صاحب؟"

"وہ بات دراصل یہ ہے کہ......" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "قمر علی نواز کو ٹریس نہیں کر سکا۔ کافی دنوں سے ان کے درمیان رابطہ نہیں' اور علی نواز نے وہ فیکٹری بھی چھوڑ دی ہے' جہاں اس پر دھاگے کی چوری کا الزام لگا تھا۔ لیکن مجھے امید ہے' آنے والے ایک دو روز میں آپ کا کام ہو جائے گا۔ قمر علی اسی مہم میں لگا ہوا ہے۔ ویسے آپ کو ان بھائیوں کی کیا ضرورت پیش آ گئی بیگ صاحب؟"

امتیاز خان میرے لیے بھروسے کا آدمی تھا۔ میں نے اس سے دوٹوک بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک لمحے کے غور و فکر کے بعد میں نے اسے اپنی غرض و غایت سے آگاہ کر دیا۔ بات فوراً اس کی سمجھ میں آ گئی۔

بڑے اعتماد سے بولا۔ "یہ کام آپ مجھ پر چھوڑ دیں بیگ صاحب!"

"یعنی تھانے والے معاملات کا کھوج آپ لگائیں گے؟"

"نہیں۔" وہ قطعیت سے بولا۔ "میں کسی طرح آپ کے مطلوبہ بندے کو ٹریس کر کے آپ تک پہنچاؤں گا۔ باقی کا کام آپ خود کر لیجیے گا۔"

"ویری گڈ!" میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔

"لیکن اس سلسلے میں بہت احتیاط برتنے کی ضرورت ہے۔ اگر انکوائری آفیسر کو اس معاملے کی بھنک بھی پڑ گئی' تو وہ ہوشیار ہو جائے گا۔"

"آپ فکر ہی نہ کریں بیگ صاحب!" وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ "میں تو نہایت ہی صفائی کے ساتھ حق نواز کو آپ کے پاس پہنچاؤں گا۔ پھر اس کو سنبھالنا آپ کا کام ہے۔"

"بس' ٹھیک ہے۔" میں نے متشکرانہ انداز میں کہا۔

"کام بن جائے گا۔"

امتیاز خان سے اختتامی جملوں کے تبادلے کے بعد میں نے ریسیور کریڈل پر رکھا' تو عائشہ نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ "وکیل صاحب! آپ نے تو کورٹ میں جانے سے پہلے ہی قاسم کی وکالت شروع کر دی ہے۔"

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''عائشہ! جس لمحے تم نے میری فیس ادا کی تھی' اسی وقت سے اصولی طور پر میں قاسم کا وکیل اور وہ میرا مؤکل ہے۔ میرا خیال ہے' تم میری بات اچھی طرح سمجھ گئی ہوگی؟''

اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور ستائشی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''جی...... سمجھ گئی ہوں!''

میں نے مزید دس پندرہ منٹ تک اس کو کیس کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں بتایا اور تسلی دے کر اپنے دفتر سے رخصت کر دیا۔



ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے فرید مرڈر کیس کا چالان عدالت میں پیش کر دیا۔ میں نے اس موقع پر اپنے مؤکل قاسم کی ضمانت کرانے کی بھرپور کوشش کی' لیکن مجھے اس کوشش میں کامیابی نہ ہو سکی۔ قاسم کو جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا گیا۔

آگے بڑھنے سے قبل میں آپ کو استغاثہ کی رپورٹ اور پوسٹ مارٹم کے معاملات سے آگاہ کرتا چلوں تا کہ عدالتی کارروائی کے دوران میں آپ کا ذہن کسی الجھن کا شکار نہ ہو جائے۔

پوسٹ مارٹم کے مطابق' مقتول بھکاری فرید کی موت بارہ مئی کی صبح تین اور چار بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی یعنی لگ بھگ صبح کاذب کے وقت۔ اس بدنصیب کو گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ اس رپورٹ میں' بڑے واضح الفاظ میں لکھا ہوا تھا کہ مقتول کی موت حالتِ نیند میں ہوئی۔

استغاثہ کی رپورٹ میں اس قتل کا سبب ''پیشہ ورانہ رقابت'' بتایا گیا تھا۔ بڑے مؤثر اور مضبوط الفاظ میں عدالت کو باور کرانے کی کوشش کی گئی تھی' کہ ملزم قاسم نے اپنے مستقبل کو تاریک ہوتے دیکھا' تو اس خطرے کو جڑ ہی سے اکھاڑ ڈالا۔

اس کے علاوہ بھی رپورٹ میں بہت سی ٹیکنیکل باتیں تھیں' جو قارئین کی دلچسپی کی نہیں ہیں لہٰذا ان کا ذکر گول کیا جا رہا ہے۔ عدالتی کارروائی ختم ہوئی' تو ملزم قاسم کی بیوی پارکنگ تک میرے ساتھ آئی' اور جب میں اس سے رخصت ہو کر اپنی گاڑی میں بیٹھنے لگا'



تو اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''وکیل صاحب! اس سے پہلے عدالتی معاملات سے میرا کبھی واسطہ نہیں پڑا۔ میں نہیں جانتی' آگے کیا ہونے والا ہے...... آپ قاسم کے کیس سے مطمئن ہیں نا؟''

میں نے تسلی آمیز انداز میں جواب دیا۔ ''میں ایک سو ایک فیصد مطمئن ہوں۔ تمہیں اس سلسلے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ کیس پوری طرح میرے ہاتھ میں ہے۔''

''لیکن...... عدالت نے قاسم کی ضمانت منظور نہیں کی' اور اسے جیل بھیج دیا ہے؟''

''قتل کے ملزم کی ضمانت بہت مشکل ہوتی ہے۔'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ قاسم تھانے کی بہ نسبت جیل میں زیادہ محفوظ ہے۔ تم اطمینان سے گھر جاؤ۔ ابھی تو عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا ہے۔ آگے آگے دیکھتی جاؤ' کیا ہوتا ہے۔ میں تمہارے شوہر کو رہائی دلوانے کے لیے پورا زور لگاؤں گا۔''

وہ میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد رخصت ہو گئی' اور میں بھی روانہ ہو گیا۔

آئندہ دو تین پیشیاں سخت بور اور خشک ثابت ہوئیں۔

عدالت کی ابتدائی کارروائی اسی نوعیت کی ہوتی ہے' تاہم اس ایک ماہ کے عرصے میں مجھے ہاتھ پاؤں ہلانے کا خاصا موقع مل گیا۔ اس دوران امتیاز خان نے کانسٹیبل حق نواز کو بھی میرے آفس بھیج دیا تھا۔ حق نواز ان دنوں اسی تھانے میں ڈیوٹی دے رہا تھا' جس سے کیس متعلق تھا۔ وہ میرا بے حد شکرگزار اور احسان مند تھا' لہٰذا ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہو گیا۔ حق نواز کی زبانی مجھے فرید مرڈر کیس سے متعلق' جو اہم اور انکشاف انگیز معلومات حاصل ہوئیں' میں فی الحال یہاں اس کی تفصیل بیان نہیں کروں گا۔ صرف اتنا بتاتا چلوں کہ حق نواز کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں مجھے کئی چکر نیو کراچی اور سمن آباد کے بھی لگانے پڑے۔ بہرحال...... اس چارہ جوئی کے بڑے بڑے مثبت نتائج برآمد ہوئے' اور دو ایسے گواہ بھی مجھے مل گئے' جو قاسم کے کیس میں بڑا اہم کردار ادا کر سکتے تھے۔

آئندہ پیشی پندرہ روز بعد تھی۔



اس پیشی پر عدالت کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہوا۔

جج نے حسبِ روایت فردِ جرم پڑھ کر سنائی۔میری ہدایت کے مطابق ملزم قاسم نے صحتِ جرم سے انکار دیا۔اس کے بعد استغاثہ کے گواہوں کا سلسلہ شروع ہوا۔

استغاثہ کی جانب سے لگ بھگ چھ گواہوں کی فہرست عدالت میں داخل کی گئی تھی‘ جن میں سے زیادہ کا تعلق اسی علاقے سے تھا‘ جہاں قتل کی یہ واردات پیش آئی تھی۔میں یہاں صرف اہم گواہوں اور ان پر ہونے والی جرح کا احوال پیش کروں گا۔

استغاثہ کی طرف سے سب سے پہلے تجمل حسین نامی گواہ کو پیش کیا گیا‘ تجمل حسین پھل فروش تھا۔اس کی پھلوں کی دکان اس مقام کے قریب ہی تھی‘ جہاں بیٹھ کر ملزم بھیک مانگا کرتا تھا۔

تجمل حسین نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا‘ اور پھر اپنا مختصر سا بیان ریکارڈ کروادیا۔اس کے بعد وکیلِ استغاثہ جرح کے لیے گواہ کے قریب پہنچ گیا۔اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور کٹہرے میں کھڑے گواہ سے پوچھا۔”تجمل صاحب! کیا آپ اس شخص کو جانتے ہیں؟“

بات کے اختتام پر وکیلِ استغاثہ نے ملزموں کے کٹہرے میں کھڑے قاسم کی جانب اشارہ کیا۔تجمل نے اثبات میں گردن ہلانے کے بعد جواب دیا۔”جی ہاں......جانتا ہوں۔“

”کیا جانتے ہیں......؟“

”یہی کہ......یہ شخص ایک پیشہ ور گداگر ہے۔“تجمل نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔”میری دکان کے قریب ہی بیٹھ کر یہ بھیک مانگا کرتا تھا۔“

”مانگا کرتا تھا......سے آپ کی کیا مراد ہے!“وکیلِ استغاثہ نے تیکھے انداز میں پوچھا۔

تجمل حسین نے ایک لمحے کے توقف کے بعد جواب دیا۔

”دراصل میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ کچھ عرصے سے اس بھکاری کا کاروبار بالکل ٹھپ ہوکر رہ گیا تھا۔یوں سمجھ لیں کہ اس کا دھندا نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔“

”اچھا......کیا معزز عدالت کو یہ بتانا پسند کریں گے کہ کچھ عرصے سے اس کا کاروبار کیوں ٹھپ ہوگیا تھا؟“



”مقتول کی آمد کے سبب۔“تجمل نے بتایا۔

”یعنی......آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ جب سے مقتول فرید نے اس مقام پر بیٹھ کر بھیک مانگنے کا سلسلہ شروع کیا تھا‘ملزم کا دھندا چوپٹ ہوکر رہ گیا تھا؟“

”جی ہاں! میں بالکل یہی کہنا چاہ رہا ہوں۔“

”پھر تو ملزم کو نئے بھکاری پر بہت غصہ آیا ہوگا؟“

”کوئی ایسا ویسا غصہ جناب!“وہ ہنسنے کی اداکاری کرتے ہوئے بولا۔”یہ بندہ تو بالکل ہی پاگل ہوگیا تھا۔“

”پاگل!“وکیلِ استغاثہ نے ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔”کیا آپ نے ملزم کے پاگل پن کا کوئی مظاہرہ بھی دیکھا؟“

”مظاہرہ نہیں......مظاہرے وکیل صاحب!“استغاثہ کا گواہ آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔”آئے دن ان کے درمیان جھگڑا ہوتا رہتا تھا۔ملزم کو اس بات پر شدید غصہ تھا کہ مقتول نے اس کے اڈے پر قبضہ جما کر اس کا کاروبار تباہ کردیا ہے۔ملزم کی جھنجلاہٹ اور طیش کے جواب میں مقتول نے کبھی جوابی کارروائی نہیں کی‘وقوعے سے ایک روز قبل تو حد ہی ہوگئی تھی......“

”کیا حد ہوگئی تھی......ذرا وضاحت کریں؟“

تجمل حسین نے جواب دینے سے پہلے حاضرینِ عدالت پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی‘ پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔”یہ گیارہ مئی کی شام کا واقعہ ہے۔اچانک شور کی آواز سن کر میں اس طرف متوجہ ہوا تھا۔میں نے دیکھا کہ ملزم‘مقتول کے ساتھ دست وگریبان ہو رہا تھا۔یہ یک طرفہ چڑھائی تھی۔مقتول اس کے کسی بھی عمل کا ردعمل پیش نہیں کر رہا تھا۔ملزم کا انداز ایسا ہی تھا‘ جیسے وہ آج مقتول کو چھوڑے گا نہیں۔لوگوں کی دیکھا دیکھی میں بھی بیچ بچاؤ کرانے کے لیے آگے بڑھا۔ہم سب نے مل کر دونوں کو الگ کیا۔مقتول بے چارہ پٹنے کے باوجود بھی خاموش تھا‘ جب کہ ملزم بڑھ چڑھ کر بول رہا تھا۔اس کی باتیں بہت ہی خطرناک تھیں۔“

”خطرناک!“گواہ کے خاموش ہوتے ہی وکیل استغاثہ نے کہا۔

گواہ ملزم کی جانب انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "یہ بندہ مقتول کو خطرناک نتائج کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ اس سے بڑے واضح الفاظ میں کہہ رہا تھا..... تم نے میرے دھندے کو تباہ کیا ہے، میں تمہیں تباہ کر دوں گا۔ بہت جلد تم یہاں نظر نہیں آؤ گے۔"

"اور پھر ایسا ہی ہوا....." وکیلِ استغاثہ نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "اگلے روز یعنی بارہ مئی کی صبح جائے متنازعہ پر مقتول کی لاش پائی گئی۔ گویا ملزم نے اپنی دھمکی پر عمل کر دکھایا تھا۔" وکیلِ استغاثہ کے لہجے میں استفسار تھا۔

"جی ہاں..... اس میں کیا شک ہے!" گواہ نے تصدیقی انداز میں کہا۔

وکیلِ استغاثہ نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جنابِ عالی!"

اپنی باری پر میں جج کی اجازت حاصل کر کے وٹنس باکس کے قریب آ کھڑا ہوا۔ میرے مؤکل نے وقوعہ سے ایک روز قبل مقتول کے ساتھ ہونے والی جھڑپ کے بارے میں مجھے بتایا تھا، لیکن اس کا کہنا یہ تھا کہ اس نے فرید کو قتل وغیرہ کی کوئی دھمکی نہیں دی تھی۔ اس کا سارا غصہ محض اس بات پر تھا کہ مقتول کی آمد نے اس کے پیٹ پر بڑی دھواں دھار لات رسید کی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ فرید وہاں سے دفع ہو جائے۔

بہرحال طیش کے عالم میں اس زبان سے ادا ہونے والے الفاظ اب استغاثہ کی جانب سے اس کے خلاف استعمال ہو رہے تھے۔ میں نے گہری نظر سے وٹنس باکس میں کھڑے استغاثہ کے گواہ تجمل حسین کا سرتاپا جائزہ لیا، پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"تجمل صاحب! کیا اس سے پہلے آپ کو کسی کیس کے سلسلے میں گواہی دینے کے لیے کبھی عدالت میں آنا پڑا ہے؟"

وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "نہیں جناب! یہ میرا پہلا تجربہ ہے۔"

"پھر تو یہ تجربہ خاصا مشکل ثابت ہو رہا ہوگا؟"

"میں کچھ سمجھا نہیں۔" وہ الجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ "میرا مطلب ہے، وکیلِ استغاثہ کو آپ پر بڑی محنت کرنی پڑی ہوگی۔"

"آبجیکشن یور آنر!" وکیلِ استغاثہ نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ "ڈیفنس زیادتی کا



مرتکب ہو رہا ہے۔"

جج نے مجھ سے وضاحت طلب کر لی۔ "بیگ صاحب! اس معنی خیز استفسار سے آپ کی کیا مراد ہے؟"

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یور آنر! استغاثہ کے معزز گواہ تجمل حسین نے اپنے وکیل کی جرح کے جواب میں بعض ایسی باتوں کی تائید اور تصدیق کی ہے، جس کے بارے میں وہ وثوق سے کچھ کہنے کا اہل نہیں، جس سے ظاہر ہوتا ہے، گواہ کو مذکورہ باتیں باقاعدہ رٹوائی گئی ہیں۔"

"یہ سراسر الزام ہے جنابِ عالی!" وکیلِ استغاثہ نے چیخ سے مشابہ آواز میں کہا۔

میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "یہ الزام نہیں بلکہ حقیقت ہے۔"

"کیا آپ اس بات کو ثابت کر سکتے ہیں؟" وکیلِ استغاثہ نے براہِ راست مجھ سے پوچھ لیا۔

میں نے زیرِلب مسکراتے ہوئے جج کی جانب دیکھا۔

اس نے بھی مجھ سے یہی سوال کیا۔ "وکیل صاحب! کیا آپ اس بات کو ثابت کر سکتے ہیں کہ استغاثہ کی طرف سے گواہ کو کچھ سکھایا پڑھایا گیا ہے؟"

"جنابِ عالی! میں تو خود اسی طرف آ رہا تھا، لیکن استغاثہ نے بے صبری کا مظاہرہ کرتے ہوئے فوراً اعتراض جڑ دیا۔" میں نے بڑی معصومیت سے کہا پھر پوچھا۔

"یور آنر! اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو عدالتی کارروائی کو آگے بڑھایا جائے؟"

جج نے سوالیہ نظروں سے وکیلِ استغاثہ کو دیکھا۔ وہ خجالت آمیز انداز میں ہونٹ کاٹ کر رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آ سکا، کہ اس موقع پر اسے کیا کہنا چاہیے۔ میں نے الفاظ کا دھوبی پاٹ مار کر اسے چاروں خانے چت کر ڈالا تھا۔ جج نے ایک لمحے کے توقف کے بعد مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "بیگ صاحب! پلیز پروسیڈ۔"

میں وٹنس باکس میں کھڑے استغاثہ کے گواہ تجمل حسین کی جانب متوجہ ہو گیا۔ "تجمل صاحب!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ "آپ کو وقوعہ کے قریب دکان چلاتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟"

"دس سال سے زیادہ ہو گئے ہیں۔"

"اور ملزم کب سے وہاں بیٹھ کر بھیک مانگ رہا تھا؟"

"یہی کوئی سال......ڈیڑھ سال سے۔"

"مقتول کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟"

"اسے وہاں آئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے!" گواہ نے جواب دیا۔ "آپ پندرہ بیس دن سمجھ لیں۔"

"سمجھ لیا......" میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "آپ صبح کتنے بجے دکان کھولتے ہیں؟"

اس نے بتایا۔ "یہی کوئی......ساڑھے دس' گیارہ بجے۔"

"اور بند کتنے بجے کرتے ہیں؟"

"رات کو نو بجے تک میں دکان بند کر دیتا ہوں۔"

"آپ نے وکیلِ استغاثہ کو بتایا ہے کہ وقوعہ سے ایک روز پہلے آپ نے ملزم اور مقتول کو آپس میں دست وگریبان ہوتے دیکھا تھا۔" میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "کیا آپ بتا سکتے ہیں' جھگڑا کتنے بجے ہوا تھا؟"

"شام کے وقت......" وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔ "میرا خیال ہے' اس وقت سات بجے ہوں گے۔"

"کیا جھگڑے کے روز یعنی گیارہ مئی کو بھی آپ نے رات نو بجے اپنی دکان بند کی تھی؟"

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے پوچھا۔

"جب آپ دکان بند کر رہے تھے' تو کیا اس وقت ملزم اپنے اڈے پر موجود تھا؟"

"جی ہاں......موجود تھا۔"

"اور مقتول؟"

"وہ بھی وہیں پر تھا۔"

"کیا شام والے جھگڑے کے بعد ان میں کوئی پھڈا ہوا تھا؟"



"جی نہیں......میں نے ایسی کوئی بات نہیں دیکھی۔"

"یعنی' جب آپ معمول کے مطابق اپنا کاروبار سمیٹ کر گھر جا رہے تھے' تو ملزم اور مقتول اپنی اپنی جگہ پرُسکون بیٹھے تھے؟"

"جی ہاں! وہ دونوں اطمینان سے بیٹھے تھے۔"

"آپ کی رہائش کہاں ہے؟"

"میں پی آئی بی میں رہتا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ "اگلے روز یعنی بارہ مئی کو آپ نے معمول کے مطابق ہی دکان کھولی تھی؟"

"جی ہاں' بالکل......میں لگ بھگ گیارہ بجے دکان پر پہنچا تھا۔"

"اور وہاں پہنچتے ہی آپ کو پتا چلا کہ نووارد بھکاری کو قتل کر دیا گیا ہے؟"

"جی......جی ہاں......!"

میں نے گواہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سنسنی خیز لہجے میں پوچھا۔ "تجمل صاحب! ذرا اچھی طرح سوچ کر بتائیں کہ کیا وقوعے کے روز' یعنی بارہ مئی کو آپ صبح تین اور چار بجے کے درمیان بھی جائے وقوعہ پر موجود تھے؟"

"نہیں جناب......یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟"

میں نے اس کے سوال کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا' اور اس سے دریافت کیا۔ "تجمل صاحب! آپ استغاثہ کے معزز گواہ ہیں۔ آپ کو یہ بات تو معلوم ہی ہو گی کہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق' مقتول فرید کی موت کا وقت کیا متعین کیا گیا ہے؟"

"جی ہاں......اس رپورٹ کے مطابق مقتول فرید کو بارہ مئی کی صبح تین اور چار بجے کے درمیان گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ رپورٹ میں اس بات کی بھی وضاحت کی گئی ہے کہ اس وقت مقتول حالتِ نیند میں تھا۔"

"بالکل درست فرمایا آپ نے......" میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ "آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اس وقت آپ جائے وقوعہ پر موجود نہیں تھے؟"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" وہ اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میں تو اس وقت

اپنے گھر میں سو رہا تھا۔"

"لیکن ملزم تو وہاں ضرور موجود ہوگا نا......؟"

"جی ہا......جی نہیں......جی مجھے کیا معلوم......جی......" وہ بری طرح الجھ کر رہ گیا۔

جج نے سرزنش بھرے انداز میں کہا۔"مسٹر تجمل! وکیلِ صفائی کے سوال کا صرف ایک جواب دو......بارہ مئی کی صبح تین اور چار بجے کے درمیان تم جائے وقوعہ پر موجود تھے یا نہیں؟"

"میں وہاں موجود نہیں تھا۔"

"پھر تم نے کیسے دیکھ لیا کہ ملزم نے مقتول کو موت کے گھاٹ اتارا تھا؟" میں نے جارحانہ لہجے میں سوال کیا۔

وہ گڑبڑا گیا۔"مم میں نے......یہ کب کہا ہے......کہ میں نے یہ قتل ہوتے دیکھا ہے۔"

"تم نے......مسٹر تجمل تم نے......!" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔"تھوڑی دیر پہلے تم نے وکیلِ استغاثہ کے استفسار کے جواب میں بڑے وثوق سے بتایا ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ملزم نے مقتول کی زندگی کا چراغ گل کیا ہے۔اگر تم اس وقت جائے وقوعہ پر موجود نہیں تھے' تو پھر تمہیں کیسے پتا چلا؟"

اس کی الجھن ساتویں آسمان کو چھونے لگی۔وہ لکنت زدہ انداز میں مجھ سے مستفسر ہوا۔"وکیلِ استغاثہ کا کون سا استفسار......؟"

میں نے یاددہانی کراتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔"تمہیں یاد ہوگا......وکیل استغاثہ نے کہا تھا' ملزم نے اپنی دھمکی پر عمل کر دکھایا اور جائے متنازعہ پر مقتول کی لاش پڑی ملی۔اس امر کی تصدیق میں تم نے بڑے وثوق سے یہ الفاظ ادا کیے تھے......جی ہاں' اس میں کیا شک ہے......"

میں نے لمحے بھر کو توقف کیا' پھر جج کی جانب روئے سخن پھیرتے ہوئے کہا۔"یور آنر! جب کسی واقعے کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ......اس میں کیا شک ہے......تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کہنے والے کو اس واقعے کی وقوع پذیری کا یقین ہے کہ میرے



مؤکل نے مقتول فرید کو موت کے گھاٹ اتارا ہے......اس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ گواہ نے اپنی آنکھوں سے قتل کی یہ واردات ہوتے دیکھی ہے؟"

تجمل بری طرح بوکھلا گیا۔الجھن زدہ لہجے میں جلدی سے بولا۔"میں نے تو وکیل صاحب کے سوال کے جواب میں......بس ایسے ہی کہہ دیا تھا......میں تو اپنے گھر میں......"

میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔"یعنی......تمہیں اس بات کا یقین نہیں کہ اجنبی بھکاری فرید کو میرے مؤکل بھکاری قاسم ہی نے موت کے گھاٹ اتارا تھا؟"

"جی......میں یقین سے......نہیں کہہ سکتا......"

"گویا فرید کا قاتل کوئی اور بھی ہو سکتا ہے؟"

"جی......جی ہاں......"

"دیٹس آل یور آنر......"



آئندہ پیشی پر استغاثہ کی جانب سے تین گواہ پیش ہوئے۔

تیسرے گواہ کو میں نے اچھا خاصا لتاڑ ڈالا تھا۔

استغاثہ کے مذکورہ گواہ کا نام توفیق احمد تھا' اور وہ جائے وقوعہ کے نزدیک ہیں "نگینہ کولڈ اسپاٹ" کے نام سے ایک دکان چلاتا تھا۔اس کی دکان میں کولڈ ڈرنکس' آئس کریم اور ناریل پانی وغیرہ ملتا تھا۔توفیق جتنا معقول صورت تھا' اس سے کہیں زیادہ نامعقول سیرت ثابت ہوا تھا' چنانچہ میں نے اسے کاسٹک سوڈے سے دھو ڈالا۔

میرے ایک سوال کے جواب میں اس نے کہا۔"میں سمجھتا ہوں ملزم مقتول کے لیے اپنے دل میں بہت زیادہ بغض وعناد رکھتا تھا' یوں کہہ لیں کہ وہ اسے ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔"

میں نے پوچھا۔"توفیق صاحب! تو آپ کے خیال میں مقتول فرید میرے مؤکل قاسم کو دو دو آنکھ بھانا چاہیے تھا؟"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" وہ جلدی سے صفائی پیش کرتے ہوئے بولا۔

میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''تو پھر کیا مطلب تھا آپ کا؟''

''میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ......کہ ملزم مقتول سے شدید نفرت کرتا تھا......''

''اگر آپ کو یہ معلوم ہے کہ میرا مؤکل مقتول سے شدید نفرت کرتا تھا' پھر آپ کو یہ پتا بھی ہونا چاہیے کہ اس نفرت کا سبب کیا تھا؟''

''کاروباری رقابت......!''

''یہ الفاظ بہت کمزور ہیں......'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بلکہ صحیح معنوں میں یہ مقتول کی کھلم کھلا غنڈا گردی کے خلاف ملزم کا احتجاج تھا۔''

''مقتول نے کون سی غنڈا گردی کی تھی......؟''

''اس نے ملزم کے مخصوص اڈے پر قبضہ کر لیا تھا۔ یہ کھلی بدمعاشی نہیں تو اور کیا ہے؟''

''یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی۔'' گواہ نے سرسری لہجے میں کہا۔ ''اگر مقتول نے ملزم کی مخصوص جگہ پر بیٹھ کر بھیک مانگنا شروع کر دی تھی' تو ملزم کہیں اور چلا جاتا۔ رزق دینے والی تو خدا کی ذات ہے' اور انسان کو اتنا ہی ملتا ہے' جتنا اس کے نصیب میں لکھا ہو۔''

''ماشاء اللہ!'' میں نے طنزیہ لہجے میں سراہا۔ ''آپ وکیلِ استغاثہ سے کہیں زیادہ اچھے انداز میں اس کیس کی پیروی کر رہے ہیں۔ میں آپ سے چند ذاتی سے سوال پوچھنا چاہوں گا......اگر آپ کی اجازت ہو تو؟''

میں نے پوچھا۔ ''آپ کا کولڈ اسپاٹ کیسا چل رہا ہے؟''

''اللہ کا شکر ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''کیا اس کاروبار سے اتنی آمدنی ہو جاتی ہے کہ روزی روٹی چلتی رہے؟''

''ہاں ہاں......کیوں نہیں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اللہ کا بڑا احسان ہے۔ میرے گھر میں زندگی کی ہر نعمت موجود ہے' اور اللہ کے کرم سے سیونگ بھی اچھی خاصی ہو جاتی ہے۔''

''اس کا مطلب ہے' آپ کا بزنس بڑا سیٹ چل رہا ہے؟''

''جی ہاں......اس میں شک وشبے والی کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی۔''



''اب میں آپ سے آخری سوال پوچھ رہا ہوں۔ ذرا سوچ سمجھ کر جواب دیجئے گا۔''

وہ الجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے ہمہ تن گوش ہو گیا۔ میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''کسی صبح آپ معمول کے مطابق اپنی دکان پر پہنچیں' لیکن دکان کھولنا آپ کو نصیب نہ ہو......وہ آپ کو پہلے ہی سے کھلی ہوئی ملے۔

کھلی ہوئی دکان کے سامنے ہی آپ کے اس ٹین ڈبے کا ڈھیر لگا ہو' جسے آپ سامان کا نام دے کر اپنا کاروبار چمکاتے ہیں۔

صرف یہی نہیں' بلکہ اپنی دکان کے اندر آپ کو کسی دوسرے کا سازو سامان سجا ہوا دکھائی دے' اور وہ شخص بڑے دھڑلے سے آپ کی دکان میں بیٹھا اپنا دھندا کر رہا ہو' تو آپ کے دل پر کیا گزرے گی؟''

وہ بے ساختہ بول اٹھا۔ ''یہ منظر دیکھ کر میرا دماغ بھک سے اڑ جائے گا۔''

''ویری گڈ......ایسا ہونا بھی چاہیے۔'' میں نے سہلانے والے انداز میں کہا' پھر پوچھا۔ ''آپ کا بھک سے پرواز کرنے والا دماغ فوری طور پر اس شخص کے بارے میں کیا فیصلہ کرے گا' جو راتوں رات آپ کے اڈے پر قابض ہو گیا ہو؟''

''میں......میں......'' وہ کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا۔

''میں اس خبیث شخص کی ٹانگیں توڑ دوں گا......''

''چچ چچ چچ......!'' میں نے منہ سے مخصوص افسوسناک آواز خارج کی۔ ''بری بات ہے توفیق صاحب......اپنے پیٹ پر لات پڑنے سے اس طرح نہیں بلبلایا کرتے۔ اللہ تعالیٰ سخت ناراض ہوتے ہیں' اور ان حالات میں تو آپ کو اپنے فارمولے پر عمل کرنا چاہیے......توکل اور عدم تشدد کا فارمولا۔''

''آپ کس فارمولا کی بات کر رہے ہیں؟'' وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''وہی فارمولا' جو تھوڑی دیر پہلے آپ نے میرے مؤکل کے لیے بیان کیا تھا' یعنی......یعنی رزق دینے والی تو خدا کی ذات ہے' اور انسان کو اتنا ہی ملتا ہے' جتنا اس کے نصیب میں ہو......اگر مقتول نے ملزم کی مخصوص جگہ پر بیٹھ کر بھیک مانگنا شروع کر

دی تھی' تو ملزم کہیں اور چلا جاتا۔'' میں نے سانس ہموار کرنے کے لیے لمحاتی توقف کیا' پھر کڑے لہجے میں توفیق احمد سے پوچھا۔'' توفیق صاحب! آپ اس خبیث شخص کی ٹانگیں توڑنے کے بارے میں کیوں سوچیں گے۔ آپ اپنے ٹین ڈبے اٹھا کر کہیں اور دکان سجا لینے کے بارے میں کیوں نہیں سوچیں گے؟''

وہ لاجواب سا ہو کر وکیلِ استغاثہ کو دیکھنے لگا۔ اس کی کیفیت ''لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا'' جیسی ہو رہی تھی۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔

'' آپ مجھے ایک بھیک مانگنے والے گھٹیا شخص سے ملا رہے ہیں؟''

میں نے متحمل انداز میں کہا۔'' توفیق صاحب! میں اس وقت کسی کے سوشل اسٹیٹس کا مقابلہ نہیں کر رہا...... دو ایسے انسانوں کا ذکر رہا ہوں' جو ایک جیسے حالات کا شکار ہوں' تو انہیں کیا ردِعمل ظاہر کرنا چاہیے۔ دونوں انسانیت کے ناتے ایک ہی مقام پر کھڑے ہیں۔ دونوں کے مسائل اور معاملات ایک جیسے ہیں۔ دونوں چلچلاتی دھوپ میں جائیں تو انہیں گرمی لگتی ہے' دونوں کو کانٹا چبھے تو تکلیف ہوتی ہے۔

دونوں اپنی بھوک مٹانے کے لیے کھانا کھاتے ہیں' اور دونوں کے روزگار پر اگر کوئی زبردستی قابض ہو جائے' تو وہ شدید غم و غصے کا اظہار کرتے ہیں۔ روزی روٹی والا فارمولا تو دونوں پر نافذ ہوتا ہے...... کیا خیال ہے آپ کا؟''

استغاثہ کے معزز گواہ توفیق احمد کے پاس میرے سوال کے جواب میں کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا' لہٰذا وہ خاموشی سے گردن گھما کر بغلیں جھانکنے لگا۔ اس لمحے عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔ جج نے دس روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

ہم عدالت سے باہر آئے تو عائشہ بہت خوش تھی۔ میں نے پہلی مرتبہ اسے اتنا خوش دیکھا تھا۔ اس روز وہ اپنے بڑے بیٹے کو بھی ساتھ لائی تھی۔ عمران نامی وہ لڑکا چھٹی جماعت میں تھا' اور کہیں سے بھی وہ کسی بھکاری خاندان کا چشم و چراغ نظر نہیں آتا تھا۔ وہ متوسط طبقے کا کوئی بھی عام سا لڑکا دکھائی دیتا تھا۔ عائشہ نے برآمدے میں میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا۔



'' وکیل صاحب! میں آپ کے کام کو بڑی حد تک سمجھنے لگی ہوں۔''

'' اس کا مطلب ہے' چند روز بعد تم بھی اپنا دفتر کھول کر بیٹھنے والی ہو......؟'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

وہ میرے مذاق کو سمجھ نہ سکی' اور جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''نہیں وکیل صاحب! میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ بھلا میں کہاں...... اور وکالت کا پیشہ کہاں۔ میں تو دراصل یہ کہہ رہی تھی' کہ آپ اپنی وکالت کے زور پر جس طرح استغاثہ کو دھیرے دھیرے اپنے جال میں پھنسانے کی کوشش کر رہے ہیں' اس کا مجھے بخوبی انداز ہو رہا ہے۔ میں محسوس کر رہی ہوں کہ میرا قاسم بہت جلد رہا ہو جائے گا۔''

'' اللہ تمہاری زبان مبارک کرے۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔

'' میں آپ کے لیے اور کیا کروں وکیل صاحب؟''

'' تم صرف اپنے شوہر کے لیے دعا کرتی رہو۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔'' باقی کام تم مجھ پر چھوڑ دو۔ انشاء اللہ! یہ کیس اب ایک دو پیشیوں کی مار ہے۔ میں دراصل استغاثہ کے سب سے اہم گواہ کا انتظار کر رہا ہوں' اور مجھے امید ہے' اگلی پیشی پر اسی کی شہادت ہو گی۔''

'' آپ اس بندے کا ذکر تو نہیں کر رہے' جس کا دعویٰ ہے کہ اس نے اپنی آنکھوں سے قاسم کو اس منحوس فقیر کا گلا دباتے دیکھا تھا؟'' عائشہ نے مجھ سے سوال کیا۔

'' بالکل! میں اسی گواہ کی بات کر رہا ہوں۔''

میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔'' اس بندے نے میری اچھی خاصی دوڑ لگوائی ہے۔ مجھے سمن آباد اور نیو کراچی کے کئی چکر لگانے پڑے۔ بہر حال' بھلا ہو کانسٹیبل حق نواز کا...... کہ جس کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں' میں نے نہایت ہی اہم فیلڈ ورک کیا ہے۔''

عائشہ نے پوچھا۔

'' وکیل صاحب! آپ پہلے بھی کانسٹیبل حق نواز' سمن آباد اور نیو کراچی کا تذکرہ کر چکے ہیں' لیکن اس سلسلے میں آپ نے مجھے کوئی تفصیل نہیں بتائی؟''

"یہ تفصیلات جاننے کے لیے تمہیں چند روز انتظار کرنا ہوگا!"

"یعنی......آپ کا مطلب ہے، اگلی پیشی تک؟"

"یہ معاملہ اگلی پیشی میں بھی کھل سکتا ہے، اگر......!"

میں نے کچھ سوچ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ عائشہ نے اضطراری انداز میں دریافت کیا۔ "اگر......کیا وکیل صاحب؟"

"استغاثہ نے اپنے گواہ عارف نجمی کو گواہی کے لیے عدالت میں پیش کر دیا تو۔" میں نے جواب دیا۔

"اوہ......ٹھیک ہے۔" وہ بڑے رسان سے بولی۔ "میں اگلی پیشی تک انتظار کر لوں گی۔ دس دن ہی کی تو بات ہے۔"

میں ان ماں بیٹے سے رخصت ہو کر اپنی گاڑی کی سمت بڑھنے لگا، تو عائشہ نے آواز دے کر مجھے روک لیا۔ "وکیل صاحب......!"

میں رک گیا اور مڑ کر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولی۔ "ابھی ابھی میرے ذہن میں ایک بات آئی ہے......"

"کیا بات؟"

میں نے استفسار کیا۔

"وہ میں نے بتایا تھا نا کہ......وکالت کا پیشہ میرے بس کا نہیں ہے۔"

"ہاں، بتایا تھا۔"

میں نے اثبات میں گردن ہلائی، پھر پوچھا۔

"کیا اچانک......بس کا ہو گیا ہے؟"

"کچھ ایسا ہی سمجھ لیں وکیل صاحب!"

وہ خواب ناک لہجے میں بولی۔

میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔

"تو پھر کب دفتر کھول رہی ہو؟"



"میں اپنی بات نہیں کر رہی ہوں......!"

"پھر......یہ کس کا ذکرِ خیر ہے؟"

"میں اپنے عمران کو وکیل بناؤں گی۔"

وہ بہ دستور خواب ناک انداز میں بولی۔

"ابھی ابھی میرے ذہن میں یہ خیال آیا ہے کہ میرا عمران لکھ پڑھ کر آپ کی طرح چوٹی کا وکیل بنے گا۔"

"خیال اچھا ہے عائشہ!"

"شکریہ وکیل صاحب!"

"مجھے یقین ہو گیا عائشہ!" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "تم واقعی، میرے کام کو سمجھنے لگی ہو۔"

وہ ایک مرتبہ پھر میرا شکریہ ادا کرنے لگی۔



منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں والے کٹہرے میں استغاثہ کا سب سے اہم گواہ عارف نجمی تھا۔عارف نجمی گندمی رنگت کا مالک' ایک دراز قامت شخص تھا۔نشست وبرخاست سے وہ مستعد اور چاق چوبند نظر آتا تھا۔اس کی شخصیت بھی متاثر کن تھی۔وہ اس وقت خوش نما پتلون اور شرٹ میں ملبوس تھا۔پیشے کے اعتبار سے وہ ایک بینکر تھا۔وہ ایک مقامی بینک میں کیشئر کے عہدے پر کام کرتا تھا۔عارف نجمی کی عمر لگ بھگ چالیس سال تھی۔

نجمی کی رہائش قریبی اپارٹمنٹس بلڈنگ میں تھی' اور اس کے فلیٹ کی ایک کھڑکی سے وہ مقام بڑا واضح نظر آتا تھا' جہاں مقتول فرید کی لاش پڑی ملی تھی۔نجمی کی گواہی کو زیادہ اہمیت اس کیس میں اس حوالے سے بھی تھی' کہ وہ ایک طرح کا عینی شاہد یعنی چشم دید گواہ تھا۔اس نے اپنے فلیٹ کی کھڑکی میں سے موقع واردات پر ایک سنگین کارروائی ہوتے دیکھی تھی۔تھوڑی ہی دیر کے بعد عدالتی کارروائی شروع ہوگئی۔

عارف نجمی نے اپنا حلفیہ بیان ریکارڈ کرادیا' تو وکیلِ استغاثہ پُرجوش انداز میں وٹنس باکس کے قریب چلا گیا۔آج وہ معمول سے زیادہ خوش نظر آرہا تھا۔یوں محسوس ہوتا تھا' کہ وہ اپنے اس گواہ کی مدد سے آج کیس کا پاسا پلٹ کر رکھ دے گا۔وکیلِ استغاثہ نے اپنی جرح کا آغاز کچھ اس انداز سے کیا۔

''نجمی صاحب! آپ کو وہ رات تو اچھی طرح یاد ہوگی' جب فرید نامی اس بھکاری کا قتل ہوا' جس کے کیس کی کارروائی اس وقت عدالت میں ہورہی ہے؟''

وہ ایک جھرجھری لیتے ہوئے بولا۔''جناب! میں اس رات کو بھلا کیسے بھول سکتا



ہوں۔میرے لیے تو وہ رات قیامت سے کم نہیں تھی۔میں نے ساری رات جاگ کر گزاری تھی۔''

''غالباً آپ کے پیٹ میں شدید نوعیت کی گڑبڑ تھی اور......''

''غالباً نہیں' یقیناً وکیل صاحب!'' گواہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔''بس' کیا بتاؤں میں......اس رات تو میں بیڈروم اور واش روم کے درمیان پھیرے لگاتا ہی رہا تھا۔''

''واش روم کے ذکر پر یاد آیا......'' وکیلِ استغاثہ نے مکارانہ انداز میں کہا۔''آپ کے واش روم کی کھڑکی میں سے وہ جگہ بڑی واضح نظر آتی ہے' جہاں مقتول بیٹھ کر بھیک مانگا کرتا تھا؟''

''بالکل نظر آتی ہے جناب!'' گواہ نے پُروثوق انداز میں جواب دیا۔

وکیل استغاثہ نے پوچھا۔''وقوعہ کی رات آپ نے اپنے واش روم کی کھڑکی سے ایک سنگین اور سنسنی خیز منظر دیکھا تھا؟''

عارف نجمی نے ایک مرتبہ پھر جھرجھری لی اور سہمے ہوئے لہجے میں بولا۔

''جی......دیکھا تھا۔''

''آپ کو کچھ اندازہ ہے' وہ رات کا کون سا پہر تھا؟''

''میرے خیال میں وہ رات کا آخری پہر تھا۔''

''وقت کے بارے میں کوئی آئیڈیا؟''

''صبح کے ساڑھے تین......یا زیادہ سے زیادہ چار بجے ہوں گے۔''

وکیلِ استغاثہ کی آواز میں سنسنی خیزی بڑھتی چلی گئی۔

''نجمی صاحب! اس رات آپ نے کون سا سنسنی خیز منظر دیکھا تھا؟''

''میں نے دیکھا......'' اتنا کہہ کر گواہ نے ایکوزڈ باکس میں کھڑے میرے مؤکل کی جانب اشارہ کیا' اور اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔''میں نے دیکھا کہ یہ شخص مقتول کے اوپر جھکا ہوا تھا......اور بڑی بے دردی سے اس کی گردن کو دبا رہا تھا۔''

''مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!'' وکیل استغاثہ نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کندھے اچکائے اور خاموش ہوگیا۔

وکیلِ استغاثہ نے جرح موقوف کی تو عدالت میں سناٹا سا چھا گیا۔اپنی دانست میں وکیلِ استغاثہ نے اپنے گواہ کی مدد سے میرے مؤکل کو فرید کا قاتل ثابت کر دیا تھا۔ان لمحات میں وہ بڑا مطمئن اور مسرور دکھائی دے رہا تھا' جیسے بہت بڑا کارنامہ انجام دے کر فارغ ہوا ہو' لیکن صرف گواہ نجمی کے کہہ دینے سے میرا مؤکل مجرم ثابت نہیں ہو جاتا تھا۔ابھی میری باری باقی تھی' اور میں نے پچھلے چند روز میں نجمی کے حال اور ماضی پر بڑا کام کیا تھا۔اس وقت میرے ذہن میں دلائل کے اتنے ڈٹرجنٹ موجود تھے کہ میں نجمی کو دھودھو کر بے سُدھ اور ادھ مؤا کر سکتا تھا۔

میں نے جج سے اجازت لی اور وٹنس باکس کے قریب پہنچ گیا۔عارف نجمی متذبذب نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔یہ اس کا نفسیاتی ردعمل تھا۔اگر وہ اپنے بیان اور دلائل میں پکا ہوتا تو اس کے چہرے پر تذبذب کے بجائے ایک خاص قسم کا اعتماد نظر آتا۔بہر حال' میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا' اور بڑے منفرد انداز میں جرح کا آغاز کیا۔

''نجمی صاحب! کیا آپ کی بیوی کا نام عالیہ ہے؟''

اس نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا' اور جواب دیا۔''جی ہاں!''

''آپ کی شادی کو کم وبیش دو سال ہوئے ہیں؟''

''جی......لگ بھگ اتنا عرصہ ہی گزرا ہے۔''

''ابھی آپ کی کوئی اولاد نہیں ہے؟''

''جی ہاں' آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

میرے سوالات اتنے سادہ اور غیر متعلق تھے کہ وکیلِ استغاثہ کے علاوہ جج بھی مجھے سوالیہ انداز میں دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔اس کی آنکھوں سے حیرت آمیز الجھن مترشح تھی' تاہم اس موقع پر اس نے کسی قسم کی مداخلت مناسب نہ جانی' اور منتظر نگاہ سے میری جانب دیکھتا رہا۔

میں نے جرح کے زاویے کو تھوڑا تبدیل کرتے ہوئے وکیل استغاثہ کے پیش کردہ گواہ عارف نجمی سے سوال کیا۔

''نجمی صاحب! کیا یہ حقیقت ہے کہ آپ کی بیوی نہایت ہی حسین وجمیل ہے؟''



''آبجیکشن یور آنر......!''وکیلِ استغاثہ نے تیز آواز میں اپنا احتجاج نوٹ کرایا۔

انصاف کی کرسی پر براجمان معزز شخص نے سوالیہ نظروں سے وکیلِ استغاثہ کی جانب دیکھا' اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔''اعتراض کی وضاحت کریں؟''

وکیل استغاثہ نے جج کے استفسار کے جواب میں جوش بھرے لہجے میں کہا۔''وکیلِ صفائی نہ جانے کس انداز کی جرح کر رہے ہیں۔زیرِ ساعت کیس کا معزز گواہ کی اہلیہ اور اس کی خوب صورتی سے کیا تعلق ہے؟''

''بیگ صاحب! آپ وکیلِ استغاثہ کے اعتراض کے جواب میں کچھ کہنا چاہیں گے؟''جج نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''جنابِ عالی!''میں نے سنجیدہ لہجے میں کہنا شروع کیا۔''اس کیس کی ساعت کے دوران میں ابھی تک میری جانب سے ایک لفظ بھی ایسا استعمال نہیں کیا گیا' جو کسی بھی حوالے سے غیر متعلق ہو اور......''میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔''وقت آنے یا ضرورت پڑنے پر میں اپنے اس دعوے کو سچا ثابت بھی کر سکتا ہوں۔''

جج کے چہرے پر سنسنی خیز تاثرات نمودار ہوئے۔اس نے بھرپور دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔''گویا آپ معزز عدالت کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ استغاثہ کے گواہ مسٹر عارف نجمی کی اہلیہ عالیہ کا حسن اس کیس میں کوئی نہایت ہی اہم کردار ادا کر رہا ہے؟''

''ایگزیکٹلی یور آنر!''میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔''موصوفہ کے حسن وخوبصورتی کو اس کیس میں مرکزی حیثیت حاصل ہے......مناسب موقع پر میں اس امر کی وضاحت کروں گا۔''

''او کے!''جج نے فیصلہ کن انداز میں مجھے دیکھا' اور حتمی لہجے میں بولا۔''بیگ صاحب! یو مے پروسیڈ۔''

میں نے فاتحانہ انداز میں وکیل استغاثہ کی جانب دیکھا۔اس کی آنکھوں اور چہرے پر مجھے الجھن کے آثار نظر آئے۔یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی کہ کسی گواہ کی بیوی کے

حسن کا ایک بھکاری کے قتل سے کیا تعلق ہوسکتا ہے۔دیگر حاضرین عدالت بھی شش و پنج کی کیفیت میں گھرے دکھائی دیئے۔میں ان کو ان کے حال پر چھوڑ کر گواہ کی جانب متوجہ ہوگیا۔

''نجمی صاحب!''میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔''آپ نے ابھی تک میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟''

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔اس بات میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں تھی' کہ میرے سوال نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے ان جان سے لہجے میں پوچھا۔''کون سا سوال؟''

''عالیہ کی خوب صورتی کی ویری فکیشن والا سوال!''

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے درشت لہجے میں کہا۔''آپ کا تعلق بینکنگ سے ہے۔ویری فکیشن کا مطلب تو بہ خوبی سمجھتے ہوں گے؟''

''سمجھتا ہوں۔''وہ کھا جانے والی نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔''لیکن یہ بالکل سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ میری بیوی کی خوب صورتی کے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑ گئے ہیں۔کیا آپ کے پاس پوچھنے کے لیے کوئی ڈھنگ کا سوال نہیں ہے؟''

''اس سے زیادہ ڈھنگ کا سوال اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا' جو میں نے پوچھا ہے' لیکن افسوس کہ آپ کا احترازی جواب اس کو بے ڈھنگا بنانے کی پوری کوشش کررہا ہے۔''

میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔''اور جہاں تک ہاتھ دھو کر آپ کی بیوی کی خوب صورتی کے پیچھے پڑنے کا تعلق ہے تو......''میں نے لمحاتی ڈرامائی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے کہا۔''مجھے ایسا کوئی شوق ہے' اور نہ ہی میں اس کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔البتہ مجھے بہ خوبی یہ اندازہ ہوگیا ہے کہ آپ کی اہلیہ کا حسن آپ کے لیے مسئلہ بن گیا ہے۔کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''آپ کو میرے مسائل کے بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں وکیل صاحب!''وہ خاصے کڑوے لہجے میں بولا۔''آپ اپنی توجہ زیر ساعت کیس پر مرکز رکھیں تو اچھا ہے۔''



''جب تک مجھے میرے سوال کا جواب نہیں مل جاتا' زیر سماعت کیس کی کارروائی کو آگے بڑھانا ایسا ہی ہوگا' جیسے کسی مردے کو وینٹی لیٹر پر رکھ کر اس کے لواحقین کو باور کرانے کی کوشش کی جائے کہ ان کا پیشنٹ ابھی زندہ ہے۔''

جج نے ہمارے مباحثے میں شامل ہوتے ہوئے استغاثہ کے گواہ سے کہا۔''مسٹر نجمی! آپ بالکل واضح الفاظ میں ڈیفنس کے سوال کا جواب دیں۔''

عارف نجمی ایک لمحے کے لیے شش و پنج کی کیفیت میں نظر آیا' پھر اس نے جی کڑا کر کے کہہ دیا۔''ہاں' یہ سچ ہے کہ عالیہ حسین وجمیل عورت ہے۔''

''تھینک یو مسٹر نجمی!''میں نے تیز آواز میں کہا۔

''آپ اس بات سے تو انکار نہیں کریں گے' کہ آپ کی سسرال نیو کراچی میں ہے' کالا اسکول کے قریب؟''

''یہ ایک حقیقت ہے۔''وہ جلدی سے بولا۔''اس سے انکار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''ویری گڈ۔''میں نے سراہنے والے انداز میں کہا' پھر سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے دریافت کیا۔

''جیسا کہ آپ نے پہلے میرے ایک سوال کے جواب میں تصدیق کی ہے کہ آپ کی شادی کو کم وبیش دو سال ہوئے ہیں' میری معلومات کے مطابق جب آپ کی عالیہ سے شادی ہوئی' تو آپ کی رہائش سمن آباد کے علاقے میں تھی۔

کہیں میری یہ معلومات غلط تو نہیں ہیں؟''

''مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی!''وکیل استغاثہ نے چیخ سے مشابہ آواز میں کہا۔''اس وقت عدالت میں فرید مرڈر کیس کی سماعت ہو رہی ہے' اور میرے فاضل دوست معزز گواہ کی ازدواجی زندگی میں الجھے ہوئے ہیں۔یہ سراسر زیادتی والی بات ہے۔''

''زیادتی کس کے ساتھ ہو رہی ہے۔''میں نے براہِ راست وکیلِ استغاثہ سے پوچھ لیا۔''اور زیادتی کون کر رہا ہے؟''

''معزز عدالت کے قیمتی وقت کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔''وکیلِ استغاثہ نے

جوش بھرے لہجے میں کہا۔

''آپ کے قصے کہانیوں کی وجہ سے وقت برباد ہو رہا ہے معزز عدالت کا......'' پھر وہ روئے سخن جج کی طرف موڑتے ہوئے بولا۔ ''یور آنر!'' معزز عدالت سے میری درخواست ہے کہ وکیلِ صفائی کو ہدایت کی جائے کہ وہ اپنی جرح کو زیر سماعت کیس تک محدود رکھیں۔''

اس سے پہلے کہ جج مجھ سے کچھ کہتا میں نے وکیل استغاثہ کے سوال کا منہ توڑ جواب دے دیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں بڑی خوب صورتی سے اپنی جرح کو منطقی انجام کی طرف لے جا رہا ہوں۔ لیکن آپ کے بار بار کے اعتراضی نعرے اس اہم کارروائی میں رکاوٹ ڈال رہے ہیں۔'' پھر میں نے جج سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی! یہ کیس اس وقت انتہائی سنسنی خیز موڑ پر ہے۔ کچھ ہی دیر بعد دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہونے والا ہے۔ اگر وکیلِ استغاثہ اسی طرح مداخلت فرماتے رہے تو پھر یہ کیس دو چار پیشیاں اور بھی کھینچ سکتا ہے۔''

جج نے سنجیدہ نظروں سے مجھے دیکھا' پھر گمبھیر انداز میں بولا۔ ''بیگ صاحب! جرح جاری رکھیں!''

میں دوبارہ گواہ کی جانب متوجہ ہو گیا' اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''مسٹر نجمی! شادی کے وقت آپ کی رہائش سمن آباد میں تھی...... تھی یا نہیں؟''

''تھی!'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔

میں نے پوچھا۔ ''آپ کا گھر چلڈرن پارک کے سامنے تھا...... ہاں یا نہ؟''

''ہاں!'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''میرے گھر کے سامنے بچوں کا پارک تھا' جس میں صرف فیملی والوں کو آنے کی اجازت تھی۔''

''اور اگر کوئی شخص فیملی والا نہ ہو'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تو اسے پارک کے اندر داخل نہیں ہونے دیا جاتا تھا۔ اسے گیٹ سے باہر ہی روک دیا جاتا تھا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''نہیں......'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ بالکل



یہی صورت حال تھی۔''

جواب دینے کے بعد اس نے ہاتھ کی پشت سے اپنی پیشانی پر آنے والی پسینے کو صاف کیا' پھر سہمی ہوئی نظروں سے اس طرح مجھے دیکھنے لگا' جیسے میں موت کا فرشتہ ہوں' اور جلد ہی اس کی روح قبض کرنے والا ہوں۔ میں نے اس کی نظروں کے تاثر کو نظر انداز کرتے ہوئے اگلا سوال کیا۔

''مسٹر نجمی! آپ کے پڑوس میں ڈرائی کلینرز کی ایک دکان تھی' جس کے مالک کا نام انتظار علی تھا۔ آپ انتظار علی کو تو اچھی طرح جانتے ہوں گے۔ روزانہ آپ کی اس سے علیک سلیک ہوتی تھی۔''

''جی ہاں' میں انتظار علی کو جانتا ہوں۔'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔

میں نے بیک گیئر لگایا اور استغاثہ کے گواہ سے دریافت کیا۔ ''نجمی صاحب! آپ کی شادی کو لگ بھگ دو سال ہوئے ہیں' لیکن مجھے پتا چلا ہے کہ آپ شادی سے پہلے بھی نیو کراچی کے چکر لگاتے رہتے تھے' خصوصاً کالا اسکول کے قریب اس گلی کے' جہاں آپ کی ہونے والی سسرال واقع تھی؟''

''تو اس میں ایسی پریشانی والی کون سی بات ہے۔'' وہ اُکھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''شادی سے پہلے اپنی سسرال میں جانا آنا کوئی جرم ہے؟''

''سسرال نہیں......'' میں نے تصحیح کرنے والے انداز میں کہا۔ ''ہونے والی سسرال۔''

''ایک ہی بات ہے۔'' وہ بڑھتے ہوئے انداز میں بولا۔ ''آپ میرا جرم بتائیں؟''

''جرم بتانا یا ثابت کرنا' اور اس جرم کی سزا سنانا معزز عدالت کا کام ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میں تو صرف اپنے مؤکل کی وکالت کرتے ہوئے اسے بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

وہ لگ بھگ بدتمیزی کے سے انداز میں بولا۔ ''تو آپ اپنے مؤکل کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے میرا ٹرائل کیوں لے رہے ہیں۔ کیا آپ مجھے قصور وار سمجھتے ہیں؟''

میں نے نہایت ہی معتدل انداز میں کہا۔ ''مسٹر نجمی! میں پہلے بھی آپ سے عرض کر چکا ہوں کہ کسی شخص کو قصوروار یا بے قصور قرار دینا معزز عدالت کے اختیار میں ہے' اور یہ مت سمجھیں کہ میں یہاں آپ کا کسی قسم کا کوئی ٹرائل وغیرہ کر رہا ہوں۔''

''پھر آپ کیا کر رہے ہیں؟'' وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔

اس کی بے چینی اور اضطراب مجھے بہت محظوظ کر رہی تھی۔ میں دراصل بڑی خوب صورتی سے دھیرے دھیرے غیر محسوس انداز میں اسے کھدیڑ کر ایک بند گلی کی طرف لا رہا تھا' اور میں اپنی اس کوشش میں صد فیصد کامیابی سے پیش قدمی جاری رکھے ہوئے تھا۔ اس کے سوال کے جواب میں' میں نے بڑی رسان سے کہا۔

''مسٹر نجمی! نیو کراچی اور آپ کی سسرال کا حوالہ دے کر میں درحقیقت آپ سے ایک امر کی تصدیق چاہ رہا تھا۔

آپ تو خوامخواہ ہی گھبرا گئے' جیسے آپ کی کوئی چوری پکڑی گئی ہو...... ہوں؟''

وہ اضطراری انداز میں میری طرف دیکھنے لگا' پھر اپنے بدن کے وزن کو ایک پاؤں سے دوسرے پاؤں پر منتقل کرتے ہوئے قدرے سنبھلے ہوئے لہجے میں مجھ سے مستفسر ہوا۔ ''آپ کس امر کی تصدیق کرنا چاہتے ہیں؟''

''اس امر کی کہ آپ کی سسرال والی گلی میں پرچون کی ایک بڑی سی دکان ہے' جس کا نام شاہ کریانہ اسٹور ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس اسٹور کا مالک صمد شاہ اسی اسٹور کے اوپر رہائش پذیر ہے۔ ایسا ہے یا نہیں؟''

''جی ہاں...... بالکل ایسا ہی ہے۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

میں نے اسے چکر دینے کے لیے سوالات کو تھوڑا تبدیل کیا' پھر پوچھا۔ ''کیا یہ بات درست ہے کہ آپ کی بیوی عالیہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہے؟''

''آبجیکشن یور آنر!'' وکیلِ استغاثہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس نے اپنی موجودگی کو ثابت کرنے کے لیے احتجاجی لہجے میں کہا۔ ''یور آنر! میرے فاضل دوست حد سے تجاوز کر رہے ہیں۔ پچھلے آدھے گھنٹے سے وہ مقتول فرید کو بھول کر صرف معزز گواہ کی بیوی کو فوکس کیے ہوئے ہیں۔ وہ گھوم پھر کر عالیہ پر آ جاتے ہیں' جس بے چاری کا زیرِ سماعت



کیس سے کوئی تعلق ہی نہیں۔''

''کیا آپ اپنے دعوے کو ثابت کر سکتے ہیں؟'' میں نے وکیل استغاثہ سے پوچھا۔

وہ میرے اس اچانک حملے سے بوکھلا گیا' اور جلدی سے بولا۔ ''کون سا دعویٰ؟''

میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے وہ الٹا مجھ ہی سے پوچھ بیٹھا۔ ''تو کیا آپ یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ استغاثہ کے معزز گواہ مسٹر نجمی کی بیوی عالیہ کا اس کیس سے کوئی تعلق ہے؟''

''تو میں اتنی دیر سے اور کیا ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہوں؟''

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' اس کی بوکھلاہٹ الجھن میں بدل گئی۔

جج اس دوران میں بڑے انہماک اور دلچسپی سے عدالتی کارروائی کا جائزہ لے رہا تھا۔ وکیلِ استغاثہ کی الجھن آمیز پریشانی پر اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''بیگ صاحب! کیا آپ اپنے مؤقف کی وضاحت کریں گے؟''

''یس سر!'' میں نے اپنے سر کو تعظیمی انداز میں جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ''جنابِ عالی! اس بات میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں کہ فرید نامی ایک شخص کا قتل ہوا ہے۔ جب قتل ہوا ہے تو یقیناً اس کا کوئی قاتل بھی ہے' لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ قتل میرے مؤکل نے نہیں کیا۔ فرید کا قاتل کوئی اور شخص ہے۔ مجھے یہ بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ استغاثہ کے گواہ کی بیوی کا ذکرِ خیر ہمیں بہ آسانی اصل قاتل تک پہنچا دے گا' اس لیے مزید آدھے گھنٹے کے لیے وکیل استغاثہ کو ہدایت کی جائے کہ وہ اعتراض برائے اعتراض کی پالیسی کو فراموش کر کے بڑی توجہ سے ان انکشافات کا مشاہدہ کریں' جو ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوں گے۔''

جج نے وکیلِ استغاثہ کو چند ہدایات جاری کیں' پھر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''بیگ صاحب! پلیز پروسیڈ۔''

میں استغاثہ کے گواہ کی طرف متوجہ ہو گیا' اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ کی بیوی عالیہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہے نا؟''

اس نے بڑی شرافت سے اثبات میں گردن ہلائی۔

میں نے سوال کیا۔ ''کیا آپ کو معلوم ہے' آپ سے پہلے عالیہ کے لیے کسی اور کا رشتہ بھی آیا تھا؟''

''ایسی کوئی بات میرے علم میں نہیں ہے۔'' وہ بیزاری سے بولا۔

''لیکن آپ کے سسر فخر الدین کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہے۔''

''میں ماضی کے قصوں کو کرید نا پسند نہیں کرتا۔''

''مگر یہ میرا پسندیدہ کام ہے مسٹر نجمی!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''کھرنڈ جب تک سوکھ کر جلد کا ساتھ نہ چھوڑ دے' اس کے پیچھے زخم کچا ہی رہتا ہے اور...... یہ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ اس لیے میں کریدنے سے پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔ اگر آپ اس بات سے انکار کریں گے کہ آپ سے پہلے عالیہ کے لیے ایک شخص کا رشتہ آیا تھا' تو میں آپ کے سسر کو تو تصدیق کے لیے بعد میں زحمت دوں گا' فی الفور صمد شاہ کو گواہی کے لیے اندر بلا لوں گا۔''

''تو...... تو کیا شاہ جی ادھر ہی ہیں؟'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں مستفسر ہوا۔

میں نے سر کو اثباتی جنبش دی اور بتایا۔ ''صمد شاہ اس وقت باہر برآمدے میں موجود ہے۔ وہ میری درخواست پر اس بات کی گواہی دینے عدالت آیا ہے کہ اس کے کریانہ اسٹور پر ایک شخص کام کرتا تھا۔ وہ عالیہ کو پسند کرنے لگا۔ کئی سال پہلے وہ اندرون سندھ سے کراچی آیا تھا' پھر گھومتے گھماتے وہ صمد شاہ کی دکان پر پہنچ گیا' اور اس نے اسے اپنے ہاں ملازم رکھ لیا۔ وہ رات کو اسٹور بند کرنے کے بعد ادھر ہی سو جاتا تھا۔ ہاں...... تو میں بتا رہا تھا' اس بندے کو عالیہ سے محبت ہو گئی' اور اس نے شاہ جی کی منت کی کہ وہ اس کا رشتہ لگائیں۔ شاہ جی نے اپنی سی تمام کوششیں کر کے دیکھ لیں' لیکن تمہارے سسر نے صاف انکار کر دیا۔ ازاں بعد' عالیہ کی شادی آپ سے ہو گئی۔''

''فرض کریں' حالات ایسے ہی پیش آئے ہوں گے۔'' عارف نجمی نے میری جرح کے جواب میں زچ ہوتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اس سے میری صحت پر کیا اثر پڑتا ہے۔ آپ مجھے یہ سب کچھ کیوں بتا رہے ہیں۔ جس گھر میں بیری ہو وہاں پتھر اور جس گھر میں لڑکی ہو وہاں رشتے تو آیا ہی کرتے ہیں۔''



''بجا فرمایا آپ نے نجمی صاحب!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''آپ نے ایک طرح سے اقرار کر لیا ہے کہ آپ سے پہلے صمد شاہ کے ملازم کا رشتہ عالیہ کے لیے آیا تھا' مگر آپ کے سسر نے اس رشتے سے صاف انکار کر دیا تھا' لہٰذا اس معاملے میں صمد شاہ کو تصدیق کے لیے اندر بلانے کی ضرورت نہیں۔ میں یہ سب کچھ آپ کو اس لیے بتا رہا ہوں' کہ عالیہ کی شادی کے بعد وہ شخص اچانک کام چھوڑ کر کہیں غائب ہو گیا تھا۔ صمد شاہ نے اسے بہتیرا تلاش کیا' لیکن وہ کہیں نہ ملا۔'' میں نے لمحاتی توقف کے بعد ڈرامائی انداز میں کہا۔

''پھر ایک روز وہ شخص آپ کو نظر آ گیا۔ آپ اسے دیکھ کر پریشان ہو گئے تھے...... ہیں نا؟''

اس کا چہرہ بجھ گیا' اور آنکھوں سے بے حد اضطراب جھلکنے لگا' انتہائی کھوکھلے لہجے میں اس نے پوچھا۔ ''وہ...... مجھے کہاں نظر آیا تھا اور میں اسے دیکھ کر کیوں پریشان ہونے لگا؟''

''وہ آپ کو آپ کے سمن آباد والے گھر کے سامنے دکھائی دیا تھا۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''چلڈرن پارک کے گیٹ کے ساتھ فٹ پاتھ پر ایک اللہ بابا کے روپ میں آپ کے گھر کی طرف رخ کیے بیٹھا رہتا تھا۔ آپ کے گھر کی ایک کھڑکی سے اسے فٹ پاتھ پر بیٹھا دیکھا جا سکتا تھا' اور وہ بھی فٹ پاتھ پر بیٹھے بیٹھے مذکورہ کھڑکی میں اپنے محبوب کی جھلک دیکھ سکتا تھا' اور جہاں تک آپ کی پریشانی کا تعلق ہے تو......'' میں نے لمحے بھر کو رک کر ایک گہری سانس لی' پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ کی پریشانی کا سبب یہ تھا کہ آپ کو معلوم ہو چکا تھا' وہ شخص آپ کی بیوی کا عاشق ہے' اور عالیہ کو اس وقت سے چاہتا ہے' جب اس کی آپ سے شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔''

وہ کمزور سی آواز میں بولا۔ ''آپ میری بیوی کو...... خواہ مخواہ بدنام کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

''میں تو صرف اپنے موکل کو بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہوں مسٹر نجمی!'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔

"اور میری یہ کوشش اسی صورت میں کامیاب ہو سکتی ہے' جب میں آپ کی تاریخ اور جغرافیے پر روشنی ڈالوں۔ یاد ہے آپ نے اپنی اس پریشانی کا ایک مرتبہ انتظار علی ڈرائی کلینرز سے بھی ذکر کیا تھا' اور اس سے کہا تھا کہ آپ اس بندے کو پولیس کے حوالے کر دیں گے۔ انتظار علی چونکہ آپ کے مسئلے سے واقف ہو چکا تھا' لہٰذا اس نے آپ کو مشورہ دیا کہ پولیس کو بیچ میں لانے سے یہ معاملہ الجھ جائے گا۔ اس لیے آپ چپ چپاتے گھر بدل کر کسی اور علاقے میں رہائش اختیار کر لو۔ آپ کو یہ مشورہ پسند آیا' اور آپ سمن آباد کو خیر باد کہہ کر گلشن میں آ بسے......" میں وقتی طور پر تھما تو وہ نفی میں گردن جھٹکنے لگا۔

میں نے اپنے لہجے میں درشتی بھرتے ہوئے "آپ" سے تم پر آتے ہوئے کہا۔

"نجمی! انکار کی کوئی گنجائش نہیں...... اس لیے گنجائش نہیں کہ میں نے تمہارے فرار کی تمام راہیں مسدود کرنے کے لیے انتظار علی ڈرائی کلینرز کو بھی آج عدالت میں بلا رکھا ہے۔ وہ بھی صمد شاہ کے ساتھ باہر برآمدے میں بیٹھا میرے بلاوے کا انتظار کر رہا ہے۔"

"یہ...... یہ کیا تماشا...... لگا رکھا ہے تم نے!" وہ ایک دم ہتھے سے اکھڑ گیا' تاہم اس اکھڑنے میں وہ تیزی اور تندی کہیں نظر نہیں آتی تھی' جو ایسی صورت حال کا خاصہ سمجھی جاتی ہے۔ وہ بپھرے ہوئے سانڈ کے بجائے کسی مریل سے چوہے کے انداز میں بولا۔ "کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ فرید کو میں نے قتل کیا ہے؟"

"فرید!" میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ "یہ فرید کون ہے؟"

یہ وہی اُلو کا پٹھا تھا' جو ہاتھ دھو کر میری بیوی کے پیچھے پڑ گیا تھا۔" اسے خود پر قابو نہ رہا۔ "میں نے اسی کمینے کی وجہ سے سمن آباد کو چھوڑا تھا۔"

"لیکن اس نے تمہارا...... میرا مطلب ہے' تمہاری بیوی کا پیچھا نہیں چھوڑا...... اور اسی جرم میں اسے یہ دنیا چھوڑ کر جانا پڑا۔" میں نے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ "ہے نا؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا' اور کٹہرے کی ریلنگ کو تھام کر ہانپنے لگا۔

میں نے بہ آواز بلند کہا۔ "نجمی! جب تم سمن آباد سے گلشن اقبال میں منتقل ہوئے' تو مطمئن تھے کہ اس عاشق سے جان چھوٹ گئی' مگر وہ اللہ کا بندہ بھی دھن کا پکا نکلا' اور کچھ عرصے کے بعد تم لوگوں کو ڈھونڈتے ڈھانڈتے یہاں پہنچ گیا' اور ملزم قاسم کے اڈے پر



قبضہ جما کر بیٹھ گیا۔ اس مقام سے تمہارے فلیٹ کے لیے نائیلون کی الگنی وغیرہ باندھ رکھی ہے۔

ویسے تمہارے ایک واش روم کی کھڑکی میں سے بھی وہ مقام نظر آتا ہے' جہاں مقتول ملزم کے اڈے پر ڈیرا جمائے بیٹھا رہتا تھا' اور تم نے وکیل استغاثہ کے سوال کے جواب میں یہ بتایا بھی تھا کہ تم نے واش روم کی کھڑکی سے دیکھا کہ ملزم مقتول کے اوپر جھکا ہوا تھا...... اور بڑی بے دردی سے اس کی گردن کو دبا رہا تھا۔ اس وقت رات کے ساڑھے تین یا چار کا وقت تھا۔ کیا تم اب بھی اپنے بیان پر قائم ہو؟"

"پپ...... پانی......!" وہ کٹہرے کی ریلنگ کو اور مضبوطی سے تھامتے ہوئے بولا۔

"یہ عدالت کا کمرہ ہے نجمی' کوئی ہوٹل وغیرہ نہیں۔"

میں نے گھور کر اسے دیکھا۔ "پانی تمہیں ضرور ملے گا' بلکہ اگر تمہاری فرمائش ہو گی تو کولڈ ڈرنک بھی منگوا لیں گے' لیکن پہلے میرے سوال کا جواب...... کیا تم اپنے بیان پر قائم ہو؟"

وہ ان لمحات میں سخت مصیبت میں نظر آیا' لیکن میں اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ چند لمحات کی خاموشی اور تذبذب کے بعد اس نے اپنے مؤقف پر ڈٹے رہنے کا فیصلہ کر لیا' اور یہ اس کی ایک سنگین غلطی تھی۔

میں نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے نجمی! تمہاری مرضی ہے۔ ویسے تمہارے حق میں بہتر یہی تھا کہ اپنے جرم کا اقرار کر لیتے۔"

"جب میں نے......" وہ نقاہت بھری آواز میں بولا۔

"کچھ کیا ہی نہیں تو......" جملہ ادھورا چھوڑ کر وہ وحشت زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے جارحانہ انداز میں پوچھا۔ "نجمی! معزز عدالت یہ جاننا چاہتی ہے کہ تمہارے واش روم کی کھڑکی اور جائے وقوعہ کے درمیان کتنا فاصلہ ہے؟"

وہ ہانپتے ہوئے بولا۔ "نہیں مجھے کوئی آئیڈیا نہیں۔"

"لیکن میں نے وہ فاصلہ ناپ کر دیکھا ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا'

پھر اسے آخری چکر میں ڈالنے کی غرض سے اضافہ کیا۔"اور یہ فاصلہ اتنا زیادہ ہے کہ تم رات کے آخری پہر اپنے واش روم کی کھڑکی سے ایک شخص کو دوسرے شخص کا گلا دباتے دیکھ کر یہ دعویٰ نہ کرسکو کہ غالب شخص ملزم قاسم اور مغلوب شخص مقتول فرید ہی ہے۔رات کے اس پہر وہاں اچھا خاصا اندھیرا ہوتا ہے۔"

"جناب! اسٹریٹ لائٹس کی روشنی جائے وقوعہ تک پہنچتی ہے۔" وہ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مصداق آخری کوشش کرتے ہوئے بولا۔"میں نے اسی روشنی میں وہ خوفناک منظر دیکھا تھا۔"

میں نے اپنے مؤکل کی باعزت بریت اور حفاظت کے لیے اینٹ اینٹ چنائی کر کے ایک مضبوط سیفٹی وال کھڑی کی تھی۔اسی دیوار کے آخری ردے چڑھاتے ہوئے میں نے استغاثہ کے گواہ عارف نجمی سے کہا۔"نجمی! تم نے وقوعے کی رات ساڑھے تین اور چار بجے کے قریب اسٹریٹ لائٹ کی روشنی کے طفیل جائے واردات پر ملزم کو مقتول کا گلا گھونٹتے ہوئے دیکھا۔ذرا سوچ کر بتاؤ اس وقت مقتول نے کس رنگ کا لباس پہن رکھا تھا؟"

"اس نے سبز رنگ کا ایک چولا پہن رکھا تھا۔" گواہ نے ترت جواب دیا۔

"اور ملزم کے لباس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

"ملزم نے ......ملزم نے ......" وہ بری طرح گڑبڑ کررہ گیا۔

میں نے جارحانہ لہجے میں کہا۔"نجمی! اب تم میرے سوال کے جواب میں ملزم کے لباس کے حوالے سے جو کچھ بھی کہو گے' وہ دروغ گوئی اور تک بندی میں شمار ہوگا۔جس خوف ناک منظر میں تم نے ملزم کو مقتول کا گلا گھونٹتے دیکھا' وہاں مقتول کا لباس تو تمہیں بہ خوبی یاد ہے' لیکن ملزم کے لباس کے بارے میں بتاتے ہوئے تمہاری زبان اظہار کا راستہ بھول گئی ہے اور......ایسا صرف ایک ہی صورت میں ہوسکتا ہے!" میں نے لمحاتی توقف کر کے حاضرین عدالت' وکیل استغاثہ' انکوائری آفیسر اور جج کی جانب باری باری دیکھا' پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں اپنی بات مکمل کر دی۔"اور وہ صورت ہے کہ اس خوف ناک منظر میں ملزم کی جگہ تم موجود ہو!"



اس کی ہمت جواب دے گئی۔اب مزاحمت اس کے بس کی بات نہیں تھی۔اس کی ٹانگیں باقاعدہ کانپنے لگیں۔منہ سے ایک لفظ ادا کیے بغیر وہ وٹنس باکس کے فرش پر بیٹھ گیا۔ مجھے اسی موقع کا انتظار تھا۔میں نے اپنے مؤکل کو بے گناہ ثابت کرنے اور اصل قاتل کو بے نقاب کرنے کے لیے اب تک جو محنت کی تھی' وہ معزز عدالت کے ریکارڈ پر موجود تھی پھر عارف نجمی کی پسپائی نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیا تھا۔



آئندہ پیشی پر جج نے میرے مؤکل کی رہائی کے احکام صادر کرتے ہوئے انکوائری آفیسر کو تاکید کی کہ وہ فرید مرڈر کیس کے سلسلے میں عارف نجمی کو شامل تفتیش کرتے ہوئے پانچ روز کے اندر نیا چالان پیش کرے۔

پچھلی پیشی پر میں نے جن پوائنٹس کی بنا پر عارف نجمی کو کٹہرے کے فرش پر بیٹھنے پر مجبور کر دیا تھا' وہ انکوائری آفیسر سب انسپکٹر عبدالسلام سے ڈھکے چھپے نہیں تھے۔کسی بھی کیس کا انکوائری آفیسر ہر پیشی پر عدالت کے کمرے میں موجود رہتا ہے۔اس نے میرے متعین کردہ خطوط پر عمل کرتے ہوئے ایک ہی رات میں نجمی سے اقبال جرم کروالیا۔فرید نامی اس شخص کو عارف ہی نے گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتارا تھا۔



# کھرا کھوٹا

ویرانی اس کی آنکھوں پر پوری طرح قابض تھی۔چہرے کے تاثرات سے وہ حد درجہ پریشان نظر آتا تھا۔یوں محسوس ہوتا تھا' حالات کی ستم ظریفی نے اسے مایوس کر دیا ہے'اسے اپنی رہائی کی امید نہیں رہی۔جیل کی سلاخوں کو اس نے اپنا مقدر سمجھ کر خود کو اسیری کے ماحول میں آزاد چھوڑ دیا ہے۔وہ'' کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے'' کی تصویر بنا ہوا تھا۔میری آمد پر اس نے گردن اٹھا کر دیکھا۔میں نے مسکراہٹ سجے ہونٹوں سے اس کا استقبال کیا'اور اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

''میرا نام مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ہے......اور میں آپ کا وکیل ہوں!''

''میرا وکیل......؟''اس نے حیرت بھرے انداز میں یہ الفاظ دہرائے''لیکن...... میرے وکیل کا نام تو رؤف سلیمی ہے۔''

''ہے نہیں......تھا۔'' میں نے پیشہ ورانہ انداز میں کہا۔

''نظر الدین عابدی صاحب نے رؤف سلیمی کو فارغ کر کے مجھے آپ کا وکیل مقرر کر دیا ہے۔آپ کا مقدمہ میں لڑوں گا۔''

''سلیمی صاحب کو فارغ کر کے نظر الدین صاحب نے خاصا نیک کام کیا ہے۔''وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔'' یہ مقدمہ سلیمی صاحب کے بس کا تھا بھی نہیں۔''اگر وہ کسی قابل ہوتے تو میں اس وقت جیل کی سلاخوں کے پیچھے بند نہ ہوتا' بلکہ ضمانت پر آزاد فضا میں



سانس لے رہا ہوتا مگر......''وہ یک بہ یک کچھ اس انداز میں متوقف ہوا' جیسے اُسے کوئی نہایت ہی اہم بات یاد آ گئی ہو'پھر ٹٹولتی ہوئی نظر سے میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔اس کے الفاظ کی زبان میں بڑا تشویش ناک استفسار تھا۔

''مگر......یہ نظر الدین عابدی صاحب کون ہیں؟''

میرا خیال تھا'وہ عابدی صاحب کو جانتا ہوگا' لیکن اس نے میرے خیال کے برعکس ردعمل دیا' تو میں نے اسے اس کے نام سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''نفیس صاحب!نظر الدین عابدی آپ کی بیگم کے جاننے والے کوئی با اثر شخص ہیں۔معاشرے میں عابدی صاحب کا بڑا نام اور مقام ہے۔ان کے بارے میں تفصیل آپ اپنی بیوی سے پوچھ سکتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے......''وہ معنی خیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔''میں شازیہ سے اس بارے میں ضرور پوچھوں گا۔''

میں فوراً مطلب کی بات پر آ گیا' کیوں کہ ہماری یہ ملاقات جیل میں ہو رہی تھی' اور ظاہر ہے میرے پاس اس ملاقات کے لیے وقت کا ایک مخصوص کوٹہ تھا' جس کے اندر مجھے نفیس سے تمام ضروری باتیں پوچھنا تھیں۔میں نے مختصر الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے سرسری لہجے میں کہا۔

''نفیس صاحب!میں نے اس مقدمے کے حوالے سے بہت ساری معلومات حاصل کر لی ہیں' لیکن براہ راست آپ سے پوچھنا بھی ضروری ہے۔آپ جوڈیشل ریمانڈ پر اس وقت جیل کسٹڈی میں ہیں۔آپ پر الزام ہے کہ آپ نے میڈیم عالم آرا کو قتل کیا ہے' اور اُن کے پاس موجود نقدی اور جیولری اڑا کر جائے وقوعہ سے فرار ہو گئے تھے۔بعدازاں پولیس نے جی ایم کی نشان دہی اور تعاون پر آپ کو حیدرآباد سے گرفتار کر لیا تھا۔آپ مجھے بتائیں'وقوعہ کے روز کیا حالات پیش آئے تھے؟''

نفیس احمد ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں کاپی رائٹر کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔مذکورہ کمپنی کا نام''ایرو ایڈورٹائزرز'' تھا جس کی مالک ایک خوب صورت عورت عالم آرا تھی۔نفیس پر اسی میڈم عالم آرا کے قتل کا الزام تھا۔وہ چند لمحات تک سوچتی ہوئی نظر سے مجھے

دیکھتا رہا' پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانے لگا۔

''وکیل صاحب! آپ کو شاید معلوم نہ ہو' میڈیم بہت ہی حسین عورت تھی۔ آفس والے اور آفس سے باہر کے لوگ اس کی شخصیت سے متاثر تھے' اور بعض لوگ اس کی ذات کے حوالے سے انکشاف انگیز کہانیاں بھی سناتے تھے۔ آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں ناں؟''

اس نے استفساریہ نظر سے مجھے دیکھا' تو میں نے بڑی رسان سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اسے دیکھا تو نہیں البتہ اس کے حسن و خوب صورتی کے کئی قصے سن لیے ہیں۔''

''وہ تمام تر حسن اور دل کشی کے ساتھ ساتھ کنجوس اور سخت گیر بھی تھی۔'' وہ بتانے لگا۔ ''لیکن یہ کنجوسی اور سخت گیری سب کے لیے نہیں تھی۔ اپنی خواہشات پوری کرنے کے لیے اس کا ہاتھ کبھی نہیں رکتا تھا' یا پھر وہ جس پر مہربان ہو جاتی اسے نوازنے میں کسی بخل سے کام نہیں لیتی تھی۔ میں نے سنا ہے' اپنی پسند اور ضرورت کے معاملات میں وہ ہر حد پھلانگنے کو تیار رہتی تھی۔'' اس نے لمحے بھر کو رک کر ایسے انداز میں مجھے دیکھا' جیسے چیک کر رہا ہو کہ میں سنجیدگی سے اس کی بات سن بھی رہا ہوں یا نہیں۔

اس کے خاموش استفسار کے جواب میں' میں نے معنی خیز انداز میں سر کو اثباتی جنبش دی' تو وہ آگے بڑھا' ایک گہری سانس خارج کرنے کے بعد بتانے لگا۔

''وقوعہ کے روز چھٹی سے تھوڑی دیر قبل اس نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا۔ میں وہاں پہنچا' تو اس نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں خاموشی سے ایک کرسی کھینچ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس نے گہری نظر سے میرا جائزہ لیا اور بولی۔

''ہاں نفیس! تم مجھ سے ملنا چاہتے تھے؟''

یہ سچ ہے کہ میں نے دو روز قبل میڈم کے پاس ایک پرچی بھجوائی تھی' کہ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ جب یہ دو دن گزر گئے' اور اس نے مجھے اپنے پاس نہیں بلایا' تو میں ایک طرح سے مایوس ہی ہو گیا تھا۔ میں جس کام کی غرض سے عالم آرا سے ملنا چاہتا تھا' وہ کام میں نے ایک اور ذریعے سے کرایا تھا۔ میں نے اس کے سوال کے جواب میں کہا۔



''ہاں میڈم! وہ...... آپ سے ایک چھوٹا سا کام تھا۔''

میں نے یہ بتانا اسے ضروری نہیں سمجھا کہ اس کی جانب سے مایوس ہونے کے بعد میں نے اپنی وہ ضرورت کسی اور انداز میں پوری کر لی ہے۔ اس پردہ پوشی کی دو وجوہات تھیں۔ نمبر ایک' اگر وہ میری ضرورت کا سن کر اب بھی کام کر دیتی' تو میں انکار نہ کرتا۔ نمبر دو' میں اچھا خاصا کنفیوژ ہو گیا تھا۔ میڈم کے رویے میں وہ ''مالک اور ملازم'' والا مخصوص رنگ مجھے کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس دوران وہ یک ٹک بڑی معنی خیز نظر سے مجھے دیکھے جا رہی تھی' جیسے میں اس کی کمپنی میں کام کرنے والا کوئی ملازم نہ ہوں' بلکہ میرا شمار اس کے قریبی بے تکلف دوستوں میں ہوتا ہو۔ میرے جھجکتے اور متذبذب انداز کو دیکھ کر اس نے دوستانہ لہجے میں کہا۔

''بتاؤ نفیس...... تمہیں مجھ سے کیا چاہیے...... مانگو؟''

میں نے نگاہ اٹھا کر اس کی آنکھوں میں دیکھا' تو میرا دماغ چکرا کر رہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں چمکنے والے تاثرات کسی بڑی غلط فہمی کی راہ ہموار کرنے میں خاصے بلند نظر آتے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ مجھے بے تکلفی سے ''نفیس'' کہہ کر مخاطب کر رہی تھی' ورنہ اس سے پیشتر اس نے ہمیشہ مجھے نفیس صاحب یا مسٹر نفیس ہی کہا تھا۔

اس کے جملے کا آخری حصہ صرف ایک لفظ پر مشتمل تھا ''مانگو......'' اور یہ میرے لیے بڑا مشکل کام تھا۔ مانگنے والے معاملات میں زبان مشکل ہی سے میرا ساتھ دیا کرتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا' کسی نے اسے تالو سے چپکا دیا ہو۔

پھر اس وقت وہ اپنے مخصوص میڈم والے رنگ میں بھی نہیں تھی۔ اگر ہمیشہ کی طرح ان لمحات میں بھی وہ اپنے تحکمانہ مالکانہ مزاج کے ساتھ بات کر رہی ہوتی' تو مجھے اپنی ضرورت بیان کرنے میں اتنی دقت محسوس نہ ہوتی۔ اس پر مستزاد وہ تمام تر سنسنی خیز' تجسس آمیز اور حرارت انگیز کہانیاں تھیں' جو اس کی ذات کے حوالے سے میں نے گاہے بگاہے سن رکھی تھیں۔

''نفیس......!'' اس کی ٹھہری ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ''تم خاموش کیوں ہو۔ مانگو...... کیا چاہیے مجھ سے؟''

اس کے ”جارحانہ“ تیور دیکھ کر میں نے فوری فیصلہ کیا کہ اپنی اس ضرورت کا ہرگز میڈم سے ذکر نہیں کروں گا‘ جس کے لیے دو روز قبل میں اس سے ملنا چاہتا تھا۔ میں نے اس کے استفسار کے جواب میں سادگی سے کہہ دیا۔

”رہنے دیں میڈم!“

”کمال ہے۔“ وہ تیز‘ معنی خیز نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ ”میں تو ہرگز نہیں رہنے دوں گی۔“

”میں نے جان چھڑانے کی غرض سے کہہ دیا۔“ آپ کی دعا سے اللہ نے مجھے سب کچھ دے رکھا ہے۔“

”ظاہر ہے...... جس کے پاس جو کچھ بھی ہے‘ وہ اللہ ہی نے دے رکھا ہے۔“ وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولی۔

”لیکن اللہ خود آ کر کسی کے ہاتھ میں نہیں دیتا‘ بلکہ ایک بندے کے ذریعے دوسرے بندے تک پہنچاتا ہے...... جیسے تم مجھ سے کچھ لینا چاہتے ہو‘ اور میں تمہیں کچھ دینا چاہتی ہوں۔“

وہ اتنے معنی خیز اور دوران خون کو بڑھا دینے والے انداز میں گفتگو کر رہی تھی‘ کہ میں نے دوٹوک لہجے میں کہہ دیا۔

”مجھے کچھ بھی نہیں چاہیے میڈیم!“

”پھر تم مجھ سے ملنا کیوں چاہتے تھے؟“ اس نے گھور کر حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھا۔

”مجھے کچھ پیسوں کی ضرورت تھی۔“ میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”میں نے......!“

”تمہیں کتنے پیسے چاہئیں؟“ وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولی۔

”دو روز پہلے چاہیے تھے۔“ میں نے کہیں اور سے بندوبست کر لیا ہے...... میں اس دوران انتظار کرتا رہا‘ اور آپ نے مجھے اپنے پاس بلایا ہی نہیں۔“

”کہیں اور سے بندوست کیا ہے تو ظاہر ہے‘ قرض ہی لیا ہوگا۔“ اس نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ”مجھ سے لے کر اسے دے دینا...... بتاؤ تم نے کتنا قرض اٹھایا ہے؟“



اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا‘ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں سمجھ گیا‘ وہ دستک جنرل منیجر کے ہاتھ کی پشت کا کرشمہ تھا۔ وہ میڈم کے کمرے میں داخلے سے قبل اسی مخصوص انداز میں دستک دیتا تھا‘ اور چند سیکنڈ کے بعد دھیرے سے دروازہ کھول کر اندر آجایا کرتا تھا۔ میں دو تین مرتبہ پہلے بھی اس مشاہداتی تجربے سے گزر چکا تھا۔

دستک کی آواز پر میڈیم عالم آرا نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ اگلے ہی لمحے جی ایم بہ آہستگی کمرے میں داخل ہوا‘ اور میڈم کی سوالیہ نظروں کے جواب میں اس نے کہا۔

”وہ...... زبیری صاحب کا فون ہے...... انہیں کیا کہوں؟“

”آں......“ میڈم نے تامل کرتے ہوئے کہا۔ ”ان سے کہیں‘ میں چند منٹ بعد انہیں کال کرتی ہوں۔“

جی ایم ”او کے میڈم!“ کہتا ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

میڈم میری طرف دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولی۔ ”ٹھیک ہے مسٹر نفیس!“ اس کا انداز ایک لخت بدل گیا تھا۔ ”کل تو ہفتہ وار چھٹی ہے۔ آپ کے مسئلے پر ہم اتوار کو بات کریں گے۔“

”ٹھیک ہے‘ کا سیدھا مطلب یہی تھا کہ اب مجھے وہاں سے اٹھ جانا چاہیے۔“ نفیس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اور آپ یقین جانیں وکیل صاحب! میں اسی وقت میڈم کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کمرے سے نکل گیا تھا۔“

وہ خاموش ہوا تو میں نے کہا۔ ”اس بات کی آپ نے کہیں وضاحت نہیں کی کہ آپ کو مقتول عالم آرا سے کس مقصد کے لیے قرض چاہیے تھا...... اور کتنا؟“

اس نے ایک گہری سانس خارج کی‘ اور جواب میں بتایا۔ ”وکیل صاحب! آج کل بچیوں کی چھٹیاں چل رہی ہیں۔ میں تو کراچی ہی کا باسی ہوں‘ مگر میری بیوی کا تعلق حیدر آباد سے ہے‘ یعنی میری سسرال حیدر آباد میں ہے۔ ویسے تو اکثر و بیشتر ہمارا حیدر آباد جانا ہوتا ہی ہے‘ لیکن گرمیوں اور سردیوں کی چھٹیوں میں میری بیوی باقاعدہ ”رہنے“ کے لیے اپنے میکے جاتی ہے‘ اور پندرہ بیس دن یا مہینہ بھر وہاں گزار کر آتی ہے۔ پندرہ جولائی

کی شام میں مجھے اپنی بیوی کو حیدر آباد چھوڑنے جانا تھا' اور پروگرام کے مطابق' میں گیا بھی...... یہ الگ بات ہے کہ میری نارمل واپسی سے پہلے ہی پولیس والے میرے سسرال پہنچ گئے' اور اپنے ساتھ لے کر واپس آ گئے۔

جہاں تک میڈم سے قرض لینے کا تعلق ہے......'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا' ایک بوجھل سانس خارج کی' اور اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

'' حیدر آباد میں میری بیوی کے رشتے داروں میں کسی قریبی شخص کی شادی ہونے والی تھی۔ اسی سلسلے میں شازیہ کو کچھ اضافی رقم کی ضرورت تھی۔ شازیہ نے مجھ سے کہا' اور میں نے سوچا' میڈم سے پانچ ہزار روپے قرض لے لیتا ہوں۔

بعدازاں ماہانہ اقساط کی صورت میں واپس کر دوں گا۔

اقساط میں قرض کی ادائیگی کا نظام ہمارے ادارے میں موجود ہے' جس سے ملازمین کو اچھی خاصی سہولت حاصل ہے۔ اسی مقصد سے میں میڈم سے ملاقات کرنا چاہتا تھا۔ یہ ملاقات دو روز تک ممکن نہ ہو سکی' تو میں نے کہیں اور سے رقم قرض لے لی' اور شازیہ و دانش کو حیدر آباد چھوڑنے کے لیے روانہ ہو گیا۔''

میں نے پوچھا۔'' آپ کے بیٹے دانش کی عمر کیا ہو گی؟''

شازیہ کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا کہ ان کے اکلوتے بیٹے کا نام دانش ہے۔ نفیس نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

'' دانش ماشاءاللہ! چھ سال کا ہو گیا ہے۔''

'' بچوں کی گرمیوں کی چھٹیوں کے حوالے سے آپ نے غالباً دانش ہی کا ذکر کیا تھا؟''

'' دونوں کا!'' اس نے جواب دیا۔'' دانش کا بھی اور اس کی ماں شازیہ کا بھی۔''

'' کیا آپ کی بیوی کا تعلق درس و تدریس سے ہے؟''

'' جی ہاں۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا اور بتایا۔

'' شازیہ ایک گورنمنٹ سیکنڈری اسکول میں ٹیچر ہے اور...... یہ کام وہ شادی سے بھی پہلے سے کر رہی ہے۔ شادی کے بعد بس اتنا فرق پڑا ہے کہ میں نے سوجتن اور ہزار کوشش



کر کے حیدر آباد سے اس کا کراچی تبادلہ کروا لیا ہے؟''

آئندہ پندرہ بیس منٹ میں' میں نے نفیس احمد سے اس مقدمے کے حوالے سے نہایت اہم سوالات کیے' اور اس نے بڑے تسلی بخش جواب بھی دیئے۔ وہ اسم با مسمّٰی اور معقول انسان تھا۔ نفیس سے حاصل ہونے والی تحیر آمیز معلومات کی تفصیل میں آپ کی خدمت میں پیش نہیں کروں گا' بلکہ عدالتی کارروائی کے دوران میں' میں مناسب مواقع پر ان نکات کو اجاگر کرتا رہوں گا' اس طرح آپ طولانی تفصیلات پڑھنے سے بھی بچ جائیں گے' اور کہانی کے تجسس میں بھی کئی گنا اضافہ ہو جائے گا۔

میں نے اس روز وکالت نامے کے علاوہ چند دیگر اہم کاغذات پر نفیس احمد کا پی رائٹر کے دست خط کرائے' اور وہاں سے واپس آ گیا۔ جب میں رخصت ہو رہا تھا' تو میں نے نفیس کے چہرے کے تاثرات میں نمایاں تبدیلی دیکھی۔ اب وہاں پر ویرانی' مایوسی اور پریشانی کے بجائے مجھے اطمینان اور سکون نظر آ رہا تھا۔ یہ ایک تسلی بخش اور خوش آئند تبدیلی تھی۔



اگلی پیشی میں ابھی چند روز باقی تھے۔ اس دوران میں نے دوڑ دھوپ اور کوشش کر کے کیس کے حوالے سے نہایت ہی اہم معلومات اکٹھا کر لیں۔ اس سلسلے میں ملزم نفیس احمد کے حیدر آبادی برادر نسبتی (سالے) وقار حسین نے میری بہت مدد کی۔ وقار حسین کی حیدر آباد میں ایک ویڈیو شاپ تھی۔ اس زمانے میں شادی بیاہ اور دیگر تقریبات کے موقع پر مووی بنوانے کا رواج عام نہیں ہوا تھا' ور ویڈیو شاپ کا نوّے فی صد یہی مطلب لیا جاتا تھا کہ وہاں سے ویڈیو کیسٹس اور وی سی آر' ٹی وی وغیرہ کرائے پر ملتے ہوں گے۔ وقار کی دکان میں درجنوں ویڈیو کیسٹس کے علاوہ تین ٹی وی سیٹ اور پانچ وی سی آر موجود تھے۔ یہ ایک چلتی ہوئی ویڈیو شاپ تھی' جہاں وہ اپنے چھوٹے بھائی انتظار حسین کی مدد سے کاروبار سنبھالے ہوئے تھا' لیکن جب سے یہ مقدمہ میرے ہاتھ آیا تھا' وقار حسین نے مستقل کراچی میں ڈیرا ڈال دیا تھا۔ حیدر آباد والے کاروبار کو انتظار حسین دیکھ رہا تھا۔ ان دونوں بھائیوں کے علاوہ ایک ملازم بھی دکان میں کام کرتا تھا۔

وقار حسین ایک چلتا پرزہ قسم کا شخص تھا۔اسے کراچی کے بارے میں بھی گہری واقفیت حاصل تھی‘ اس لیے اس سے کام لینے میں مجھے بہت آسانی رہی۔میں نے اسے جو بھی مشن سونپا‘ اس نے مجھے مایوس نہیں کیا۔اس کے توسط اور تعاون سے حاصل ہونے والی انکشاف انگیز معلومات اور نکات کو میں گاہے بگاہے عدالتی کارروائی کے دوران سامنے لاتا رہوں گا۔ایک بات کی وضاحت کردوں کہ پچھلے صفحات میں‘ میں نے ایک شخصیت نظر الدین عابدی کا ذکر کیا تھا‘ اور بتایا تھا کہ وہ ملزم کی بیوی شازیہ کا واقف کار ہے۔بات دراصل یہ ہے کہ اپنے بہنوئی کے سلسلے میں وقار نے حیدرآباد کی ایک معروف شخصیت مظہر حسین سے رابطہ کیا تھا‘ جس سے اس کے اچھے مراسم تھے۔مظہر حسین نے وقار کو نظر الدین عابدی کے پاس کراچی بھیج دیا۔عابدی اور مظہر میں دوستانہ تعلقات تھے۔اس طرح عابدی صاحب نے مجھ سے رابطہ کر کے اور رؤف سلیمی کو ہٹا کر مجھے نفیس احمد کا وکیل مقرر کر دیا تھا۔اس ساری نقل وحرکت پر اگر غور کیا جاتا‘ تو نظر الدین عابدی و ملزم کی بیگم کا ایک براہ راست تعلق سامنے آتا تھا۔

آگے بڑھنے سے پہلے پوسٹ مارٹم اور فنگر پرنٹس وغیرہ کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق مقتول عالم آرا کی موت پندرہ جولائی کی شام چھ اور سات بجے کے درمیان اس کے دفتر میں واقع ہوئی تھی۔موت کا واحد اور یقینی سبب کاغذ کاٹنے والی چھری تھی‘ جو مقتول کے سینے میں دستے تک پیوست پائی گئی تھی۔اس ”پیپر نائف“ یعنی کاغذ کاٹنے والی چھری نے مقتول کے دل کو چیر ڈالا تھا‘ اور وہیں اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے موت کے منہ میں چلی گئی تھی۔

مقتول کے کمرے میں دو تین غیر اہم مقامات اور ایک اہم شے پر ملزم کی انگلیوں کے نشانات پائے گئے تھے۔غیر اہم مقامات میں داخلی دروازے کا ہینڈل‘ کرسی کے ہتھے اور میز کا وہ کنارہ شامل تھا‘ جس طرف وقوعہ کے روز ملزم کو میڈم عالم آرا کے سامنے بیٹھنے کا اتفاق ہوا تھا......اور اہم شے اس ”پیپر نائف“ کا دستہ تھا‘ جو اس مقدمے میں آلۂ قتل کی حیثیت رکھتا تھا۔آلۂ قتل پر ملزم کے انگلیوں کے نشانات کا پایا جانا تشویشناک اور غور طلب پہلو تھا‘ اور اسی مضبوط بنا پر استغاثہ ملزم کو بکری بنا کر اسے شیر کی نظر سے دیکھ رہا تھا۔



مقتول عالم آرا اپنی ضعیف والدہ کے ساتھ ڈیفنس سوسائٹی میں رہائش پذیر تھی (اپنی موت سے پہلے تک) کچھ عرصہ قبل مقتول نے صفدر عباس نامی ایک بزنس مین سے شادی کی تھی۔یہ شادی لگ بھگ تین سال چلی۔اس کے بعد باہمی رنجش اور چپقلش کے نتیجے میں مقتول نے شوہر سے خلع لے لی تھی۔صفدر عباس سے ناتا ٹوٹنے کے بعد تھوڑے دن ہی گزرے تھے کہ مقتول نے ایک بوڑھے بیورو کریٹ سے شادی کر لی۔اس کی دوسری شادی صرف دو ماہ چلی‘ پھر دونوں کے راستے جدا ہو گئے۔دوسری شادی کی ناکامی پر مقتول نے زندگی بھر شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔حالانکہ اس کی جسمانی شادابی اور حسن وخوب صورتی ایسی تھی‘ کہ اس کے لیے اچھے اور معیاری رشتوں کی کوئی کمی نہیں رہی تھی۔موت کے وقت وہ بیالیس سال کی تھی‘ لیکن کہیں سے بھی تیس سال سے زیادہ کی نہیں آتی تھی‘ مگر اٹل فیصلہ کرنے کے بعد وہ ایک انچ اِدھر اُدھر نہیں ہٹی۔شادی ایسے جھنجٹ کا خیال ذہن سے نکال کر اس نے پوری توجہ کاروبار پر مرکوز کر دی‘ جس کے نتیجے میں اس کی ایڈورٹائزنگ ایجنسی دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرتی چلی گئی......اور جب اس کا کاروبار عروج پر تھا‘ تو اچانک اس کی زندگی نے دھوکا دے دیا‘ پندرہ جولائی کی شام وہ اپنے دفتر میں کرسی پر مردہ پائی گئی تھی۔

زندگی بڑی رنگین شے ہے‘ مگر اس کی بے وفائی انتہائی سنگین! یہ کیس جب میرے ہاتھ میں آیا‘ تو اس وقت تک اس پر کوئی قابلِ ذکر کارروائی نہیں ہوئی تھی۔جج نے وکیل صفائی رؤف سلیمی کی دائر کردہ ملزم کی درخواست ضمانت کو رد کرتے ہوئے اسے جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا تھا۔

پولیس کی تفتیش کے نتیجے میں عدالت میں جو استغاثہ دائر کیا گیا‘ مختصراً اس کے بارے میں بھی بتاتا چلوں تاکہ عدالتی کارروائی کے دوران آپ کا ذہن کسی الجھن کا شکار نہ ہو۔

واقعات اور استغاثہ کی رپورٹ کے مطابق‘ ملزم نفیس احمد وقوعہ کی شام میں مقتول کے بلانے پر اس کے کمرے میں گیا۔اس نے وہاں کم از کم آدھا گھنٹا گزارا۔ملزم اور مقتول کے درمیان کیا باتیں ہوئیں یہ کسی کو پتا نہیں۔اس سلسلے میں پولیس نے جو بیان دیا

اس پر یقین نہیں کیا گیا۔

ملزم جب مقتول کے کمرے سے نکلنے کے بعد اپنے گھر روانہ ہوا' تو مقتول کے ایک ملاقاتی فہیم زبیری کو اس کے کمرے میں جانے کا اتفاق ہوا...... اور اسی وقت یہ سنسنی خیز انکشاف ہوا' کہ مقتول عالم آرا اپنی کرسی پر مردہ حالت میں پڑی ہے۔ فہیم زبیری گھبرا کر باہر نکلا' اور اس غیر متوقع سنگین صورت حال سے جی ایم اظہر ندیم کو آگاہ کیا۔ اظہر ندیم نے بھی کمرے میں جائے وقوعہ اور مقتول کا جائزہ لیا' پھر ہنگامی انداز میں پولیس اسٹیشن فون کیا' اور اس کے تھوڑی دیر بعد مقتول کی ضعیف والدہ جہاں آرا بیگم کو اس سانحے سے آگاہ کر دیا۔ اس دوران میں اور پولیس کی آمد کے بعد تک فہیم زبیری جائے وقوعہ پر موجود رہا' اور اس نے اپنا حلفیہ بیان بھی ریکارڈ کرایا۔

پولیس کی کڑی پوچھ گچھ کے نتیجے میں جنرل منیجر اظہر ندیم نے بتایا کہ فہیم زبیری سے تھوڑی دیر قبل ملزم' مقتول کے کمرے میں لگ بھگ آدھا گھنٹہ گزار کر گیا' اور اس دوران کوئی اور شخص نہ تو کمرے میں داخل ہوا تھا' اور نہ ہی مقتول نے باہر قدم نکالا تھا۔ حتیٰ کہ اس کے اور مقتول کے درمیان بھی کوئی بات نہیں ہوتی تھی۔ پولیس کے لیے یہ کلیو بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ چنانچہ جی ایم کی نشاندہی اور تعاون پر پولیس ملزم کے گھر' واقع سمن آباد پہنچ گئی۔ ملزم کے گھر پر موجود تالے کو دیکھ کر انہوں نے آس پڑوس سے اس کے بارے میں پوچھ گچھ کی۔ ملزم کے ایک پڑوسی کفیل احمد نے پولیس والوں کو بتایا' کہ وہ لوگ حیدر آباد چلے گئے تھے۔ اسی پڑوسی نے اپنی بیوی نگہت سے پوچھ کر پولیس والوں کو ملزم کے سسرال کا پتا بھی بتا دیا۔ نگہت' شازیہ کی پڑوسن بھی تھی' اور گہری دوست بھی۔ اسے اس بات کی پوری آگاہی تھی کہ شازیہ وہاں کسی شادی میں شرکت کرنے جا رہی ہے' اور مہینہ بھر رہ کر آئے گی۔

پولیس کے لیے بہت آسانی ہو گئی۔ ایک ہدف ہاتھ آ جانے کے بعد انہوں نے فوراً حیدر آباد کا رخ کیا اور رات گئے ملزم کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ کراچی لے آئے۔ پولیس نے اسے مقدمے کے سلسلے میں بڑی مستعدی اور تیز رفتاری کا مظاہرہ کیا تھا۔ جب ملزم کے فنگر پرنٹس حاصل کیے گئے تو وہ آلۂ قتل پر پائے جانے والے انگلیوں کے نشانات سے



میچ کر گئے۔ پولیس کی نظر میں ملزم کے مجرم ہونے کے لیے انگلیوں کے نشانات کی میچنگ ہی کافی تھی۔ علاوہ ازیں دفتری حالات وواقعات بھی بڑی حد تک اس کے خلاف ہی تھے' چنانچہ ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے خاصی بھاری قسم کے چالان کے ساتھ اسے حوالۂ عدالت کر دیا تھا۔

مزید تفصیلات کے مطابق مقتول کی جیولری اور نقدی رقم بھی جائے وقوعہ سے غائب پائی گئی تھی۔ پولیس نے یہ مؤقف اختیار کیا کہ ملزم نے نہایت ہی ہوشیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے پہلے...... لیڈی باس کو قتل کیا' پھر اس کے زیورات اور نقدی لے کر وہاں سے فرار ہو گیا۔

اس کے علاوہ بھی چند چھوٹی موٹی باتیں تھیں' جن کا ذکر عدالتی کارروائی کے دوران مناسب مواقع پر ہوتا رہے گا۔ لہٰذا ہم جلدی سے عدالت کا رخ کرتے ہیں۔



آئندہ پیشی پر میں نے وکالت نامے کے ساتھ ہی ملزم کی درخواست ضمانت بھی دائر کر دی۔ جج نے چونک کر میری طرف دیکھا' اور معنی خیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''اچھا تو بیگ صاحب! اب اس کیس کی پیروی آپ کریں گے؟''

''یور آنر! میرا کام اور پیشہ وکالت ہے۔'' میں نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ ''اور جو بھی مقدمہ میرے ہاتھ میں آتا ہے میں اس سلسلے میں یہی خدمات سرانجام دیتا ہوں۔''

وہ ایک مرتبہ پھر پُرمعنی انداز میں سر ہلا کر رہ گیا۔

میں نے اپنے مؤکل کی ضمانت کے سلسلے میں دلائل دینا شروع کیے۔ پندرہ بیس منٹ تک استغاثہ اور مدعی میں حمایت اور مخالفت کا عمل جاری رہا' لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ قتل کے ملزم کی ضمانت ناممکن حد تک مشکل ہوتی ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ میں اس روز اپنے مؤکل کی ضمانت کرانے میں ناکام رہا تھا۔ عدالت بھی استغاثہ کی طرح اس بات کو بڑی اہمیت دے رہی تھی کہ آلۂ قتل کے دستے پر ملزم کی انگلیوں کے نشانات پائے گئے تھے۔

اس پیشی پر کوئی قابل ذکر کارروائی نہ ہو سکی۔

اگلی پیشی دس روز بعد تھی' اور اس دن عدالتی کارروائی کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ جج نے فردِ جرم پڑھ کر سنائی۔ ملزم نے صحت جرم سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد استغاثہ کے گواہوں کی باری تھی' لیکن اس سے پہلے کہ وکیلِ استغاثہ اپنے کسی گواہ کو کٹہرے میں پہنچاتا' میں نے بہ آواز بلند جج سے کہا۔

"جنابِ عالی! میں نے ابھی یہ کیس لیا ہے۔ اگرچہ ملزم کا بیان پہلے ہو چکا ہے' اور اس بیان کی تفصیلات بھی میرے علم میں ہیں' لیکن معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ استغاثہ کے گواہوں کے بیانات سے پہلے مجھے ملزم سے چند اہم سوالات کرنے کا موقع دیا جائے۔ میں محسوس کر رہا ہوں رؤف سلیمی نے اس مقدمے کے ساتھ تسلی بخش سلوک نہیں کیا۔"

جج نے اثبات میں گردن ہلائی' اور میری درخواست کو جائز سمجھتے ہوئے مجھے ملزم سے سوالات کی اجازت دے دی۔ میں اکیوزڈ باکس (ملزموں کے کٹہرے) کے قریب چلا آیا' پھر اپنے مؤکل اور اس مقدمے کے ملزم نفیس احمد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جرح کا آغاز کیا۔

"نفیس احمد! تمہیں مقتولہ کی فرم میں کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا تھا؟"

"تقریباً دو سال۔" اس نے جواب دیا۔

"تم ایک کاپی رائٹر کی حیثیت سے "ایرو ایڈورٹائزنگ" میں کام کر رہے تھے۔" میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "کیا تم نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز یہیں سے کیا تھا؟"

میں ہلکے پھلکے سوالات کر کے ملزم کی زبان سے چند ایسے نکات معزز عدالت کے رُوبرو لانا چاہتا تھا' جو بعدازاں میرے مؤکل کے لیے بہت مددگار ثابت ہوتے۔ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"نہیں جناب! میں "ایرو" میں شمولیت سے قبل "رائزنگ اسٹار" میں یہی کام کر رہا تھا۔"

"اس کا مطلب ہے رائزنگ اسٹار بھی کوئی ایڈورٹائزنگ ایجنسی ہے۔" میں نے خود



کلامی کے انداز میں کہا' پھر کٹہرے میں کھڑے ملزم سے پوچھا۔ "رائزنگ اسٹار چھوڑنے کی کوئی خاص وجہ تھی؟"

"رائزنگ اسٹار والے مجھے بہت کم تنخواہ دے رہے تھے۔" ملزم نے جواب دیا۔ "اور تنخواہ بڑھنے کے دور دور تک کوئی امکانات نظر نہیں آتے تھے۔ ایجنسی کے مالک کی کنجوسی پورے فیلڈ میں مشہور ہے...... پھر اس ایجنسی کا دفتر کھارادر کے گنجان آباد علاقے میں تھا' جو میری رہائش گاہ سے خاصے پیچیدہ روٹ پر واقع تھا' جب کہ ایرو کا دفتر پی ای سی ایچ سوسائٹی کے کمرشل ایریا میں ہے' جہاں آمدورفت کے لیے مجھے بڑی آسانی ہو گئی تھی۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ "کیا تم معزز عدالت کو بتاؤ گے کہ رائزنگ اسٹار میں تمہیں کتنی تنخواہ مل رہی تھی' اور ایرو کو تم نے کتنے پر جوائن کیا تھا؟"

"وہاں مجھے دو ہزار روپے تنخواہ ملتی تھی۔" ملزم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "اور ایرو ایڈورٹائزنگ کو میں نے اڑھائی ہزار میں جوائن کیا تھا۔ گزشتہ دو سال تک یہاں کام کرنے کے دوران میری تنخواہ میں ایک ہزار روپے کا اضافہ ہوا ہے۔ جب میڈیم کے قتل والا افسوس ناک واقعہ پیش آیا' مجھے ایرو ایڈورٹائزنگ سے ساڑھے تین ہزار تنخواہ مل رہی تھی۔"

یہ آج سے لگ بھگ ستائیس سال قبل کا واقعہ ہے۔

اس زمانے میں تین' ساڑھے تین ہزار روپے بڑی ہینڈسم تنخواہ تصور کی جاتی تھی۔ آج کل تو کاپی رائٹرز اپنی قسمت اور صلاحیت کی بنیاد پر بیس سے چالیس ہزار تک تنخواہ اٹھا رہے ہیں۔

میں نے سلسلۂ سوالات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"سننے میں آیا ہے کہ مقتولہ اپنے ملازموں کے لیے بہت اچھی تھی' ان کی ضروریات کا بڑا خیال رکھتی تھی' خصوصاً...... ایڈوانس وغیرہ کے حوالے سے؟"

"بنیادی طور پر تو میڈیم ایک کنجوس عورت ہی تھی۔"

اس نے بے ساختہ کہا۔ "اس کے ساتھ ہی وہ موڈی بھی تھی۔"

جب دل چاہتا تو کسی پر مہربان ہو جاتی تھی' البتہ......'' وہ سانس لینے کے لیے متوقف ہوا' پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''البتہ ...... جہاں تک ایڈوانس وغیرہ کا تعلق ہے' اس سلسلے میں شاید ہی اس نے کسی کو منع کیا ہو۔ضرورت پڑنے پر ملازم کو پیشگی رقم مل جاتی تھی' جو آسان اقساط کی صورت میں ہر ماہ اس کی تنخواہ سے کٹتی رہتی تھی۔میڈم کی جانب سے اس سہولت سے انکار ممکن نہیں۔'' وہ مقتولہ کے مہربان ہونے اور موڈی ہونے کے حوالے سے کسی خاص جانب اشارہ کرنا چاہتا تھا' لیکن میں مقتولہ کی زندگی کے اس گوشے کو مقدمے کا حصہ نہیں سمجھتا تھا' لہٰذا میں نے اس کی بات پر توجہ نہیں دی۔

''ہوں!'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔''وقوعہ سے چند روز قبل تم بھی مقتول سے کچھ رقم پیشگی لینا چاہتے تھے؟''

اس نے میرے سوال کے جواب میں وہ تفصیل بیان کی' جس کے پیش نظر اسے مقتول سے پانچ ہزار روپے پیشگی لینے کی ضرورت پیش آئی تھی' پھر بتایا کہ بوجوہ میڈم سے ملاقات نہ ہونے کے سبب اس نے کہیں اور سے رقم کا بندوبست کر لیا تھا' چنانچہ وقوعہ کے روز جب مقتولہ نے اسے اپنے کمرے میں بلا کر ملنے کے بارے میں استفسار کیا' تو اس نے بتا دیا کہ وہ جس مقصد سے مقتولہ سے ملاقات کا خواہاں تھا' وہ مقصد ملاقات سے پہلے ہی پورا ہو گیا ہے۔''

''اس کے باوجود بھی مقتولہ نے تمہیں رقم کی پیش کش کی تھی؟''

''جی ہاں' پیش کش کی تھی' لیکن میں نے معذرت کر لی۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔''تم نے وقوعہ کے روز مقتولہ کے کمرے میں لگ بھگ کتنا وقت گزارا تھا؟ استغاثہ کے مطابق تم لگ بھگ آدھا گھنٹہ مقتولہ کے کمرے میں رہے تھے!''

''مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں اس روز چھٹی سے تھوڑی دیر پہلے یعنی پونے چھ بجے میڈم کے کمرے میں داخل ہوا تھا۔'' وہ پُروثوق لہجے میں بولا۔''اور چھ پانچ یا چھ دس پر میں وہاں سے نکل آیا تھا۔ان بیس پچیس منٹ کو لگ بھگ آدھا گھنٹہ کہا جا سکتا ہے۔''

''مجھے پتا چلا ہے' ایرو ایڈورٹائزرز میں گیارہ بجے کام شروع ہوتا ہے' اور شام میں



ٹھیک چھ بجے چھٹی ہو جاتی ہے۔''

میں نے اس کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے کہا۔''وقوعہ کے روز جب تم مقتولہ کے کمرے سے نکل کر گھر کی جانب روانہ ہوئے' تو اس وقت تک آفس کا سارا اسٹاف جا چکا تھا' یا ان میں سے کوئی وہاں موجود تھا؟''

اس نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد جواب دیا۔''میں نے ایک ایک کمرے میں جھانک کر تو نہیں دیکھا' لیکن میرا خیال ہے' اس وقت تک سب لوگ جا چکے تھے' سوائے جی ایم صاحب کے۔''

''تمہارا مطلب ہے' اظہر ندیم کے سوا؟''

''جی ہاں' اظہر ندیم صاحب ہی ہمارے جنرل منیجر ہیں۔''

''تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تم نے جی ایم کے کمرے میں جھانک کر دیکھا تھا؟''

''میں نے نہیں...... بلکہ جی ایم نے میڈم کے کمرے میں جھانکا تھا۔'' وہ پُراعتماد لہجے میں بولا۔''جبھی مجھے پتا چلا کہ وہ آفس میں موجود ہیں۔اس کے ایک منٹ بعد ہی میں وہاں سے رخصت ہو گیا تھا۔''

میں بڑی صفائی اور خوب صورتی سے سچویشن بنا رہا تھا' لیکن وکیلِ استغاثہ کو میری کارکردگی پسند نہ آئی۔تھوڑی دیر تک تو وہ خاموشی سے برداشت کرتا رہا' پھر بولنے پر مجبور ہو گیا۔

''آبجیکشن یور آنر!'' اس نے چیخ سے مشابہ لہجے میں کہا۔''اس عدالت میں عالم آرا مرڈر کیس کی سماعت ہو رہی ہے' اور وکیلِ صفائی دفتری اوقات اور ملازمین کی آمد کو غیر ضروری انداز میں زیرِ بحث لا کر معزز عدالت کا قیمتی وقت برباد کر رہے ہیں۔انہیں ایسی غیر متعلق جرح سے روکا جائے۔''

میں نے وکیلِ استغاثہ کے اعتراض کا فوری جواب دیتے ہوئے' الٹا اسی سے پوچھ لیا۔''میرے فاضل دوست! آپ کے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ غیر ضروری اور غیر متعلق ہے؟''

جج کو فوراً احساس ہو گیا کہ ہماری باہمی بحث کوئی خطرناک رخ اختیار کر سکتی ہے' لہٰذا

اس نے گمبھیر لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

''بیگ صاحب! آپ کے خیال میں ملزم سے پوچھے گئے یہ سوالات کس حوالے سے اس کیس کے لیے اہمیت رکھتے ہیں؟''

''ایبسولیوٹلی یور آنر!'' میں نے یقین بھرے لہجے میں کہا۔

''اور وقت آنے پر میں...... اس بات کو ثابت بھی کر سکتا ہوں۔''

''مسٹر بیگ! پلیز پروسیڈ۔'' جج نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

میں ملزم نفیس احمد کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ''جب جی ایم اظہر ندیم نے مقتول کے کمرے میں جھانکا تو کیا اس وقت تم کمرے میں موجود تھے؟''

''جی ہاں' میں وہیں پر بیٹھا ہوا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''جی ایم محض جھانک کر واپس چلا گیا تھا یا اس نے مقتول سے کچھ کہا بھی تھا؟''

''جی ایم صاحب نے میڈم سے کہا تھا' زبیری صاحب کا فون ہے انہیں کیا کہوں؟''

''میڈم نے کہا تھا' زبیری صاحب سے کہہ دیں چند منٹ بعد وہ خود انہیں کال کریں گی۔'' ملزم نے جواب دیا۔

''تو کیا واقعی مقتولہ نے چند منٹ بعد زبیری صاحب کو فون کیا تھا؟''

''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' ملزم نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''کیوں کہ میڈم نے جی ایم کے کمرے سے نکلتے ہی مجھے فارغ کر دیا تھا' اور میں دفتر سے نکل کر سیدھا اپنے گھر چلا گیا تھا' کیوں کہ مجھے اپنی فیملی کو اپنے ساتھ حیدر آباد لے کر جانا تھا۔ وہاں سے میری واپسی اتوار کی رات کو ہوتی' اور پیر کی صبح میں دفتر آ جاتا' لیکن پولیس نے لگ بھگ آدھی رات مجھے میری سسرال واقع حیدر آباد سے گرفتار کر لیا۔''

''ہوں!'' میں نے پُرمعنی انداز میں سر ہلایا اور اگلا سوال کیا۔ ''ذرا سوچ کر بتاؤ وقوعہ کے روز جب تم دفتر سے رخصت ہوئے تو اس وقت تک زبیری صاحب وہاں نہیں پہنچے تھے؟''

''جی ہاں...... نہیں پہنچے تھے۔'' وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔



اس نے اثبات میں جواب دیا۔

میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔ ''آلۂ قتل...... یعنی ''پیپر نائف'' کے دستے پر تمہاری انگلیوں کے نشانات پائے گئے ہیں۔ جب تم نے اپنی میڈم کو قتل نہیں کیا' اور انہیں زندہ سلامت دفتر میں چھوڑ کر گئے تھے' تو پھر آلۂ قتل پر تمہاری انگلیوں کے نشانات کیا معنی رکھتے ہیں؟''

میری جرح کے انداز سے جھلکتا تھا' جیسے میں ڈیفنس کونسلر نہ ہوں' بلکہ وکیلِ استغاثہ ہوں' لیکن میں نے سوالات کا یہ انداز دانستہ اور ایک خاص مقصد کے تحت اختیار کیا تھا' اور میرا مؤکل اس خاص مقصد کو بہ خوبی جانتا تھا۔ اس نے میری ہدایت اور وقت کی ضرورت کے تحت جواب دیا۔

''وکیل صاحب! جو شے کسی شخص کے استعمال میں رہی ہو' اس پر مذکورہ شخص کی انگلیوں کے نشانات کا پایا جانا اچنبھے کی بات تو نہیں۔''

میں نے میز پر رکھے ہوئے ایک سیلوفین بیگ کو اٹھا لیا۔ اس بیگ میں آلۂ قتل یعنی کاغذ کاٹنے والی چھری محفوظ تھی۔ سبز دستے والی اس چھری کے تیز دھار خطرناک پھل پر جما ہوا خون بہ آسانی دیکھا جا سکتا ہے' تاہم اتنے دن گزرنے کے بعد خون کی رنگت سیاہی مائل ہو چکی تھی۔ میں نے مذکورہ سیلوفین بیگ کو ملزم کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے دریافت کیا۔

''تمہارا مطلب ہے' یہ پیپر نائف تمہارے استعمال میں رہا ہے؟''

''جی ہاں' میں اسی کی بات کر رہا ہوں۔'' وہ غیر متزلزل لہجے میں بولا۔

میں نے مذاق کے رنگ میں کہا۔ ''بھئی! تم اس خطرناک چیز سے کیا کرتے رہے ہو' جو اس کے سبز دستے پر تمہارے فنگر پرنٹس ثبت ہیں۔ کہیں تم......؟''

میں نے معنی خیز سوالیہ انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا' تو وہ جلدی سے بولا۔ ''جناب! یہ پیپر نائف خطرناکی کا ٹائٹل اس لیے حاصل کر پایا ہے کہ اس کی مدد سے میڈم عالم آرا کو قتل کیا گیا ہے' ورنہ یہ تو کاغذ کاٹنے والی ایک عام سی چھری ہے جو وقوعہ سے چند روز پہلے تک میری دفتری اسٹیشنری میں شامل تھی...... جیسے پنسل' پین' اریزر' شاپنر' اسکیل' اسٹیپلر'

پیپر ویٹ' بالکل ویسے ہی یہ پیپر نائف بھی......''

''چند روز پہلے......وقوعہ سے چند روز پہلے تک......''

میں خود کلامی والے انداز میں بڑبڑایا' پھر ملزم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔''چند روز پہلے تک یہ پیپر نائف تمہارے استعمال میں تھا' تو پھر یہ کہاں چلا گیا تھا؟''

''میں یہ تو نہیں بتا سکتا کہ یہ پیپر نائف کہاں غائب ہو گیا تھا۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔''البتہ ایسا ہے کہ میں نے اس کی گمشدگی کے بارے میں جی ایم صاحب کو بتا دیا تھا۔انہوں نے برا سا منہ بنا کر مجھے اپنی چیزوں کو احتیاط سے سنبھال کر رکھنے کی تاکید کی' اور ایک دوسرا پیپر نائف منگوا دیا۔نئے پیپر نائف کا دستہ نیلے رنگ کا ہے' اور وقوعہ کے روز شام تک وہ میری میز پر موجود تھا۔اب اس کے بارے میں' میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

''ہوں......!'' میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے سیلوفین بیگ کو غور سے دیکھتے ہوئے ایک گہری سانس خارج کی' اور دوبارہ اس بیگ کو میز پر رکھنے کے بعد گمبھیر انداز میں ملزم سے دریافت کیا۔

''چند روز پہلے سبز دستے والا پیپر نائف تمہاری میز سے غائب ہو گیا۔یہ بھی تو ممکن ہے کہ اسے کسی شخص نے دانستہ غائب کر دیا ہو......اور وہ شخص تمہارا کوئی دشمن بھی ہو سکتا ہے۔اس کی خواہش رہی ہو کہ تمہیں میڈم عالم آرا کے قتل کے جرم میں گرفتار کر لیا جائے۔تم نے ان امکانات پر تو غور کیا ہو گا؟''

''جی ہاں......!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔''میں نے بہت غور کیا ہے اس نقطے پر' اور حالات وواقعات کی روشنی میں اس کے نتیجے پر پہنچا ہوں کہ قاتل نے پہلے میری میز پر سے پیپر نائف غائب کیا' پھر اس کی مدد سے میڈم کو قتل کر دیا' لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آرہی کہ میرا دشمن آخر کون ہو سکتا ہے۔میرے تو سب کے ساتھ بہت اچھے دوستانہ تعلقات ہیں۔''

''تم اپنے کام سے کام رکھنے والے سیدھے سادے انسان ہو۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔



''تم جیسے لوگ چونکہ کسی کے دشمن نہیں ہوتے لہٰذا وہ دوسروں کو بھی اپنا دوست سمجھتے رہتے ہیں' اور انہی دوستوں میں سے کوئی دشمن بھی نکل آتا ہے۔''

وکیل استغاثہ نے اس موقع پر مداخلت ضروری سمجھی' اور جج کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔''یور آنر!اس بات کے امکانات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا' کہ ملزم نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت پہلے خود ہی پیر نائف غائب کیا تا کہ ''چوری'' کا تاثر ابھارا جا سکے اور بعد میں اسی پیپر نائف سے اپنے اس منصوبے کے آخری حصے پر عمل کرتے ہوئے میڈم عالم آرا کو قتل کر ڈالا' پھر وہ قیمتی جیولری اور نقدی لے کر جائے وقوعہ سے فرار ہو گیا۔''

''بہت خوب!'' میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔

''میرے فاضل دوست! آپ نے اپنے تئیں ایک کہانی بنانے کی کوشش کی ہے لیکن معذرت کے ساتھ کہوں گا کہ آپ کی یہ کوشش بری طرح ناکام رہی۔اس کہانی میں کوئی دم خم نہیں' ایک دم پھسپھسی اور جھول زدہ ہے۔مجھے اس کے بعض حصوں پر سخت اعتراض ہے۔''

''میں نے تو صرف حقائق پیش کیے ہیں۔'' وہ معاندانہ نظر سے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔''کہانیاں بنانا اور لکھنا آپ کا کام ہے۔سنا ہے' کسی مقامی ڈائجسٹ میں آپ کی تحریریں شائع ہوتی ہیں۔''

اس کے لہجے میں طنز کی بھرمار تھی۔میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔''وہ مقامی ڈائجسٹ اتنا مشہور ومقبول ہے کہ اگر آپ اس کا نام زبان پر لے آئیں گے تو آپ کا کچھ نہیں بگڑے گا۔''

''میں عدالت میں وکالت کرنے آتا ہوں۔'' وہ بے پروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔''مارکیٹنگ اور پبلسٹی میرا شعبہ نہیں۔''

اس نے مجھ پر ایک بھرپور چوٹ کرنے کی کوشش کی تھی۔میں نے تحمل سے اس کے وار کو روکا' اور معتدل لہجے میں اس سے پوچھا۔''کیا کبھی آپ کو میری کوئی کہانی پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے؟''

''میں ایک پریکٹیکل انسان ہوں' اور حقیقت کی دنیا میں سانس لیتا ہوں۔'' وہ بڑی

رعونت سے بولا۔ ''چٹ پٹی مسالے دار کہانیوں والے رسائل پڑھنے کے لیے میرے پاس فالتو وقت نہیں ہوتا۔ میں اپنا قیمتی وقت قانونی کتب کے مطالعے میں صرف کرتا ہوں۔''

''پھر تو آپ کی لاعلمی پر مجھے کوئی افسوس نہیں۔''

میں نے سادگی سے کہا۔

''جی......'' اس نے ناپسندیدہ انداز میں گھور کر مجھے دیکھا۔ ''کیا مطلب ہے آپ کا؟''

میں نے اپنے مطلب کی وضاحت میں کہا۔ ''میرے فاضل دوست! آپ نے آج تک چوں کہ مذکورہ ڈائجسٹ میں میری کوئی کہانی پڑھی نہیں' اس لیے حقائق سے آپ لاعلم ہیں۔ میں کوئی رائٹر وائٹر نہیں ہوں۔ میں اپنے کسی کہنہ مشق قلم کار سے اسے کہانی کی شکل میں لکھوا کر شائع کراتا ہوں۔''

''آپ کے ان معاملات سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' وہ ناگواری سے بولا۔

جج نے محسوس کیا کہ ہم اصل موضوع سے ہٹ رہے ہیں۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے استفساریہ لہجے میں بولا۔

''بیگ صاحب! آپ کو وکیلِ استغاثہ کے بیان کے بعض حصوں پر اعتراض تھا۔ اس بارے میں کچھ بتائیں؟''

میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا' اور ٹھہرے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ''جناب عالی! وکیل استغاثہ نے فرمایا ہے......ملزم نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت خود ہی اپنا پیپر نائف غائب کر دیا' تاکہ چوری کا تاثر پیدا ہو سکے۔

اس نے اپنے منصوبے کے مطابق میڈم عالم آرا کو قتل کیا' اور نقدی و قیمتی جیولری سمیٹ کر وہاں سے فرار ہو گیا' مجھے اس بیان کے دو حصوں ''سوچے سمجھے منصوبے'' اور ''فرار ہو گیا'' پر سخت اعتراض ہے۔''

میں لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا' ایک گہرا سانس خارج کیا' اور اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''جنابِ عالی! جیسا کہ معزز عدالت جانتی ہے' ملزم ایک تجربہ کار کاپی رائٹر ہے۔ کوئی کم عقل' بے وقوف اور جاہل انسان نہیں لہٰذا اس کا ''سوچا سمجھا منصوبہ'' اتنا



ناقص نہیں ہو سکتا کہ وہ آلہ قتل کے دستے پر اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کرنا بھول جائے۔ سوچے سمجھے منصوبے کی تعریف یہ ہوتی ہے' کہ اس میں ناکامی کے امکانات کو حتی الامکان ختم کر دیا جاتا ہے' نا یہ کہ اتنے سراغ چھوڑ دیے جائیں' جن کے سہارے پولیس آسانی سے منصوبہ ساز کو دبوچ لے۔ اس کے برعکس قاتل نے اسی ہوشیاری اور چالاکی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس نے اتنی احتیاط سے ملزم کا پیپر نائف چرایا کہ اس کے دستے پر موجود ملزم کے فنگر پرنٹس' انتہائی محفوظ رہے' جن کے سبب میرے مؤکل کو میڈم عالم آرا کا قاتل سمجھا جا رہا ہے۔ نمبر دو......'' میں ایک بار پھر متوقف ہوا' حاضرین عدالت پر ایک سرسری نظر ڈالی' اور پھر روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی! وقوعہ کے روز میرا مؤکل بالکل نارمل انداز میں دفتر سے رخصت ہوا تھا۔ اس کے وہاں سے جانے کو ''فرار ہونے'' کا نام دینا قطعی مناسب نہیں۔ اس امر سے استغاثہ کی بدنیتی ظاہر ہوتی ہے۔''

جج نے اثبات میں گردن ہلائی' پھر اپنے سامنے میز پر پھیلے ہوئے کاغذات کا جائزہ لینے لگا۔ میں نے دیکھا' اس نے اپنے قلم خاص کی مدد سے چند نوٹس بھی لیے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے گردن اٹھائی۔ پہلے دیوار گیر کلاک پر نگاہ ڈالی' پھر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔

''بیگ صاحب! آپ کی جرح مکمل ہو گئی یا آپ ملزم سے کوئی اور سوال کرنا چاہتے ہیں؟''

''بس......آخری سوال یور آنر!'' میں نے انگشت شہادت کو نمایاں کرتے ہوئے کہا۔

''نفیس احمد! تم نے بتایا ہے کہ وقوعہ سے چند روز قبل تمہارا پیپر نائف گم ہو گیا تھا' جو بعد ازاں قتل کی اس واردات میں استعمال ہوا۔ ذرا سوچ کر بتاؤ......ان چند روز کی حقیقت کیا ہے۔ دو روز' تین روز' چار روز؟''

وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا' پھر پُرسوچ انداز میں بولا۔

''وکیل صاحب! مجھے اچھی طرح یاد ہے میں نے بارہ جولائی کو میڈم سے ملنے کے لیے ان کے کمرے میں پرچی بھجوائی تھی۔ اگلی صبح جب میں اپنی نشست پر پہنچا' تو پیپر

نائف میری میز سے غائب تھا۔ میں نے اپنے کولیگز سے اس کے بارے میں پوچھا' لیکن کسی نے مثبت جواب نہ دیا۔ اس کے بعد میں نے جی ایم کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ ہمارے دفتر کی تمام خریداری جی ایم صاحب ہی کرتے ہیں۔ بس ورکرز انہیں اپنی ضروریات سے آگاہ کر دیتے ہیں۔ میڈم ان پر اندھا اعتماد کرتی تھیں۔ بہر حال......''

وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''جی ایم صاحب نے تھوڑی تاکید کے بعد مجھے نیا پیپر نائف دے دیا۔ اس پیپر نائف کا دستہ نیلے رنگ کا تھا۔''

جج بار بار دیوار گیر گھڑی کی جانب دیکھ رہا تھا' اور میں اس کے سبب سے واقف تھا۔ عدالت کا وقت ختم ہونے میں چند ہی منٹ باقی تھے' تاہم میں نے اپنا کام جاری رکھا' اور ملزم کی طرف دیکھتے ہوئے پُر خیال انداز میں کہا۔

''نفیس احمد! تم نے بارہ جولائی کو میڈم سے ملنے کے لیے اس کے کمرے میں ایک پرچی بجھوائی' اور تیرہ جولائی کی صبح تمہاری میز پر سے پیپر نائف غائب ہو گیا۔ حالانکہ تمہیں اچھی طرح یاد ہے' بارہ جولائی کو چھٹی کے وقت تم اسے اپنی میز پر چھوڑ گئے تھے۔ ہیں نا؟''

''جی ہاں...... آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے' بارہ جولائی شام چھ بجے سے تیرہ جولائی صبح گیارہ بجے کے دوران یہ پیپر نائف تمہاری میز پر سے غائب کیا گیا تھا' جس نے بعد میں آلۂ قتل کی صورت اختیار کر لی۔ سچویشن بتاتی ہے کہ پیپر نائف کو غائب کرنے میں دفتر ہی کے کسی آدمی کا ہاتھ ہے' جو تمہیں قتل کی اس واردات میں پھنسانے کا خواہاں ہے' اور عین ممکن ہے' میڈم عالم آرا کا قتل بھی اسی شخص نے کیا ہو......''

میں نے لمحاتی توقف میں معنی خیز نظر سے جج کی طرف دیکھا' پھر دوبارہ کٹہرے میں کھڑے ملزم کی جانب متوجہ ہو گیا

''نفیس احمد! تمہارے اس پروگرام سے اور کون واقف تھا کہ تم میڈم سے ملاقات کرنے اس کے کمرے میں جانے والے ہو؟''

''یہ بات صرف ایک ہی شخص کو پتا تھی۔'' اس نے الجھن زدہ لہجے میں جواب



دیا۔ ''جس کے ذریعے میں نے میڈم تک وہ پرچی پہنچائی تھی مگر......!''

''اس شخص کا نام بھی تو کوئی ہو گا؟'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''اکبر حیدر!'' نفیس نے جواب دیا۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔



آئندہ پیشی پر میں نے جج سے درخواست کی کہ میں اس مقدمے کے تحقیقاتی آفیسر سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔

کسی بھی کیس میں تفتیشی افسر یا انکوائری آفیسر کی حیثیت استغاثہ کے ایک گواہ جیسی ہوتی ہے' جسے ہر پیشی پر عدالت میں حاضر رہنا پڑتا ہے۔ اس مقدمے کا آئی۔ او (انکوائری آفیسر) رینک کے اعتبار سے ایک انسپکٹر تھا' اور اس کا نام جمشید غوری تھا۔

جج کے اشارے پر جمشید غوری گواہوں کے کٹہرے (وِٹنس باکس) میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اس کے بھاری جثے اور انداز واطوار سے سستی اور کاہلی جھلکتی تھی۔ میری سمجھ میں نہ آ سکا کہ وہ کسی مقدمے میں انویسٹی گیشن کیسے کرتا ہو گا۔

اس کی ماشاء اللہ ''مستعدی'' کو دیکھ کر تو یہی لگتا تھا' کہ اگر کوئی بچہ بھی اسے ''موٹا'' کہہ کر بھاگ جائے' تو وہ اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود بھی اس کی گرد پا کو نہیں پا سکتا۔

میں نے سرتاپا ''آئی او'' کو تنقیدی نظر سے دیکھا' اور سراہنے والے انداز میں کہا۔

''غوری صاحب! آپ کی پھرتی کو ماننا پڑے گا۔ اگر آپ کی جگہ کوئی اور تفتیشی افسر ہوتا' تو شاید دوسرے روز ہی وہ ملزم تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو پاتا۔''

''وکیل صفائی کی زبان سے ستائشی الفاظ سننے کی میرے کانوں کو عادت تو نہیں' الُ اس تعریف کا بہت بہت شکریہ۔''

وہ میرے لہجے میں شامل طنز کو اور میں اس کے الفاظ کی کاٹ کو بہ خوبی سمجھ رہا تھا' لہٰذا اِدھر اُدھر کی باتوں میں پڑے بغیر میں اصل موضوع کی طرف آ گیا۔ میں نے گہری سنجیدگی سے سوال کیا۔

"غوری صاحب! آپ کو اس واقعے کی اطلاع کس نے اور کب دی تھی؟"

"مقتول کے دفتر سے اس کے جنرل منیجر نے فون کیا تھا۔" آئی او نے جواب دیا۔

"لگ بھگ شام سات بجے۔"

"اور آپ جائے واردات پر کب پہنچے؟"

"ساڑھے سات بجے۔"

"آپ کی مستعدی واقعی باکمال ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ ساڑھے سات بجے جائے وقوعہ پر پہنچے اور ٹھیک نو بجے رات آپ ملزم کے گھر واقع سمن آباد پہنچ گئے۔ گھنٹے سوا گھنٹے میں آپ نے وقوعہ کی کارروائی کو نمٹا ڈالا۔ سمن آباد سے جب یہ پتا چلا کہ ملزم اپنی فیملی کے ساتھ حیدر آباد گیا ہے' تو آپ آناً فاناً میں حیدر آباد روانہ ہو گئے۔ یہ کارکردگی حیرت انگیز اور متاثر کن ہے۔"

میں نے بات ختم کرتے ہی ایک مرتبہ پھر سر سے لے کر پاؤں تک اس کا جائزہ لیا۔

وہ عام سے لہجے میں بولا۔ "میرے کام کرنے کا اسٹائل ایسا ہی ہے۔ اگر آپ کو اس پر حیرت ہو رہی ہے تو بھلا میں کیا کر سکتا ہوں۔"

"آپ بھلا...... یہ کریں۔" میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ بتائیں کہ آپ کو ملزم کا تعاقب کرنے کا خیال کیسے آیا؟"

"ملزم کے بارے میں ہمیں کمپنی کے جنرل منیجر سے بتایا تھا۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "جب ہم جائے وقوعہ پر پہنچے' تو جی ایم اظہر ندیم نے ہمیں واقعات کی تفصیل سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ تھوڑی دیر قبل ملزم' مقتولہ کے کمرے سے نکل کر گیا تھا۔ ہمارا پہلا شک اسی پر گیا' لہٰذا اپنی پوری کوشش کر کے ہم نے اسے گرفتار کر لیا' اور جب اس کی انگلیوں کے نشانات آلۂ قتل پر پائے جانے والے نشانات سے میچ کر گئے تو آگے کے معاملات ہمارے لیے آسان ہو گئے۔"

"اچھا یہ بتائیں' قاتل کے حوالے سے آپ کا پہلا شک میرے مؤکل پر ہی کیوں گیا' جب کہ وقوعہ پر اس وقت میرا مؤکل نہیں' بلکہ دوسرے دو افراد موجود تھے؟" میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔ "کیا محض اس لیے کہ میرے مؤکل کے ملزم ہونے کی نشان دہی جی



ایم اظہر ندیم نے کی تھی؟"

"ایسی بات نہیں ہے جناب!" وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ "جب میں جائے وقوعہ پر پہنچا' تو واقعی وہاں دو افراد موجود تھے۔ جنرل منیجر اظہر ندیم اور مقتول کا ایک ملاقاتی فہیم زبیری۔ میں نے ان دونوں کے بیانات بھی لیے تھے۔ ان دونوں افراد کے نام استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں موجود ہیں۔ جب وہ گواہی دینے کے لیے کٹہرے میں آئیں گے تو آپ ان پر جرح کر سکتے ہیں۔" وہ لمحے بھر کو تھما' ایک گہری سانس خارج کی' اور اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"بہرحال' میں نے ان دونوں کے بیانات کی روشنی میں لائحہ عمل ترتیب دیا' اور ملزم کی گرفتاری کے لیے سمن آباد اور بعدازاں حیدر آباد کا رخ کیا۔ بالآخر میں اسے اس کی سسرال سے پکڑنے میں کامیاب ہو گیا' اور اب وہ ایکیوزڈ باکس میں آپ کے سامنے کھڑا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"جب متذکرہ بالا افراد شہادت کے لیے عدالت تک پہنچیں گے' تو میں ان سے پوچھ تاچھ کر لوں گا۔ آپ فی الحال یہ بتائیں کہ ریمانڈ کی مدت کے دوران آپ کے تفتیشی ہتھکنڈوں کے نتیجے میں کیا ملزم نے اقبالِ جرم کر لیا تھا؟"

"نہیں جناب!" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ "یہ گرفتاری کے وقت سے لے کر اب تک جرم سے منکر ہے۔"

"آئی۔ او صاحب!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "استغاثہ کے مطابق پندرہ جولائی کی شام ملزم نفیس احمد نے اپنی مالکن میڈم عالم آرا کو قتل کیا' پھر اس کی قیمتی جیولری اور نقدی لے کر وہاں سے فرار ہو گیا۔ کیا آپ معزز عدالت کو قیمتی جیولری اور نقدی کی تفصیل سے آگاہ کرنا پسند فرمائیں گے؟"

"یہ تمام تر تفصیل استغاثہ کی رپورٹ میں موجود ہے' اور معزز عدالت اس سے بہ خوبی واقف ہے۔" وہ رُکھائی سے بولا۔

میں نے کہا۔ "میں آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں۔"

صرف عدالت ہی نہیں، بلکہ میں بھی اس تفصیل سے آگاہ ہوں، لیکن آپ اپنی زبان سے بیان کر دیں گے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہوگا۔ آپ اسے میری فرمائش سمجھ لیں۔"

"بھئی وکیل صاحب! آپ نے اب تک میری مستعدی اور کارکردگی کی اتنی زیادہ تعریف کر دی ہے کہ آپ کی یہ فرمائش پوری کرنا مجھ پر واجب ہو گیا ہے۔" وہ قدرے نرمی سے بولا۔ "نقد رقم تو تیس ہزار روپے ہے، اور جیولری کے ذیل میں ایک طلائی بریسلیٹ ہے، جس میں چھوٹے چھوٹے ڈائمنڈ جڑے ہوئے تھے، اور وائٹ گولڈ کا ایک پینڈنٹ جس میں پندرہ قیراط کا ایک کبوتر کی آنکھ جیسا سرخ یاقوت جڑا ہوا تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ جیولری مقتولہ کے جسم پر سجی تھی، اور نقدی اس کی میز کی دراز میں رکھی تھی۔"

"بتایا جاتا ہے......" میں نے اس کے کہے ہوئے الفاظ کو خود کلامی کے سے انداز میں دہرایا، پھر تیز لہجے میں دریافت کیا۔ "غوری صاحب! آپ کو یہ معلومات کہاں سے حاصل ہوئیں؟ کیوں کہ جب آپ جائے وقوعہ پر پہنچے تو میڈم عالم آرا کو قتل کرنے کے بعد زیور اور نقدی کو غائب کیا جا چکا تھا؟"

"مجھ تک یہ ساری معلومات جنرل منیجر اظہر ندیم کے توسط سے پہنچی تھیں۔" وہ بڑی رسان سے بولا۔ "نقدی کے بارے میں جی ایم اس لیے پُر یقین تھا کہ مقتولہ نے اسی کے ذریعے تیس ہزار کا ایک چیک کیش کرایا تھا۔ مقتولہ نے وہ رقم اس کے ہاتھ سے لے کر اپنی میز کی دراز میں ڈال دی تھی، اور جہاں تک قیمتی جیولری کا تعلق ہے، تو جب جی ایم مقتولہ کو زبیری صاحب کے فون کے بارے میں بتانے کے لیے اس کے کمرے میں پہنچا، تو اس نے پینڈنٹ کو اس کی گردن میں اور بریسلیٹ کو اس کی کلائی پر موجود پایا تھا۔"

"کیا آپ نے ملزم کے قبضے سے مذکورہ قیمتی جیولری اور تیس ہزار کی رقم برآمد کر لی ہے؟"

"نہیں جناب!" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "وہ ان اشیاء کی چوری سے منکر ہے۔"

"اور استغاثہ قتل کے علاوہ ان اشیاء کی چوری پر بھی مصر ہے؟"

"جی ہاں، واقعہ یہی ہے۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔



میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ "ملزم میڈم عالم آرا کے قتل سے منکر ہے۔ وہ قیمتی جیولری اور تیس ہزار کی رقم چوری کرنے سے انکاری ہے۔ مسروقہ مال برآمد کرانے میں آپ ابھی تک ناکام ہیں، تو کیا پھر...... محض اس لیے میرے مؤکل کو اس قاتل اور چور کی حیثیت سے کٹہرے میں کھڑا کیا گیا ہے کہ آلۂ قتل پر اس کی انگلیوں کے نشانات پائے گئے ہیں؟"

"جناب وکیل صاحب! آپ قانون دان ہیں۔" وہ الجھن زدہ نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "مجھے سخت حیرت ہے کہ آپ فنگر پرنٹس میچنگ کو انتہائی غیر اہم سمجھ رہے ہیں؟"

"ایسی بات نہیں ہے غوری صاحب!" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "میں ایک سادہ سی مثال کے ذریعے اپنا مؤقف واضح کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"جی...... جی...... ارشاد!" وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا، اور پُر اعتماد لہجے میں کہا۔

"فرض کریں، میں اپنی گاڑی کو کہیں پارک کر کے اپنے گھر چلا جاتا ہوں۔ ایک روز یا دو روز کے بعد میری گاڑی کسی سنگین واردات میں استعمال ہونے کے بعد آپ کے ہتھے چڑھ جاتی ہے۔ آپ گاڑی کے اسٹیئرنگ، ڈیش بورڈ، دروازوں کے ہینڈلز اور دیگر مختلف مقامات پر سے میرے فنگر پرنٹس حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اس صورت حال میں آپ کیا کریں گے؟"

"ہم سب سے پہلے واردات میں استعمال ہونے والی گاڑی کے مالک...... یعنی آپ کو تلاش کریں گے اور جب فنگر پرنٹس کی میچنگ ہو جائے گی تو آپ کو گرفتار کر کے شامل تفتیش کر لیا جائے گا، جیسا کہ زیرِ سماعت مقدمے میں ہوا ہے...... ویسے آپ استغاثہ کو مضبوط کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"مثال تو واقعی آپ نے بڑی عمدہ اور برمحل دی ہے۔"

میں نے تیز نظر سے انکوائری آفیسر کو گھورتے ہوئے کہا۔

"لیکن غوری صاحب! لگتا ہے آپ کے احساسات آپ کو سنگین نوعیت کا دھوکا دے

رہے ہیں۔آپ کوفوری طور پر کسی ماہرِ نفسیات سے رجوع کرنا چاہیے۔''

''کک......کیا مطلب ہے' آپ کا؟'' وہ برہمی سے بولا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔''میرے کہنے کا سیدھا سادہ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ تصویر کا ایک رخ دیکھ کر کوئی حتمی اندازہ قائم کر لیتے ہیں' اور اپنے سوا سب کو غلط سمجھتے ہیں' ان کی عقل اور احساسات پر ماتم ہی کیا جا سکتا ہے۔میں نے اپنی گاڑی کے حوالے سے تصویر کا ایک رخ آپ کو دکھایا' اور آپ نے دوسرے رخ پر نظر ڈالنے کی زحمت کیے بغیر ایک فتویٰ صادر کر دیا۔

''دوسرا رخ......'' وہ زیرِ لب بڑبڑایا' پھر خفگی آمیز انداز میں مستفسر ہوا۔''آپ کے خیال کے مطابق' اس تصویر کا دوسرا رخ کیا ہوسکتا ہے؟''

''یہ آپ نے ایک معقول سوال کیا ہے غوری صاحب!' میں نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔''اس تصویر کا پہلا رخ تو یہ تھا کہ میری گاڑی کسی سنگین واردات میں استعمال ہونے کے بعد پولیس کے ہتھے چڑھ گئی۔پولیس ٹریس کرتے ہوئے مجھ تک پہنچی' اور فنگر پرنٹس میچنگ کے بعد مجھے اس واردات کا ذمے دار قرار دیتے ہوئے گرفتار کر لیا۔

ایم آئی رائٹ؟''

''ٹھیک ہے......لیکن یہ بات آپ پہلے بھی بتا چکے ہیں۔'' وہ بیزاری سے بولا۔''میں اس تصویر کے دوسرے رخ کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں؟''

''دوسرا رخ یہ ہے غوری صاحب!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسے مخاطب کیا' پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔''جیسا کہ میں نے پہلے رخ کے بیان کی ابتداء میں بتایا ہے......میں اپنی گاڑی کو کہیں پارک کر کے اپنے گھر چلاتا ہوں۔دوسرے رخ کے مطابق' اگلی صبح میں جا کر دیکھتا ہوں تو میری گاڑی پارکنگ ایریا پر نظر نہیں آتی۔میں ادھر ادھر موجود لوگوں سے اپنی گاڑی گمشدگی کے بارے میں پوچھ تاچھ کرتا ہوں' لیکن کسی کو بھی معلوم نہیں کہ میری گاڑی کہاں غائب ہوگئی۔اس صورت حال سے میں اسی نتیجہ پر پہنچتا ہوں کہ کسی گاڑی چور نے موقع پا کر میری گاڑی پار کر دی ہے۔

میں اپنی گاڑی کی چوری کی رپورٹ متعلقہ تھانے میں درج کروا دیتا ہوں' اور گھر



آجاتا ہوں۔اس واقعے کے ایک روز یا دو روز یا تین روز بعد میری گاڑی کسی سنگین واردات میں استعمال ہونے کے بعد آپ کے محکمے کے ہتھے چڑھ جاتی ہے۔چوری ہونے سے پہلے' وہ چونکہ میرے استعمال میں رہی تھی' لہٰذا' اس کے اسٹیئرنگ' ڈیش بورڈ' دروازوں اور دیگر مختلف مقامات پر میری انگلیوں کے نشانات بھی ملیں گے۔کیا اس صورت میں بھی پولیس کھوجتی ہوئی مجھی تک پہنچے گی' اور مجھے اس سنگین واردات کا ذمے دار ٹھہرائے گی؟''

وہ الجھ کر رہ گیا' پھر متاملانہ انداز میں بولا۔''یہ صورت حال قدرے مختلف ہو گی۔پولیس تفتیش کے دوران کھوج لگاتے ہوئے آپ تک تو ضرور پہنچ سکتی ہے' لیکن آپ چوں کہ اپنی گاڑی کی گمشدگی کی رپورٹ درج کروا چکے ہیں' لہٰذا آپ کو سردست اس سنگین واردات کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جائے گا۔''

''پھر......پھر......اس سچویشن میں پولیس کی سوچ کا زاویہ کیا ہو گا؟'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

''پولیس یہی سوچے گی کہ کسی نے آپ کی گاڑی کو چوری کرنے کے بعد اس واردات میں استعمال کیا ہے۔'' آئی۔او جمشید غوری نے جواب دیا۔''پولیس اپنی ضروری کارروائی کرنے کے بعد گاڑی آپ کے حوالے کر دے گی۔''

''یعنی مجھے موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جائے گا؟''

''بالکل نہیں!'' وہ قطعی لہجے میں بولا۔

''تھینک یو مائی ڈیئر انسپکٹر جمشید غوری صاحب!'' میں نے ایک گہری' اطمینان بخش سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔پھر روئے سخن جج کی جانب موڑ لیا۔

''جناب عالی! اس کیس کے تفتیشی افسر نے ایک بہت بڑا مسئلہ حل کر دیا۔میں نے اپنی گاڑی کی چوری کی جو مثال معزز عدالت میں پیش کی' اس تصویر کا دوسرا رخ اس کیس کی عکاسی کرتا ہے......''

میں لمحے بھر کو سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا' پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔''یور آنر! حالات و واقعات کے مطابق بارہ جولائی کی شام چھٹی کے وقت ملزم اپنے زیرِ استعمال پیپر نائف کو میز پر چھوڑ کر معمول کے مطابق گھر چلا گیا۔اگلی صبح یعنی تیرہ

جولائی کو جب وہ آفس پہنچا' تو پیپر نائف کو اپنی میز پر سے غائب پایا۔اس نے اپنے ساتھ کام کرنے والوں سے پوچھ گچھ کی' لیکن ان میں سے کوئی بھی گمشدہ پیپر نائف کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔وہ اس واقعے کی رپورٹ درج کرانے اپنے آفس کے تھانے دار (جی ایم اظہر ندیم) کے پاس پہنچ گیا۔کیس رجسٹرڈ کر لیا گیا' یعنی پیپر نائف کی چوری ریکارڈ پر آ گئی۔ملزم کو جی ایم صاحب نے کام کرنے کے لیے نیلے دستے والا نیا پیپر نائف دے دیا' اور بات آئی گئی ہو گئی۔اب......"

میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا' حاضرینِ عدالت پر ایک طائرانہ سی نگاہ ڈالی' اور دوبارہ جج کی طرف متوجہ ہو گیا۔"جنابِ عالی!" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اب ......دو روز بعد یعنی پندرہ جولائی کی شام چھ اور سات بجے کے دوران میں گمشدہ پیپر نائف کی مدد سے مقتول عالم آرا کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے' اور محض فنگر پرنٹس میچنگ کی بنا پر میرے موکل کو قتل کے الزام میں گرفتار کر کے حوالۂ عدالت کر دیا جاتا ہے' جب کہ وقوعہ سے دو روز قبل وہ اپنے پیپر نائف کی چوری یا گمشدگی کی رپورٹ درج کرا چکا تھا۔اصولی طور پر تو پولیس کو چاہیے تھا' وہ پہلے اس شخص کا سراغ لگاتی' جس نے ملزم کا پیپر نائف چوری کیا تھا۔

وہ شخص زیادہ بہتر طور پر بتا سکتا تھا' کہ میڈم عالم آرا کے قتل کی مسٹری اور ہسٹری کیا ہے......معزز عدالت کے رُوبرو ابھی آئی۔او صاحب نے تفتیشی اصولی بڑے واضح الفاظ میں بیان کیا ہے' جس کی رُو سے کسی بھی صورت میرے موکل کو قتل کی اس واردات میں ملوث نہیں کیا جا سکتا۔کمال تو یہ ہے کہ آئی او صاحب نے جو اصول بیان کیا ہے' اس کیس میں وہ خود ہی اس کی خلاف ورزی کرتے دکھائی دے رہے ہیں۔

صرف اس بنا پر میرے موکل کو موردِ الزام ٹھہرانا قطعی زیادتی والی بات ہو گی' کہ واردات میں جو پیپر نائف استعمال ہوا' اس کے دستے پر اس کی انگلیوں کے نشانات پائے گئے ہیں۔

صرف اس ایک کلیو کے بل بوتے پر میرے موکل کو ملزموں والے کٹہرے میں لا کھڑا کرنا' انصاف کے اصولوں کے منافی ہے' جنابِ عالی لہٰذا......میں معزز عدالت سے پرزور



استدعا کرتا ہوں کہ پولیس کو اس بات کا پابند کیا جائے کہ وہ پہلے پیپر نائف چور کا سراغ لگائے۔اسے تفتیش کی چکی میں پیسے' اس کے بعد نیا چالان پیش کرے۔میں بڑے دکھ اور افسوس کے ساتھ یہ ضرور کہوں گا' کہ اس کیس کی انویسٹی گیشن کے سلسلے میں پولیس نے جانب داری سے کام لیا ہے' اور میرے مؤکل کو ایک آسان شکار سمجھ کر قربانی کا بکرا بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ویٹس آل یور آنر!"

اِدھر میں نے اپنا بیان ختم کیا' اُدھر وکیل استغاثہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا' اور رد دلائل کے طور پر اس نے بہ آواز بلند کہا۔

"یور آنر! میرے فاضل دوست نے اپنے مؤکل کو بچانے کے لیے جو نکتہ نکالا ہے' موجودہ کیس میں اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ملزم ایسا سیدھا سادہ اور معصوم ہے نہیں' جیسا کہ وہ اس وقت نظر آ رہا ہے۔اس نے نہایت ہی چالاکی اور ہوشیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے' پیپر نائف کو خود ہی غائب کر کے اس کی چوری کا ڈرامہ رچایا' تاکہ ازاں بعد شک کے تیر اس کی جانب رخ نہ کریں۔اس ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے اس نے فوری طور پر جی ایم کو پیپر نائف کی گمشدگی کے بارے میں بتایا' تاکہ سند رہے اور بہ وقت ضروری کام آئے۔جیسا کہ......اس وقت ہو رہا ہے۔"

وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا' ایک گہری سانس خارج کی اور اپنے اعتراض کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"ملزم کی عیاری اور منصوبہ بندی نے قدم قدم پر اس کا ساتھ دیا' اور اپنے پروگرام کے مطابق وہ مقتول کو قتل کرنے کے بعد اس کی قیمتی جیولری اور نقدی لے کر جائے وقوعہ سے غائب ہو گیا......اور جنابِ عالی! میں ایک اور حیرت انگیز بات بھی عدالت کے علم میں لانا چاہتا ہوں' جس سے ملزم کے شاطر اور منصوبہ ساز ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔"

اتنا کہہ کر وکیل استغاثہ ڈرامائی انداز میں خاموش ہوا' معاندانہ اور طنزیہ انداز میں اس نے میری طرف دیکھا' پھر جج کی جانب رخ پھیرتے ہوئے بولا۔

"جنابِ عالی! ملزم نے اپنی پلاننگ کے مطابق بارہ جولائی سہ پہر چار بجے مقتول سے ملاقات کے لیے مسٹر اکبر حیدر کے توسط سے ایک پرچی مقتول کے کمرے میں

بھجوائی۔

وہ پرچی ثبوت کے طور پر عدالت میں اس لیے پیش نہیں کی جا سکتی، کہ مقتول نے پڑھنے کے بعد اس پرچی کو پھاڑ کر حوالۂ ڈسٹ بن کر دیا تھا۔ بہر حال، حالات وواقعات کی روشنی میں یہ نظر آتا ہے کہ مذکورہ پرچی میں ملزم نے مقتول سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔'' لمحے بھر کو رک کر وکیل استغاثہ نے اکیوزڈ باکس میں کھڑے نفیس احمد کی طرف دیکھا اور کڑے انداز میں اس سے سوال کیا۔

''میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں؟''

''آپ بالکل درست فرما رہے ہیں وکیل مخالف صاحب!'' نفیس نے بے خوف اور مضبوط لہجے میں کہا۔ ''میں نے مذکورہ پرچی میں لکھا تھا...... میڈم! میں اپنے ایک ذاتی ضروری کام کے سلسلے میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں لہٰذا آپ اپنے قیمتی وقت میں سے چند منٹ میرے لیے نکال لیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔''

''دیکھا جنابِ عالی!'' وکیل استغاثہ نے پُرجوش انداز میں کہا۔ ''ملزم اپنے کسی ضروری کام سے مقتول سے ملاقات کا خواہاں تھا، لیکن اگلے ہی روز سے...... بلکہ اسی روز بارہ جولائی سے اس نے مقررہ وقت سے چند منٹ پہلے دفتر سے چھوٹنا شروع کر دیا...... بارہ تو نہیں البتہ تیرہ اور چودہ جولائی کو مقتول نے چھٹی سے تھوڑی دیر پہلے جب اسے اپنے پاس طلب فرمایا، تو پتا چلا لاٹ صاحب کام سمیٹ کر گھر جا چکے ہیں۔ اس نے اپنے منصوبے کے مطابق پندرہ جولائی کو مقتول پر وار کرنا تھا۔ لہٰذا اس سے پہلے یہ دستیاب نہ ہو سکا......''

وکیلِ استغاثہ بالکل ایک نیا ایشو لے کر آیا تھا۔ یہ بات میرے علم میں نہیں تھی، کہ پندرہ جولائی سے پہلے یعنی چودہ اور تیرہ جولائی کو بھی مقتول نے میرے مؤکل کو اپنے کمرے میں بلانے کی کوشش کی تھی۔ نفیس احمد نے مجھ سے ایسا کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا، اس کا واضح مطلب یہی تھا، کہ ملزم کو بھی اس ''بلاوے'' کی کوئی خبر نہیں تھی۔ وکیلِ استغاثہ لمحے بھر کو تھما تو میں نے تیز لہجے میں اس سے استفسار کیا۔

''میرے فاضل دوست! آپ کے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ تیرہ اور چودہ



جولائی کو مقتول نے ملزم کو اپنے پاس بلایا تھا؟''

''سب سے بڑا ثبوت وہ شخص ہے، جس کے توسط سے ملزم نے مقتول کے کمرے میں پرچی بھجوائی تھی...... یعنی، اکبر حیدر!'' وکیلِ استغاثہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں اکبر حیدر کا نام شامل ہے۔ آپ اس حوالے سے گواہ سے پوچھ سکتے ہیں۔''

''لل...... لیکن...... اکبر حیدر صاحب نے مجھے تو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔'' نفیس احمد بے ساختہ بول اٹھا۔

''اور...... یہ کہ میں بارہ، تیرہ، چودہ جولائی کو چھ بجے سے ایک منٹ بھی پہلے آفس سے نہیں نکلا...... مجھے تو انتظار تھا۔ کب میڈم اپنے پاس بلاتی ہیں!''

''معصومیت، سادگی، بے خبری اور بے گناہی کی یہ ایکٹنگ عدالت میں کوئی رنگ نہیں جما سکے گی نفیس احمد!''

وکیلِ استغاثہ زہریلے لہجے میں بولا۔ ''معزز عدالت کی آنکھوں میں دھول جھونکنا کوئی آسان کام نہیں۔''

پھر وہ دوبارہ جج کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

''یور آنر! وکیل صفائی کی مداخلت نے گڑبڑ کر دی...... ہاں تو میں آپ کو ملزم کی عیاری اور چال بازی کے بارے میں بتا رہا تھا۔'' اس نے رک کر ایک گہری سانس لی پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''جنابِ عالی! جیسا کہ میں نے بتایا، ملزم نے اپنے منصوبے کے آخری حصے پر عمل کرنے کے لیے پندرہ جولائی کی سہ پہر مقتولہ سے ملاقات کی درخواست کی۔ تیرہ جولائی کی صبح اس نے اپنا پیپر نائف غائب کر دیا۔ تیرہ اور چودہ جولائی کو وہ مقررہ وقت سے تھوڑی دیر پہلے ہی سیٹ سے اٹھ گیا۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ مقتول دوپہر میں آفس آتی تھی، اور اپنے اسٹاف کے افراد سے وہ پانچ بجے کے بعد ہی ملاقات کرتی تھی۔ ملزم اپنے منصوبے کے مطابق ایک ایک انچ آگے سرکتا رہا، اور بالآخر اس نے اپنا مقصد حاصل کر لیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ دو دن کے لیے حیدر آباد چلائے گا، تو کسی کا

دھیان اس کی طرف نہیں جائے گا۔اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ پولیس راتوں رات اس کی گردن ناپنے کے لیے حیدرآباد پہنچ جائے گی۔''

وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوا' پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''یور آنر! ملزم نے ایک سنگین اور خطرناک جرم کا ارتکاب کیا ہے' لہٰذا یہ کسی قسم کی رورعایت کا مستحق نہیں ہوسکتا۔دیٹس آل یور آنر!''

''ویل ڈن......بہت خوب......''وکیل استغاثہ کے خاموش ہونے پر میں نے استہزائیہ انداز میں کہا'میرا مؤکل اور اس کیس کا ملزم نفیس احمد ایک مکار'عیار'چالاک'شاطر اور منصوبہ ساز شخص ہے'اس نے مضبوط پلاننگ کے ذریعے ایک سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے۔اس کی منصوبہ بندی بے داغ رہی ۔اس نے اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے ایک ایک قدم نہایت ہی مہارت اور تجربہ کاری سے پھونک پھونک کر رکھا' اور بالآخر وہ سب کچھ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا' جس کی اس نے خواہش کی تھی......لیکن یہی شاطر اور چالاک پلان میکر پیپر نائف کے دستے پر سے اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کرنا بھول گیا' جس کے سبب وہ آج ایک مجرم کی حیثیت سے کٹہرے میں کھڑا نظر آرہا ہے۔

میرے فاضل دوست! یہ تھیوری آپ کی پیش کردہ ہے' جو ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ نے معزز عدالت کے رُوبرو بیان کی ہے۔آپ سے میرا صرف ایک سوال ہے دوست......!''

میں نے وکیلِ استغاثہ کی جانب انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔

''آپ نے میرے مؤکل کی جو متعدد منفی خصوصیات بیان کی ہیں' ان کی صرف ایک ہی حرکت سے نفی ہوجاتی ہے' یعنی اس نے آلۂ قتل پر سے اپنے فنگر پرنٹس صاف نہ کرکے جو غلطی کی ہے۔آپ کے فلسفے کے مطابق' اگر اس نے خود ہی پیپر نائف غائب کیا تھا' تو اس کو استعمال......میرا مطلب ہے' مقتولہ کو قتل کرنے کے لیے استعمال کرنے سے پہلے یا قتل کے بعد اس کے دستے پر سے اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کرنا اسے نہیں بھولنا چاہیے تھا......خاص طور پر اس لیے بھی کہ ایک عیار اور مشاق مجرم ہے' جس نے آپ کے





مطابق بڑی منصوبہ بندی سے اپنا مقصد حاصل کیا۔کیا آپ معزز عدالت کے رُوبرو یہ بتانا پسند کریں گے کہ ایک تجربہ کار پلان میکر اتنی اہم بات کیسے بھول گیا؟''

اس نے جزبز ہوکر جج کی جانب دیکھا' پھر متاملانہ انداز میں بولا۔''میرے فاضل دوست! ملزم سے تو جو بھول ہوئی سو ہوئی' آپ بھی مجرموں کی نفسیات کے حوالے سے ایک اہم نکتہ فراموش کیے بیٹھے ہیں۔''

''ارشاد......!''میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔''میں ہمہ تن گوش ہوں۔آپ وہ اہم نکتہ بیان فرمائیں؟''

وہ کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے فخریہ لہجے میں بولا۔

''ذہین سے ذہین مجرم بھی کوئی نہ کوئی ایسی غلطی ضرور کرتا ہے' جس پر اگر قانون کی نظر پڑ جائے' تو پھر اس مجرم تک رسائی حاصل کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی......آپ کے مؤکل سے بھی یہ غلطی ہوئی۔!''وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔''میرا خیال ہے' آپ میری بات اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے۔''

میں نے سر کو اثباتی جنبش دی' چہرے پر مصنوعی گمبھیرتا طاری کی' اور ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔''بہت بہت شکریہ میرے فاضل دوست! ایسی نادر معلومات فراہم کرنے کے لیے میں آپ کا احسان مند ہوں۔''

ہماری اس بحثا بحثی کے دوران جج دو تین مرتبہ نگاہ اٹھا کر دیوار گیر کلاک کو دیکھ چکا تھا۔ہمارے کیس کی سماعت آج خاصی دیر سے شروع ہوئی تھی' اور اس وقت مقررہ وقت ختم ہونے میں بس چند منٹ ہی رہ گئے تھے' اور اس قلیل مدت میں کسی اور گواہ کا بیان نہیں ہوسکتا تھا۔جج نے سوالیہ نظر سے میری جانب دیکھا اور پوچھا۔

''مسٹر بیگ! آپ کو اور کچھ پوچھنا ہے؟''

''نہیں' جنابِ عالی!''میں نے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔

''میں جو اہم پوائنٹ ریز کرنا چاہتا تھا' اس میں صدفی صد کامیاب رہا ہوں!''

جج نے فارمیلیٹی پوری کرنے کے لیے وکیلِ استغاثہ سے بھی پوچھ لیا۔''وکیل صاحب! کیا آپ کسی گواہ کو بیان کے لیے پیش کرنا چاہتے ہیں؟''

"نو سر!" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "اب اتنا وقت نہیں ہے کہ کسی گواہ کا حلفیہ بیان ہی ریکارڈ کیا جا سکے۔"

"او کے......!" جج نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔ "دی کورٹ از ارجارنڈ!"

اگلی پیشی دس روز بعد کی تھی۔



جب عدالت میں کسی کیس کی باقاعدہ سماعت شروع ہو جاتی ہے' تو پھر وقت گزرنے کا بالکل احساس نہیں ہوتا۔

عدالتی کارروائی دلچسپ اور سنسنی خیز انداز میں آگے بڑھتی ہے' اور ایک کے بعد دوسری تاریخ پڑتی رہتی ہے۔ ہمارے ساتھ بھی کچھ اسی قسم کی صورت حال تھی۔ پتا ہی نہ چلا اور دس دن پر لگا کر اڑ گئے۔

تاہم اس دوران وقار حسین مسلسل میرے رابطے میں رہا تھا۔ ملزم کا یہ سالا' جیسا کہ میں نے پہلے بھی بتایا ہے' بہت ہی ہوشیار اور زمانہ ساز قسم کا شخص تھا۔ میں نے اسے' جو بھی کام سونپا' اس نے کر کے دکھایا' اب تک کی کامیاب کارروائی میں اس کا بھی بڑا حصہ تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ کورٹ میں قانونی کارکردگی میں دکھا رہا تھا' لیکن اس کارکردگی کو مؤثر اور یقینی بنانے کے لیے مجھے وقار حسین کا بھرپور تعاون حاصل تھا۔ میں نے اسے استغاثہ کے گواہوں کی فہرست دے دی تھی' اور وہ ان کے بارے میں ایسی ایسی چونکا دینے والی حقیقتیں کھوج کھوج کر لا رہا تھا' جو عدالتی کارروائی کے دوران میں' اپنے مؤکل کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے بڑے طریقے سلیقے سے استعمال کر رہا تھا۔ یہ ایک اطمینان بخش اور خوش آئند صورت حال تھی۔

جب سے یہ کیس میرے ہاتھ میں آیا تھا' ملزم کی بیوی شازیہ سے میری ایک دو ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ ملزم کی طرف سے مکمل طور پر وقار حسین ہی ڈیل کر رہا تھا' جو حیدرآباد میں اپنا وڈیو کا کاروبار چھوڑ کر کئی دن سے یہاں کراچی ہی میں پڑا ہوا تھا' اور سب سے اچھی بات یہ تھی کہ میں اس کے کام اور کارکردگی' ملزم کے لیے خلوص اور ہمدردی سے بہت



متاثر ہوا تھا۔ وقار حسین کے خلوص اور کردار کو دیکھ کر دل سے یہی دعا نکلتی تھی۔

"اللہ ہر معقول انسان کو اس جیسا سالا عطا فرمائے۔"

آئندہ پیشی پر استغاثہ کی جانب سے سب سے پہلے فہیم زبیری کو گواہی کے لیے پیش کیا گیا۔ مسٹر زبیری کا تعلق مارکیٹنگ کے شعبے سے تھا۔ اس کی عمر پینتالیس اور پچاس کے درمیان رہی ہو گی۔ وہ بھاری تن و توش کا مالک ایک دراز قامت شخص تھا۔ اس کی شخصیت میں ایک خاص قسم کی کشش اور وقار پایا جاتا تھا۔ مارکیٹنگ سے متعلق افراد کو ایسی ہی متاثر کن شخصیت کا مالک ہونا چاہیے۔ زبیری نے اپنے چہرے پر نظر کا چشمہ لگا رکھا تھا۔

زبیری وٹنس باکس میں پہنچا' اس نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا' پھر اپنا مختصر سا بیان ریکارڈ کروا دیا۔ یہ بیان بعینہ ویسا ہی تھا' جو وہ اس سے پہلے جائے وقوعہ پر پولیس کو دے چکا تھا۔ بیان مکمل ہوا تو وکیل استغاثہ جج کی اجازت حاصل کر کے کٹہرے کے قریب پہنچ گیا۔

"زبیری صاحب!" وکیل استغاثہ نے جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کو یقیناً میڈم عالم آرا کی موت کا بڑا دکھ ہوا ہو گا' کیونکہ آپ کے مقتول کے ساتھ بڑے خوش گوار مراسم تھے۔"

"جی ہاں' آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولا۔

"ایڈورٹائزنگ اور مارکیٹنگ تقریباً ملتے جلتے شعبے ہیں' اور ان میں اکثر و بیشتر ایک دوسرے سے کام پڑتا رہتا ہے۔

میڈم عالم آرا سے میرے مراسم کی مدت لگ بھگ پانچ سال ہے' جب اس نے "ایروایڈورٹائزرز" کا آغاز کیا تھا۔ شروع کے دو تین سال یہ کمپنی خاطر خواہ چل نہیں سکی۔ اس میں عالم آرا کی ناتجربہ کاری کے علاوہ فوری فیصلوں کا بھی خاصا عمل دخل رہا تھا' لیکن جب سے اس نے مجھ سے مشورہ کرنا شروع کیا' کام میں بہتری آنے لگی' اور پچھلے ایک سال سے تو ماشاء اللہ یہ کمپنی گولی کی رفتار سے دوڑ رہی ہے۔ جو لوگ کاروباری لحاظ سے ایروایڈورٹائزرز سے پیچھے رہ گئے ہیں' وہ اس کی روز افزوں ترقی کو رشک سے نہیں

بلکہ حسد کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔“

”وقوعہ کے روز بھی آپ مقتولہ سے ملنے اس کے آفس گئے تھے؟“

”جی ہاں' گیا تھا۔“ فہیم زبیری نے جواب دیا۔

”تو کیا اس روز آپ کی مقتولہ سے ملاقات ہوگئی تھی؟“

”ہاں' ہوئی تھی!“ وہ سر کو اثباتی جنبش دے کر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”لیکن یہ ملاقات محض ایک ”آمنا سامنا“ پر مشتمل تھی' جس میں ایک جیتے جاگتے انسان یعنی میں نے ایک مردے یعنی عالم آرا سے مختصر سا آمنا سامنا کیا تھا۔ آپ اسے ایک ”ملاقات“ بھی کہہ سکتے ہیں۔“

”آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جب آپ ملاقات کے لیے مقتول کے کمرے میں پہنچے تو وہ زندگی سے کوسوں دور موت کی وادی میں پہنچ چکی تھی؟“ وکیل استغاثہ نے کراری آواز میں پوچھا۔

”جی ہاں' میرے کہنے کا یہی مطلب ہے۔“ فہیم زبیری نے اثبات میں جواب دیا۔

”جب میں نے عالم آرا کے کمرے میں قدم رکھا' تو وہ زندگی کی قید سے آزاد ہو چکی تھی۔ وہ اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھی ہوئی تو دکھائی دی' لیکن اس طرح کہ اس کا جسم بڑے تکلیف دہ انداز میں مڑا ہوا تھا' گردن ایک جانب ڈھلکی ہوئی تھی' اور سینے میں عین دل کے مقام پر ایک چاقو دستے تک پیوست تھا...... سینے سے نکلنے والے تازہ تازہ خون نے اس کے لباس کو بھی آلودہ کر دیا تھا۔“

”پھر...... پھر آپ نے کیا کیا؟“ وکیل استغاثہ اضطراری لہجے میں بولا۔ ”ایسی خوف ناک صورت حال کو دیکھ کر آپ نے کیا قدم اٹھایا تھا؟“

”میں عالم آرا کو اس سنگین صورت حال میں دیکھ کر پریشان ہو گیا۔“ گواہ نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”اسی پریشانی میں' میں جی ایم اظہر کے پاس پہنچا' اور اسے عالم آرا کی حالت کے بارے میں بتایا۔ وہ میرے ساتھ عالم آرا کے کمرے میں پہنچا' اور اس کی لاش کو کرسی پر موجود دیکھ کر فکر مند ہو گیا۔ اسی فکر مندی میں جی ایم کی زبان سے بے ساختہ نکلا' ابھی تھوڑی دیر پہلے تک تو میڈیم ٹھیک ٹھاک تھیں۔ چند منٹ پیشتر نفیس ان سے مل کر



گیا ہے......! میں نے اس خطرناک صورت حال کے پیش نظر جی ایم کو مشورہ دیا' کہ وہ فوری طور پر پولیس کو اس واقعے سے آگاہ کر دے۔ میری بات اظہر ندیم کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے پہلے پولیس اسٹیشن فون کر کے قتل کی اس واردات کے بارے میں اطلاع دی' پھر عالم آرا کی ضعیف والدہ' جہاں آرا کو اس کی رہائش گاہ پر فون کر دیا۔

پولیس والے جہاں آرا سے پہلے وہاں پہنچ گئے اور آتے ہی قانونی کارروائی میں مصروف ہو گئے۔“

وکیل استغاثہ نے مزید دو چار سوالات کے بعد گواہ کو فارغ کر دیا۔ میں اپنی باری پر جج کی اجازت پا کر وٹنس باکس کے قریب پہنچ گیا۔ چند لمحات تک میں ٹٹولتی ہوئی نظر سے استغاثہ کے گواہ کو گھورتا رہا۔ وہ میرے اس ”دیکھنے“ سے ذرا سا بھی نروس نہیں ہوا' جس سے اندازہ ہوا کہ وہ اندر سے کھوکھلا نہیں' بلکہ بھرا ہوا ہے۔ میں نے سلسلۂ سوالات کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

”زبیری صاحب! جیسا کہ وکیل استغاثہ کی جرح کے جواب میں آپ نے بتایا ہے' گزشتہ پانچ سال سے مقتول کے ساتھ بڑے خوش گوار کاروباری تعلقات رہے ہیں۔ یعنی مقتولہ کے لیے آپ کا کردار ایک سچے خیر خواہ کا ابھر کر سامنے آتا ہے' اسی لیے آپ کو مقتول کی موت کا دلی صدمہ بھی ہوا۔

میں کچھ غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں؟“

”نہیں وکیل صاحب!“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”آپ تو میرے محسوسات اور جذبات کی ترجمانی کر رہے ہیں۔“

”ٹھیک ہے' اب میں آپ کے محسوسات کی گہرائی میں جاتا ہوں۔“ میں نے معتدل لہجے میں کہا۔ ”آپ نے وکیل سرکار کو یہ بھی بتایا ہے کہ ”ایرو ایڈورٹائزرز“ نے شروع کے دو تین سال میں کوئی خاصہ کارنامہ انجام نہیں دیا' بلکہ اس کی کارکردگی اوسط سے بھی بہت نیچے رہی تھی' لیکن ناتجربہ کار عالم آرا نے جب آپ کی مشاورت سے فیض اٹھانا شروع کیا تو اس کا بزنس رن دگنی رات چوگنی ترقی کرتا چلا گیا' اور اب وہ عروج پر تھا۔ آپ سے میرا سوال یہ ہے کہ جب آپ کے پانچ سال سے مقتولہ کے ساتھ بڑے مخلصانہ تعلقات تھے'

تو آپ نے ابتداء ہی سے اسے اپنے قیمتی مشوروں سے کیوں نہیں نوازا تھا؟''

''دیکھیں وکیل صاحب!'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''ہر شخص کا اپنا اپنا اسٹائل ہوتا ہے۔ میری ہمیشہ سے یہ عادت رہی ہے کہ اس وقت تک میں کسی کے معاملات میں دخل نہیں دیتا' جب تک وہ خود مجھ سے نہ کہے یعنی...... مجھ سے کوئی صلاح مشورہ نہ مانگے۔ مقتولہ کے سلسلے میں بھی کچھ اسی نوعیت کے حالات رہے تھے۔''

''اسٹائل اور عادت کی حقیقت سے تو انکار ممکن نہیں۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن جہاں سنجیدہ' مخلصانہ اور خوشگوار تعلقات پائے جاتے ہوں' وہاں اپنے تعلق دار کا نقصان اور ناکامیابی کو دیکھ کر اپنے اسٹائل اور عادت کو تبدیل کرنے میں کوئی حرج نہیں ہوتا۔

''اینی ہاؤ......!'' میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر ایک گہری سانس لی' پھر گواہ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''زبیری صاحب! وقوعہ کے روز جب آپ مقتول کے کمرے میں پہنچے تو وہ زندگی کو خدا حافظ کہہ چکی تھی۔ آپ نے اسے مردہ حالت میں اپنی کرسی پر ''بیٹھے'' ہوئے دیکھا۔ آپ کے بیان کے مطابق اس کے سینے میں عین دل کے مقام پر ایک چاقو دستے تک دھنسا ہوا تھا۔ کیا اب بھی آپ کا یہی خیال ہے کہ مقتول کو ایک چاقو کی مدد سے قتل کیا گیا تھا؟''

''وہ میری بصارت کا پہلا تاثر تھا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''پہلی نظر میں وہ مجھے ایک چاقو ہی لگا تھا۔ سبز دستے والا چاقو لیکن...... پھر تھوڑی ہی دیر کے بعد یہ بات میرے علم میں آ گئی کہ وہ کوئی چاقو نہیں' بلکہ کاغذ کاٹنے والی ایک چھری یعنی پیپر نائف تھا۔''

''ٹھیک ہے' آپ کی وضاحت میں وزن ہے۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا' پھر پوچھا۔ ''زبیری صاحب! کیا آپ کو یہ اعزاز حاصل تھا کہ آپ کسی بھی وقت مقتولہ سے ملنے اس کے کمرے میں داخل ہو جائیں...... کسی کو بتائے بغیر...... کسی سے پوچھے بغیر؟''



وہ بڑی رسان سے بولا۔ ''میرا خیال ہے' ہمارے درمیان جس نوعیت کے مضبوط تعلقات تھے' ان کی بنا پر میں اگر ایسے ہی مقتول سے ملنے پہنچ جاتا' تو اسے کوئی اعتراض نہ ہوتا' لیکن میزز اور ایٹی کیٹس بھی کوئی شے ہے۔ ہماری سوشل ویلیوز اس حرکت کی اجازت نہیں دیتیں۔ انسان کو کسی بھی پری میسیز کے قواعد وضوابط کو فالو کرنا پڑتا ہے۔ ہر آفس کا ایک ایٹموسفیر ہوتا ہے۔ اس کے مطابق چلنا چاہیے۔ یونہی منہ اٹھائے کسی کے کمرے میں داخل ہونا قطعاً مناسب نہیں۔

وہاں پر موجود لوگوں کا توسط تو استعمال کرنا ہی پڑتا ہے۔''

''اس وضاحت کے لیے آپ کا بہت بہت شکریہ زبیری صاحب!'' میں نے معتدل لہجے میں کہا۔ ''آپ کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وقوعہ کے روز آپ نے بھی مقتولہ کے کمرے تک رسائی حاصل کرنے کے لیے ایروایڈورٹائزرز کا توسط استعمال کیا تھا؟''

''جی ہاں بالکل...... میں ایک اصولی آدمی ہوں۔'' وہ پر اعتماد لہجے میں بولا۔

میں نے جرح کا رخ اپنی مرضی کی طرف لاتے ہوئے استغاثہ کے گواہ سے سوال کیا۔ ''زبیری صاحب! وقوعہ کے روز جب آپ مقتول کے آفس پہنچے تو وہاں کون کون موجود تھا؟''

''جب میں دفتر کے اندر داخل ہوا تو پتا چلا مقتولہ کے علاوہ جی ایم اظہر ندیم وہاں موجود تھا۔'' اس نے جواب دیا۔

''اور جی ایم کی موجودگی کی میں توقع بھی کر رہا تھا' کیونکہ تھوڑی دیر پہلے میری فون پر ان سے بات ہونے سے یاد آیا!'' میں نے چونکنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ ''وقوعہ کے روز آپ کی مقتولہ سے ملاقات طے تھی؟''

''جی ہاں' آپ کا خیال بالکل درست ہے!''

''کیا یہ صحیح ہے کہ وقوعہ پر پہنچنے سے تھوڑی دیر پہلے آپ نے ایروایڈورٹائزرز میں فون کیا تھا' اور غالباً آپ کی بات جی ایم اظہر ندیم سے ہوئی تھی؟''

''غالباً نہیں...... بلکہ یقیناً!'' وہ پورے یقین سے بولا۔

''آپ نے جی ایم سے کیا کہا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے بتایا۔ ''میں نے اس سے کہا تھا کہ میں مقتول سے ملاقات کرنے آرہا ہوں۔ کیا وہ دفتر میں موجود ہے؟''

''جی ایم نے آپ کے اس سوال کا کیا جواب دیا تھا؟''

''اس نے کہا تھا' میڈم اپنے کمرے میں موجود ہے۔''

گواہ نے بتایا۔ ''اور یہ کہ وہ چند منٹ میں مجھے فون کرے گی۔''

''جب یہ بات ہوئی اس وقت آپ کہاں تھے؟''

''اپنے دفتر پروجیکٹر ٹریڈرز میں۔''

''پروجیکٹر ٹریڈرز کا آفس کہاں واقع ہے؟'' میں نے استفسار کیا۔

میں غیر محسوس انداز میں بڑی صفائی سے اسے اپنے مقصد کی طرف لا رہا تھا' اور اب منزل مجھ سے چند سوالات کی دوری پر کھڑی نظر آرہی تھی۔ اس نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

''پروجیکٹر ٹریڈرز کا آفس کلفٹن کے علاقے میں واقع ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''تو کیا چند منٹ بعد واقعی مقتول نے آپ سے فون پر بات کی تھی؟''

''جی ہاں' تھوڑی ہی دیر میں عالم آرا کا فون آگیا تھا۔''

وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اور اس نے کہا تھا کہ میں فوراً چلا آؤں۔ وہ اپنے دفتر میں موجود میرا انتظار کر رہی ہے۔''

''ذرا سوچ کر بتائیں!'' میں نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

''اس سوال کا بہت سوچ سمجھ کر جواب دینا ضروری ہے۔

جب مقتول نے آپ کو فون کیا' اور اپنے آفس میں آنے کو کہا' اس وقت شام کا کیا بجا تھا؟''

''اور آپ کتنے بجے مقتول کے دفتر پہنچے تھے؟''

''پونے سات بجے۔'' اس نے جواب دیا۔

''یہاں پہنچ کر آپ کی سب سے پہلے کس سے ملاقات ہوئی تھی؟''



''میں سیدھا جی ایم کے کمرے میں پہنچا تھا۔''

''آپ نے وکیلِ استغاثہ کی جرح کے جواب میں بتایا ہے کہ جب آپ نے مقتولہ کے کمرے میں قدم رکھا' تو وہ زندگی کی قید سے آزاد ہو چکی تھی۔ اس خوف ناک صورت حال کو دیکھ کر آپ گھبرا گئے' اور پریشانی کے عالم میں دوڑتے ہوئے جی ایم کے کمرے تک پہنچے' اور اسے مقتولہ کے قتل کے بارے میں بتایا۔ جی ایم اپنی کرسی سے اٹھا' اور آپ کی معیت میں مقتول کے کمرے تک پہنچا' اور مقتول کو دیکھ کر بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا...... ابھی تھوڑی دیر پہلے تک تو میڈم ٹھیک ٹھاک تھیں۔ چند منٹ پیشتر نفیس ان سے مل کر گیا ہے۔'' میں لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوا' پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''زبیری صاحب! واقعات کی اس تفصیل سے تو ظاہر ہوتا ہے' کہ آپ پہلی مرتبہ اکیلے ہی مقتول کے کمرے میں گئے تھے' جی ایم آپ کے ساتھ نہیں تھا؟''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ سادہ سے لہجے میں بولا۔ ''اس روز جب میں مقتولہ کے آفس پہنچا' تو پہلے جی ایم سے علیک سلیک ہوئی۔ اسی کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ مقتولہ نے مجھے فون کرنے کے بعد جی ایم کو میری آمد کے بارے میں بتا دیا تھا۔

جی ایم کے مطابق مقتولہ نے اس سے کہا تھا۔ میں جیسے ہی وہاں پہنچوں' وہ سیدھا مجھے اس کے کمرے میں بھیج دے۔ ایسا ہی ہوا بھی۔ جی ایم سے ہیلو ہائے کے بعد اس نے مجھ سے کہا میں مقتولہ کے کمرے میں چلا جاؤں۔ وہ میرا انتظار کر رہی ہے۔

''تھینک یو مائی ڈیئر وٹنس!'' میں نے کٹہرے میں کھڑے استغاثہ کے گواہ فہیم زبیری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گا۔''

اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ میں اس کا شکریہ کس خوشی میں ادا کر رہا ہوں۔ یہ بات اس کی سمجھ میں آ بھی نہیں سکتی تھی۔

میں اسے گومگو کی کیفیت میں چھوڑ کر جج کی جانب متوجہ ہو گیا' پھر بہ آواز بلند اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''جنابِ عالی! استغاثہ کے گواہ مسٹر فہیم زبیری پر ہونے والی جرح کے نتیجے میں چند

ایسے پوائنٹس ابھر کر سامنے آئے ہیں' جو میرے مؤکل کی بے گناہی کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔"

"ایسے کون سے پوائنٹس ابھر آئے ہیں؟" وکیلِ استغاثہ نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔

میں نے وکیلِ مخالف کے استفسار کو نظرانداز کرتے ہوئے جج کے سامنے ٹرائل کا سلسلہ جاری رکھا۔" جناب عالی! میں ترتیب وار ان پوائنٹس کا ذکر کرتا ہوں۔ مجھے امیدِ واثق ہے' عدالت بہ حسن وخوبی ایک حتمی نتیجے تک پہنچ جائے گی۔" میں نے لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"پوائنٹ نمبر ون......وقوعہ کے روز میرے مؤکل نے پچیس منٹ مقتولہ کے کمرے میں گزارے' جسے استغاثہ نے لگ بھگ آدھے گھنٹے کا نام دیا۔ واقعات کے مطابق ملزم مقتولہ کے بلاوے پر پونے چھ بجے اس کے کمرے میں داخل ہوا' اور چھ دس پر وہاں سے نکلا' پھر سیدھا اپنے گھر چلا گیا۔ اس ملاقات کے آخری مرحلے پر جی ایم اظہر ندیم نے کمرے میں آ کر مقتولہ کو بتایا تھا' کہ زبیری صاحب کا فون ہے' انہیں کیا کہا جائے جس کے جواب میں مقتولہ نے کہا تھا' کہ وہ چند منٹ میں زبیری صاحب کو فون کرتی ہے اور مقتولہ نے زبیری صاحب کو فون کیا بھی۔ ابھی ابھی زبیری صاحب نے اس بات کی تصدیق کی ہے' جس سے ثابت ہوتا ہے' مقتولہ ملزم کے رخصت ہونے کے بعد بھی مقتولہ زندہ تھی۔ نہ صرف زندہ تھی' بلکہ اس قابل بھی تھی کہ وہ زبیری صاحب کو فون کر کے یہ کہہ سکے کہ آپ فوراً آ جائیں' میں آپ کا انتظار کر رہی ہوں......!"

میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے حاضرینِ عدالت پر ایک طائرانہ نظر ڈالی' اور سب کو اپنی جانب متوجہ پایا' پھر میری نگاہ کا زاویہ وکیل استغاثہ جانب مڑ گیا۔ وہ مجھے سخت الجھن اور تذبذب میں دکھائی دیا۔ میں نے اس کی پریشانیوں کی پروا کیے بغیر اپنا کام جاری رکھا۔

"پوائنٹ نمبر ٹو.....استغاثہ کے معزز گواہ مسٹر فہیم زبیری نے ابھی بھری عدالت میں میری جرح کے جواب میں بڑے واضح طور پر بتایا ہے کہ وقوعہ کے روز مقتولہ نے شام سوا



چھ بجے اسے فون کیا تھا' اور اپنے پاس آنے کو کہا تھا۔ گواہ اپنے دفتر سے اٹھا' اور ٹھیک پونے سات بجے وہ مقتولہ کے دفتر پہنچ گیا' اور جب اس نے مقتولہ کے کمرے میں قدم رکھا' تو وہ زندگی کی قید سے آزاد ہو چکی تھی۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ مقتولہ کو سوا چھ کے بعد اور پونے سات سے پہلے موت کے گھاٹ اتارا گیا' جبکہ میرا مؤکل مقتولہ کو زندہ سلامت دفتر میں چھوڑ کر وہاں سے رخصت ہوا تھا' چنانچہ وہ کسی بھی طور اس کی موت کا ذمے دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔"

میں نے ایک مرتبہ پھر مختصر سا توقف کیا' اور وکیل استغاثہ کی تازہ ترین کیفیت کا جائزہ لیا۔ وہ مجھے گمبھیر مسائل میں گھرا ہوا نظر آیا۔ میرے اٹھائے گئے پوائنٹس نے اس کے اعتراضات کے غبارے کی ساری ہوا نکال دی تھی۔ وہ بے بسی سے بار بار پہلو بدل رہا تھا۔ میں نے ایک دفعہ پھر اسے نظرانداز کر کے جج کی جانب توجہ مرکوز کر دی۔

"پوائنٹ نمبر تھری......ایروا یڈورٹائزرز کے جنرل منیجر مسٹر اظہر ندیم نے پولیس کو دیئے گئے اپنے بیان میں بڑے واضح الفاظ میں بتایا تھا' کہ وقوعہ کے روز ملزم لگ بھگ آدھا گھنٹہ مقتولہ کے کمرے میں گزار کر گیا تھا' پھر زبیری صاحب کی آمد تک نہ تو کوئی شخص مقتولہ کے کمرے میں داخل ہوا اور نہ ہی مقتولہ نے کمرے سے باہر قدم نکالا' حتیٰ کہ اس دوران میں مقتولہ سے اس کی بھی کوئی بات نہیں ہوئی۔ جبکہ استغاثہ کے معزز گواہ فہیم زبیری کا بیان جنرل منیجر کے دعوے کی نفی کرتا ہے۔ گواہ کے مطابق جب پونے سات بجے وہ مقتولہ کے آفس پہنچا' تو پہلے اس کی جنرل منیجر اظہر ندیم سے مختصر سی علیک سلیک ہوئی۔ جی ایم نے اسے بتایا کہ میڈم یعنی مقتولہ نے اسے گواہ کی آمد کے بارے میں آگاہ کرتے ہوئے کہا تھا' کہ وہ جیسے ہی آئے' اسے ڈائریکٹ اس کے کمرے میں بھیج دیا جائے۔ جی ایم کا یہ بیان ظاہر کرتا ہے کہ مقتولہ نے گواہ کو فون کرنے کے بعد اسے اس قسم کی ہدایت کی تھی......یعنی ملزم کے جائے وقوعہ سے رخصت ہونے کے بعد مقتولہ کی جی ایم سے بات ہوئی تھی......اور یہ "بات ہوئی تھی" ثابت کرتی ہے کہ میرے مؤکل نے اپنی میڈیم عالم آرا کو قتل نہیں کیا۔ اس کے دفتر سے چلے جانے کے بعد بھی' وہ زندہ تھی۔ لہٰذا میرے مؤکل کو اس کے قتل کے ذمے دار ٹھہرانا سراسر زیادتی اور استغاثہ کی بدنیتی کا مظہر ہے۔"

یہاں پر رک کر میں نے ایک گہری سانس لی' پھر اپنے دلائل کے وزن میں اضافہ کرتے ہوئے جج سے کہا۔ ''جنابِ عالی! استغاثہ کی تفصیلی رپورٹ' حالات وواقعات' جی ایم کے بیان' زبیری صاحب کی تصدیق اور اب تک برآمد ہونے والے نتائج سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ وقوعہ کے روز جب میرا مؤکل دفتر سے رخصت ہوا' تو مقتولہ اور جی ایم کے سوا اور کوئی شخص وہاں موجود نہیں تھا' اور وہ دونوں جیتے جاگتے زندہ حالت میں تھے' پھر جب زبیری صاحب وہاں پہنچتے ہیں' تو میڈم عالم آرا زندگی سے منہ موڑ کر موت کی آغوش میں سمٹ چکی ہوتی ہے۔ یہ سب کچھ کیسے ہوا' کیوں ہوا اور کس نے کیا؟...... ان سوالات کے جوابات جی ایم اظہر ندیم سے زیادہ بہتر اور کوئی نہیں دے سکتا۔ یہ بات بھی وہی شخص بتا سکتا ہے کہ اس نے یہ جھوٹ کیوں بولا کہ ملزم کے رخصت ہونے سے لے کر گواہ زبیری کی آمد تک نہ کوئی شخص مقتولہ کے کمرے میں داخل ہوا' نہ وہ کمرے سے باہر نکلی' اور نہ ہی ان دنوں کے بیچ کوئی بات ہوئی۔ اگر کوئی شخص مقتولہ کے کمرے میں داخل نہیں ہوا' تو پھر اسے قتل کس نے کیا؟ اگر مقتول نے جی ایم کو زبیری کی آمد سے مطلع کر دیا تھا' تو پھر جی ایم نے اس سلسلے میں جھوٹ کیوں بولا؟ یہ بات تو طے ہے کہ جب کوئی شخص جھوٹ کا سہارا لیتا ہے' تو اس کے پیش نظر بنیادی طور پر دو میں سے ایک بات کم از کم ضرور ہوتی ہے۔ یا تو جھوٹ بول کر کوئی جرم کرنے جا رہا ہوتا ہے' اور یا پھر وہ جھوٹ کے پردے کے نیچے کسی جرم کو چھپا رہا ہوتا ہے۔''

میں نے سانس ہموار کرنے کے لیے لمحے بھر کو رکا' پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''یور آنر! میں نے استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں محترم جی ایم کا نام درج دیکھا ہے۔ معزز عدالت سے میری پرزور اپیل ہے کہ وہ استغاثہ کو اس بات کی خصوصی ہدایت کرے کہ وہ آئندہ پیشی پر جی ایم اظہر ندیم کو عدالت تک لانے کا بندوبست کرے' تاکہ یہ معلوم کیا جا سکے کہ جی ایم صاحب کون سا جرم کرنے جا رہے تھے' یا اپنے کس جرم کو چھپانا چاہتے تھے۔ مجھے یقین ہے جی ایم اس کیس کے بارے میں سب سے زیادہ جانتا ہے...... نہ صرف کیس کے بارے میں' بلکہ قاتل کے بارے میں بھی...... وہ قاتل جو میرا مؤکل ہرگز نہیں...... دیٹس آل یور آنر!''



میرے دلائل کا سلسلہ تھا' تو جج گردن جھکا کر اپنے سامنے رکھے کاغذات پر کچھ نوٹ کرنے لگا۔ ان لمحات میں وہ بے حد سنجیدہ اور گمبھیرتا میں ڈوبا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ میں نے اپنے مؤکل کی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے جو پوائنٹس اجاگر کیے تھے' وہ انتہائی متاثر کن اور حقائق پر مبنی تھے۔ کوئی بھی معقول آدمی ان سے صرف نظر نہیں کر سکتا تھا۔ اگر انتہائی سادہ الفاظ میں اس بات کو بیان کیا جائے' تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ میں نے معزز عدالت کی نظر میں اپنے مؤکل کو بے گناہ ثابت کر دیا تھا۔ اس سے پہلے بھی میں نے پیپر نائف کے دستے پر پائے جانے والے ملزم کے فنگر پرنٹس کے حوالے سے جو منطقی دلائل دیئے تھے' وہ بھی اپنی جگہ بڑی اہمیت کے حامل تھے۔

میری دانست میں' میں یہ کیس جیت چکا تھا گویا...... دلہن رخصت ہو گئی تھی' بس شامیانے اور برتن وغیرہ سمیٹنا باقی تھا' اور میں نے اس کام کے لیے جج سے پرزور اپیل کر دی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد جج نے نظر اٹھا کر وکیلِ استغاثہ کی جانب دیکھا' اور استفسار کیا۔

''وکیل صاحب! آپ کے کتنے گواہ باقی ہیں؟''

وہ نروس انداز میں بولا۔ ''جناب! ابھی چار پانچ گواہ باقی ہیں۔''

''کیا آپ آئندہ پیشی پر ایروایڈورٹائزرز کے جنرل منیجر مسٹر اظہر ندیم کو گواہی کے لیے عدالت میں پیش کر سکتے ہیں؟''

''کیوں نہیں......'' وکیلِ استغاثہ نے گڑبڑائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ضرور...... ضرور جناب!''

جج نے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔



آئندہ پیشی پر اس کیس سے متعلق تمام افراد موجود تھے۔ سوائے جی ایم اظہر ندیم کے' یعنی تھا جس کا انتظار وہی ناپید تھا۔ یہ تو دولہا کے بغیر بارات والی صورت حال تھی۔ جج نے وکیلِ استغاثہ سے پوچھا۔

''وکیل صاحب! مطلوبہ گواہ کہاں غائب ہے؟''

وکیل استغاثہ نے اپنی فائل میں سے ایک کاغذ نکال کر جج کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”جنابِ عالی! گواہ ناسازیٔ طبع کے باعث آج عدالت میں پیش نہیں ہو سکا۔ انشاء اللہ! آئندہ پیشی پر وہ ضروری آئے گا۔ یہ اس کا میڈیکل سرٹیفکیٹ ہے۔“

وکیل استغاثہ نے جج کو یقین دلانے کی کوشش تو کی تھی، کہ وہ اگلی پیشی پر اظہر ندیم کو عدالت تک پہنچانے میں کامیاب ہو جائے گا، لیکن اس کے الفاظ کا کھوکھلا پن اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ اسے خود اس بات کا یقین نہیں۔

جج نے میری جانب دیکھتے ہوئے اطلاع فراہم کرنے والے انداز میں کہا۔ ”بیگ صاحب! مسٹر جی ایم تو بیمار ہو گئے ہیں۔“

بے ساختہ میری زبان سے نکلا۔ ”یہ تو ہونا ہی تھا......“

جج نے معنی خیز انداز میں مجھے دیکھا، پھر روئے سخن وکیل استغاثہ کی طرف پھیرتے ہوئے استفسار کیا۔ ”آپ جی ایم کی عدم دستیابی پر کس گواہ کو پیش کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟“

”جناب! دو گواہ دستیاب ہیں۔“ وکیلِ استغاثہ نے جواب دیا۔ ”میں انہیں باری باری پیش کرتا ہوں۔“

وکیلِ استغاثہ نے پہلے اکبر حیدر کو گواہی کے لیے پیش کیا۔ یہ وہی شخص تھا، جس کے توسط سے ملزم نفیس احمد نے مقتول عالم آرا سے ملاقات کے لیے اس کے کمرے میں ایک پرچی بھجوائی تھی۔ اکبر حیدر ادھیڑ عمر کا ایک سانولا سا، موٹا اور ٹھگنا شخص تھا۔ وہ شخصیت کے اعتبار سے ایک غیر متاثر کن بندہ تھا۔ کمپنی میں اس کی حیثیت جی ایم کے بعد تھی۔ وہ مقتولہ کے کمرے کے باہر ایک چھوٹے سے کیبن میں بیٹھا رہتا تھا۔

عام الفاظ میں آپ اسے دربان کا درجہ دے سکتے ہیں۔ پتا نہیں کیوں میرے ذہن نے اسے پہلی ہی نظر میں ناپسند کر دیا تھا۔

اکبر حیدر نے اپنا حلفیہ بیان ریکارڈ کروا دیا تو وکیل استغاثہ جرح کے لیے اس کے قریب پہنچ گیا۔ سلسلہ سوالات کا آغاز کرتے ہوئے اس نے گواہ سے پوچھا۔

”مسٹر اکبر حیدر! وقوعہ سے چند روز پہلے...... یعنی بارہ جولائی کو سہ پہر چار بجے ملزم



نے آپ کے ہاتھ مقتول کے لیے ایک پرچی بھجوائی تھی۔ آپ کو یاد ہے نا؟“

”جی ہاں، بہت اچھی طرح یاد ہے۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مضبوط لہجے میں بولا۔ ”یہ میڈم سے ملنا چاہتا تھا۔ میں نے وہ پرچی فوراً میڈم تک پہنچا دی تھی۔“

”کیا اس پرچی کے نتیجے میں مقتولہ نے ملزم سے اسی روز ملاقات کی تھی؟“ وکیل استغاثہ نے تیز لہجے میں پوچھا۔

”اس روز تو نہیں البتہ اگلے روز یعنی تیرہ جولائی کو میڈم نے اسے اپنے کمرے میں بلایا تھا، لیکن اس بلاوے سے پہلے ہی وہ چھٹی کر کے جا چکا تھا۔“ اکبر حیدر نے جواب دیا۔

”اور آئندہ روز کیا واقعہ پیش آیا تھا؟“

گواہ نے بتایا۔ ”آئندہ روز، یعنی چودہ جولائی کو جب چھٹی سے تھوڑی دیر پہلے میڈم نے اسے اپنے کمرے میں طلب کیا تو پتا چلا کہ وہ دفتر سے رخصت ہو چکا ہے۔ اس روز بھی ملزم کی مقتولہ سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔“

وہ لمحے بھر کے لیے رکا، ایک گہری سانس خارج کی اور بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ”البتہ پندرہ جولائی کو اس کی میڈم سے ملاقات ہو گئی تھی۔“

”اور اسی روز میڈم کو قتل کر دیا گیا؟“

”جی ہاں...... جی ہاں!“ گواہ نے جلدی سے اثبات میں گردن ہلائی۔

وکیلِ استغاثہ نے اس کے ساتھ ہی جرح ختم کر دی۔

مجھے اس کی ادا پر حیرت بھی ہوئی کہ اس نے اتنی جلدی جرح کیوں موقوف کر دی۔ بہر حال میں اپنی باری پر یہ سوچ کر گواہوں والے کٹہرے کی جانب بڑھا کہ مختصر جرح میں، میں وکیل استغاثہ کا ریکارڈ توڑ دوں گا۔

میں چند لمحات تک گواہ کے چہرے اور اس پر ابھرنے والے تاثرات کا بغور جائزہ لیتا رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے دیکھنے نے اسے اچھا خاصا نروس کر دیا تھا۔ اسی مرحلے پر میں نے ٹھہرے لہجے میں اس سے سوال کر دیا۔

”اکبر حیدر! کیا آپ کو معلوم ہے، مرنے کے بعد انسان کو اپنی قبر میں جانا ہوتا ہے؟“

وہ میرے اس غیر متوقع اور ٹیڑھے سوال پر بوکھلا گیا' تاہم اگلے ہی لمحے سنبھلے ہوئے لہجے میں بولا۔ "جی ہاں' مجھے اچھی طرح یہ بات معلوم ہے۔"

میں نے اس بار پہلے سے بھی زیادہ ٹیڑھا سوال کیا۔

"کیا ملزم نے آپ کی کوئی مرغی چرائی ہے؟"

"نن.....نہیں!" اس نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے پوچھا۔ "کبھی آپ کی کسی بکری پر ہاتھ ڈالا ہو؟"

"نہیں جناب! میں نے کوئی بکری نہیں پال رکھی....." وہ عجیب سی نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

"آپ کی کسی بھینس کو اس نے کبھی چھیڑا ہو؟"

"جناب! یہ آپ کس قسم کے سوالات کر رہے ہیں۔"

وہ بپھرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میں نے اپنے گھر میں مویشی خانہ نہیں کھول رکھا۔"

میں نے اس کی برہمی کو نظر انداز کرتے ہوئے سوال کیا۔ "اکبر حیدر! جب آپ کو ملزم سے ایسی کوئی شکایت نہیں' تو پھر آپ اس سے دشمنی کرنے پر کیوں تلے بیٹھے ہیں؟"

"میں نے کیا کیا ہے؟" وہ تعجب خیز نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "عالم آرا اس وقت دنیا میں موجود نہیں' جو اس بات کی تصدیق کرتی کہ اس نے تیرہ اور چودہ جولائی کو ملاقات کے لیے ملزم کو اپنے کمرے میں بلایا تھا یا نہیں۔ میرے مؤکل کا دعویٰ ہے کہ وہ ان ایام میں' چھٹی سے ایک منٹ پہلے بھی اپنی سیٹ سے نہیں ہلا۔ اگر مقتولہ نے اسے بلایا ہوتا' تو یہ بات اس کے علم میں ضرور ہوتی۔ آپ بتا چکے ہیں کہ آپ کو اچھی طرح یہ بات پتا ہے' ہر انسان کو مرنے کے بعد اپنی قبر میں جانا ہے.....پھر آپ نے غلط بیانی سے کام کیوں لیا؟"

"میں نے کوئی جھوٹ بولا ہے' اور نہ ہی کسی غلط بیانی سے کام لیا ہے۔" وہ خفگی آمیز لہجے میں بولا۔ "اگر آپ کو میری بات کا اعتبار نہیں تو امتیاز احمد سے پوچھ سکتے ہیں۔ وہ ملزم کے قریب ہی بیٹھتا ہے۔ میڈم نے جب بھی ملزم کو بلایا' میں اسے دیکھنے گیا' اور دونوں بار





امتیاز نے مجھے بتایا کہ ملزم چھٹی کر کے اپنے گھر جا چکا ہے۔"

"ٹھیک ہے' یہ سوال میں امتیاز احمد سے ضرور کروں گا۔" یہ کہتے ہوئے میں نے جرح موقوف کر دی۔

اگلی گواہی امتیاز احمد ہی کی تھی۔ وہ شکل اور باتوں سے مخبوط الحواس نظر آتا تھا۔ مجھے پتا چلا کہ ایرو ایڈورٹائزرز میں وہ ایک آرٹسٹ کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ وہ اپنے حلیے' گیٹ اپ اور انداز واطوار سے ایک روایتی آرٹسٹ لگتا تھا۔

وکیل استغاثہ نے چند سوالات پوچھنے کے بعد اسے فارغ کیا' تو میں نے پکڑ لیا۔ میں نے محسوس کیا کہ کٹہرے میں آ کر کھڑے ہونا اسے اچھا نہیں لگا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ناگواری کے تاثرات بجا طور پر دیکھے جا سکتے تھے۔ میں نے زیر لب مسکرا کر اس کی طرف دیکھا' اور جرح کا آغاز کر دیا۔

"امتیاز صاحب! مجھے اس بات کا بہ خوبی احساس ہے کہ یہاں بلا کر آپ کے ساتھ بڑی زیادتی کی گئی ہے۔ یہ ماحول اور صورت حال آپ کے مزاج سے میچ نہیں کرتی۔ آپ ایک تخلیق کار ہیں' خیالوں میں گم رہنے والے' اپنے کام سے کام رکھنے والے ایک نفیس طبع انسان' جس کی زندگی میں عدالتی بکھیڑوں کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ بہر حال آپ پریشان نہ ہوں' میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ بس چند سوالات کے بعد آپ سمجھیں' فارغ ہیں۔"

میرے ان مخلصانہ اور ہمدردانہ الفاظ نے اسے چونک کر مجھے دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ ممنونیت بھرے لہجے میں اس نے بڑی معصومیت سے کہا۔ "بڑی مہربانی ہے جناب کی۔"

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ "استغاثہ کے ایک گواہ اور ایرو ایڈورٹائزرز کے ملازم اکبر حیدر نے بیان دیا ہے کہ تیرہ اور چودہ جولائی کی شام مقتول میڈم عالم آرا کے بلاوے پر وہ ملزم کو دیکھنے اس کی سیٹ پر پہنچا' تو وہ چھٹی کر کے جا چکا تھا۔ کیا یہ صحیح ہے کہ گواہ نے ملزم کے بارے میں آپ سے بھی پوچھا تھا۔"

"ہاں' مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک آدھ بار پوچھا تو تھا۔" وہ پُرسوچ لہجے میں بولا۔

"اسی یادداشت کو کام میں لائیں' اور اچھی طرح سوچ کر بتائیں۔" میں نے لہجے کو نرم رکھتے ہوئے امتیاز احمد سے کہا۔ "گواہ اکبر حیدر نے ملزم کے بارے میں چھ بجے کے بعد پوچھا تھا' یا پہلے ......کیونکہ ملزم کا دعویٰ ہے' وہ ایک دن بھی چھ بجے سے پہلے نہیں گیا۔ دوسری جانب گواہ اکبر حیدر کا اصرار ہے کہ مقتولہ نے چھ بجے سے پہلے ملزم کو بلایا تھا؟"

"دیکھیں وکیل صاحب!" وہ سادگی سے بولا۔ "جب اکبر حیدر نے مجھ سے آ کر پوچھا' میں نے وقت نہیں دیکھا تھا' لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ ملزم چھٹی کے وقت تک اپنی سیٹ پر بیٹھا کام کرتا رہتا ہے۔ ہاں' یہ ہوسکتا ہے کہ گواہ نے چھ بجے کے بعد آ کر مجھ سے ملزم کے بارے میں پوچھا ہو۔"

"امتیاز صاحب! آپ کے جواب میں سے ایک سوال ابھر کر سامنے آ رہا ہے۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

"اس سوال کا جواب آپ ہی دے سکتے ہیں؟"

"جی پوچھیں' کیا سوال ہے؟" وہ سنجیدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے پوچھا۔ "آپ کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ آپ چھٹی کے بعد بھی اپنی سیٹ پر موجود ہوتے ہیں' جبکہ میری معلومات کے مطابق دفتر کا سارا عملہ چھ بجے چھٹی کر کے گھر چلا جاتا ہے۔ آپ کے آفس کی ٹائمنگز گیارہ سے چھ بجے تک کی نہیں ہیں؟"

"جی ہاں......آفس ٹائمنگز بالکل یہی ہیں' اور آپ کی معلومات بھی سولہ آنے صحیح ہیں۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "لیکن دو افراد بعض اوقات چھٹی کے بعد بھی دفتر میں موجود ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک میں ہوں۔ اگر کوئی کام اٹک جائے تو میں اسے مکمل کر کے ہی گھر جاتا ہوں۔ اس سلسلے میں' میں آفس ٹائمنگز کی پروا نہیں کرتا۔"

"اور دوسرا شخص کون ہے؟" وہ سانس ہموار کرنے کے لیے رکا تو میں نے فوراً سوال کر دیا۔

اس نے جواب دیا۔ "دوسرا شخص جی' ایم اظہر ندیم ہے۔ جی ایم صاحب کی یہ مجبوری



ہے کہ جب تک میڈم آفس میں موجود ہوں' وہ چھٹی نہیں کر سکتے' اس لیے اکثر اوقات انہیں چھٹی کے بعد بھی دیر تک آفس میں بیٹھنا پڑتا ہے......اوہ سوری' میں کچھ غلط کہہ گیا۔" وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"بیٹھنا پڑتا ہے نہیں......بلکہ بیٹھنا پڑتا تھا۔ اب تو نہ میڈم رہی ہیں' اور نہ ہی جی ایم صاحب کی لیٹ بیٹھیں گے۔ آگے اللہ ہی جانے کیا ہوگا۔"

امتیاز کی بات نے میرے ذہن میں اس کیس کا ایک نیا گوشہ وا کر دیا۔ اب تک کی جرح کے نتیجے میں جی ایم اظہر ندیم کی ذات گہرے شکوک و شبہات کے گھیرے میں آ چکی تھی۔ میں نے ملزم کی میز پر سے پیپر نائف کی چوری کا عقدہ حل کرنے کی غرض سے امتیاز احمد سے استفسار کیا۔

"امتیاز صاحب! آپ کو اچھی طرح یاد ہوگا' تیرہ جولائی کی صبح جب ملزم معمول کے مطابق اپنی سیٹ پر پہنچا' تو اس کی میز پر سے پیپر نائف غائب تھا۔ اس نے اپنے تمام کولیگز سے پیپر نائف کی گمشدگی کے بارے میں استفسار کیا تھا۔ کیا اس نے آپ سے بھی پوچھا تھا؟"

"جی ہاں' مجھے اچھی طرح یاد ہے۔" اس نے اثبات میں جواب دیا۔ "نفیس نے مجھ سے پوچھا تھا' لیکن چونکہ میں اس کے پیپر نائف کے حوالے سے کچھ نہیں جانتا تھا' لہٰذا اس کی کوئی مدد نہ کر سکا۔"

"لیکن ایک انتہائی اہم اور سنجیدہ معاملے میں آپ میری مدد ضرور کر سکتے ہیں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی......وہ معاملہ کون سا ہے؟" وہ حیرت اور دلچسپی کے ملے جلے تاثرات سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ملزم کا دعویٰ ہے کہ وہ بارہ جولائی کی شام پیپر نائف کو اپنی میز پر چھوڑ کر گیا تھا' لیکن تیرہ جولائی کی صبح جب وہ آفس پہنچا' تو میز پر پیپر نائف موجود نہیں تھا۔ مجھے شک ہے کہ بارہ جولائی کی شام کو ملزم کے جانے کے بعد اس کی میز پر سے مذکورہ پیپر نائف چوری کر لیا گیا تھا۔ آپ چھٹی کے بعد بھی آفس میں بیٹھ کر

کام کرتے ہیں۔ ذرا ذہن پر زور ڈال کر یاد کرنے کی کوشش کریں کہ مذکورہ روز ملزم کے گھر چلے جانے کے بعد کوئی شخص اس کی میز کی طرف تو نہیں آیا تھا۔ آپ دونوں کی سیٹیں چونکہ ساتھ ساتھ ہیں' اس لیے اگر کوئی شخص اس طرف آیا ہوگا' تو آپ کی نظر سے نہیں بچ سکتا؟"

"وکیل صاحب!" وہ پُر اعتماد لہجے میں بولا۔

"آپ کے اس سوال کا جواب دینے کے لئے مجھے ذہن پر زور ڈالنے کی ضرورت نہیں' بلکہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مذکورہ شام نفیس کے چلے جانے کے بعد جی ایم صاحب کوئی ضروری فائل ڈھونڈنے اس کی میز پر آئے تھے۔ انہوں نے مجھ سے تو کوئی بات نہیں کی' البتہ ان کی بڑبڑاہٹ نے مجھے بتا دیا' کہ وہ وہاں کسی ضروری فائل کی تلاش میں ہیں۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ جھنجلاہٹ بھری آواز میں یہ کہتے ہوئے واپس چلے گئے تھے...... پتا نہیں' اس کم بخت نے وہ بے بی پاؤڈر کے مسودے والی فائل کہاں رکھ دی ہے۔ ادھر آفس میں پارٹی آئی بیٹھی ہے' میں انہیں کیا جواب دوں۔"

میں نے استغاثہ کے گواہ آرٹسٹ امتیاز احمد کو فارغ کر دیا' اور روئے سخن جج کی طرف پھیرتے ہوئے بہ آواز بلند کہا۔ "جنابِ عالی! اس کیس کی ہر تان جی ایم اظہر ندیم پر جا کر ٹوٹتی ہے' اور موصوف بیمار ہو گئے ہیں۔ میں مؤدبانہ التماس کرتا ہوں کہ استغاثہ کے اس اہم گواہ کو جلد از جلد عدالت میں پیش کرنے کے لیے استغاثہ پر زور ڈالا جائے' تاکہ میرے مؤکل کو آزادی کی زندگی نصیب ہو۔ اس کی بے گناہی تقریباً ثابت ہو چکی ہے۔ جی ایم کا بیان ہو جائے تو معزز عدالت فیصلہ سنانے کی پوزیشن میں آ جائے گی۔ دیٹس آل یور آنر!"

جج نے وکیلِ استغاثہ کو پہلے سے زیادہ سخت تاکید کی کہ وہ اگلی پیشی پر جنرل منیجر کو ہر صورت عدالت میں پیش کرے۔

وکیلِ استغاثہ نے ایسا کرنے کی یقین دہانی کرائی' لیکن اس یقین دہانی اور جج کی تاکید کے مثبت اثرات دیکھنے کو نہ ملے۔

جج نے خفگی آمیز لہجے میں وکیلِ استغاثہ سے استفسار کیا۔ "آخر کیا وجہ ہے کہ گواہ



عدالت میں پیش نہیں ہو رہا۔

اس کی بیماری اور کتنی لمبی چلے گی؟"

وکیلِ استغاثہ نے اپنے تئیں جج کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "یور آنر! استغاثہ کا گواہ اظہر ندیم بیماری کے چنگل سے تو نکل آیا ہے' لیکن حد سے زیادہ ویک نیس ہے۔ وہ صحیح طرح سے بغیر سہارے کے کھڑا بھی نہیں ہو سکتا ہے۔ وہ آئندہ پیشی تک انشاء اللہ اس قابل ہو جائے گا' کہ عدالت میں حاضر ہو کر بیان دے سکے۔"

جج نے تنبیہی انداز میں کہا۔ "اگر استغاثہ کا گواہ اگلی پیشی پر بھی عدالت میں حاضر نہیں ہوا' تو اس کی ذمے داری مکمل طور پر استغاثہ پر عائد ہو گی۔"

اس کے بعد دس دن کی تاریخ دے کر اس نے عدالت برخاست کر دی۔

مجھے اچھا خاصا وقت مل گیا تھا۔ میں نے جیمس بانڈ ڈبل او سیون مسٹر وقار حسین کو متحرک کیا کہ وہ جی ایم کی ہسٹری کھود نکالے' تاکہ جب وہ میرے روبرو کھڑا ہو تو میں اسے گرد کی طرح اڑا کر رکھ دوں۔ اظہر ندیم کے بارے میں مجھے اچھی خاصی معلومات حاصل تھیں' لیکن فائنل راؤنڈ کھیلنے کے لیے خصوصی تیاری کی ضرورت تھی۔ میری اب تک کی کارکردگی سے وقار حسین پوری طرح مطمئن تھا' اور اس کے جوش و خروش میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔

استغاثہ کے گواہوں کا مکمل طور پر بھگتنا اور جج کا فیصلہ سنانا اپنی جگہ اہمیت کا حامل تھا' لیکن اب تک کی عدالتی کارروائی نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر کے رکھ دیا تھا۔

میڈم عالم آرا کو کس نے موت کے گھاٹ اتارا تھا' یہ جاننا اور ثابت کرنا میرا نہیں بلکہ استغاثہ کا کام تھا' اور وہ اس کام میں بری طرح ناکامیاب رہا تھا۔

اپنے مؤکل کو بے گناہ ثابت کر کے باعزت بری کرانے کی ذمے داری مجھ پر عائد ہوتی تھی' اور میں نے اپنی ذمے داری کو بڑی خوش اسلوبی سے نبھایا تھا۔ اصولی طور پر یہ کیس فیصلے کے دہانے تک آ گیا تھا۔ جی ایم عدالت میں حاضر ہو جاتا' تو اس کیس کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی جاتی۔

آئندہ پیشی کا استغاثہ سے زیادہ مجھے انتظار تھا' اور مجھ سے بھی زیادہ ملزم نفیس احمد کی

بیوی شازیہ' اس کے بیٹے دانش اور سالے وقار حسین کو انتظار تھا' اور یہ ایک ایسا انتظار تھا' جس میں امیدوں اور خوشیوں کے دیے روشن تھے۔

مجھے امید تھی' آئندہ پیشی پر وکیل استغاثہ کی جانب سے کسی توجیہہ یا وضاحت کو قبول کرنا عدالت کو منظور نہیں ہو گا' اور اگر استغاثہ اپنے سب سے اہم گواہ اظہر ندیم کو گواہی کے لیے پیش نہ کر سکا' تو عدالت میرے مؤکل کے حق میں فیصلہ سنا دے گی' کیونکہ میں بڑی تفصیل کے ساتھ ملزم کی بے گناہی ثابت کر چکا تھا...... لہٰذا راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا۔



منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں والے کٹہرے میں ''ایرو ایڈورٹائزرز'' کا جنرل منیجر اظہر ندیم کھڑا تھا' اور ایسا کھڑا تھا کہ جیسے کسی نے باندھ پکڑ کر اسے کھڑا کر رکھا ہو۔ جی ایم کی عمر پینتالیس اور پچاس کے درمیان رہی ہو گی۔ اس کے چہرے پر ہلکی پھلکی داڑھی نظر آ رہی تھی' جس میں کہیں کہیں سفیدی جھلکتی دکھائی دیتی تھی۔ وہ ایک دراز قامت اور ہینڈسم شخص تھا' لیکن ایک خاص نوعیت کی ''عدالتی بیماری'' نے اس کی حالت خراب کر رکھی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا' اسے کوئی جان لیوا روگ لگ گیا ہو۔ اس کی حالت پر مجھے ترس تو بہت آیا' لیکن وہ وقت سخت بنا کر رکھنے کا تھا۔ اگر سرجن اپنے جذبات اور احساسات سے مغلوب ہو جائے تو آپریشن...... ایک کامیاب آپریشن ممکن نہیں رہتا۔

حاضرینِ عدالت کی نظریں استغاثہ کے سب سے اہم گواہ پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ یہ تو جان چکے تھے کہ میرا مؤکل بے گناہ ہے' لیکن یہ دیکھنا بھی ضروری تھا' کہ اگر میڈم عالم آرا کو نفیس احمد نے قتل نہیں کیا' تو پھر اس کا قاتل کون ہے؟ یہ ایک سنسنی خیز سوال تھا' اور عدالت میں موجود ہر شخص کے ذہن کو سنسنا رہا تھا۔

اظہر ندیم نے نقاہت بھرے انداز میں اپنا حلفیہ بیان ریکارڈ کرایا' اور وکیل استغاثہ جرح کے لیے وٹنس باکس کے قریب چلا گیا۔ اس نے گواہ کی ذہنی صحت اور جسمانی حالت کو ملحوظِ نظر رکھتے ہوئے نہایت ہی مختصر جرح کی اور مجھے ٹرن دے دی۔

میں نے ایک بات خاص طور پر نوٹ اور محسوس کی کہ آج وکیلِ استغاثہ کے انداز



وادا میں وہ روایتی حریفانہ دم خم دکھائی نہیں دیتا تھا۔ یوں لگتا تھا' وہ محض خانہ پری کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کی تازہ ترین کارکردگی سے مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔

میں نے جج سے اجازت حاصل کی' اور جرح کے لیے گواہ کے قریب چلا گیا۔ میں نے ہمدردانہ انداز میں اس کی آنکھوں میں دیکھا اور دوستانہ لہجے میں پوچھا۔

''اظہر صاحب! اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟''

''اللہ کا شکر ہے' ٹھیک ہوں۔'' وہ بیزاری سے بولا۔

میں نے پوچھا۔ ''آپ کو ہو کیا گیا تھا؟''

''بس...... بیماری نے اچانک حملہ کر دیا تھا۔'' وہ جان چھڑانے والے انداز میں بولا۔

میں نے گہری سنجیدگی سے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور پوچھا۔ ''مثلاً ...... کون سی بیماری؟''

اس قسم کے سوالات میں الجھا کر میں دراصل اسے زچ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ یہ ایک طرح سے آپریشن سے قبل دیا جانے والا انستھیسیا تھا' تاکہ دورانِ جراحی میں ''مریض'' کو کسی ''تکلیف'' کا سامنا نہ ہو!

وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''مجھے ڈی ہائیڈریشن ہو گیا تھا۔''

''اوہ......'' میں نے متاسفانہ انداز میں سانس خارج کی اور کہا۔ ''تو آپ کو ڈائریا ہو گیا تھا۔ عدالت کے کمرے میں بہت سے افراد ایسے ہوں گے جو میڈیکل کی زیادہ معلومات نہیں رکھتے' لہٰذا ان کی آسانی اور سہولت کے لیے میں بتاتا چلوں کہ استغاثہ کے سب سے اہم گواہ مسٹر اظہر ندیم کو اسہال کا مرض ہو گیا تھا' جس کی وجہ سے وہ پچھلی دو پیشیوں پر عدالت میں حاضر نہیں ہو سکے۔'' پھر میں نے براہِ راست گواہ سے پوچھ لیا۔ ''اظہر صاحب! میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

''آپ درست فرما رہے ہیں۔'' وہ اکتاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ ''لیکن میری بیماری ڈائریکٹلی زیرِ سماعت کیس کو ایفیکٹ نہیں کرتی لہٰذا بہتر ہو گا کہ آپ اِدھر اُدھر کے سوالات چھوڑ کر اصل پوائنٹ پر رہیں۔''

"اوکے مسٹر اظہر......!" میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "آپ کی خواہش کا احترام ضروری ہے' اس لیے میں اب آپ کی بیماری کے حوالے سے کوئی سوال نہیں کروں گا' ورنہ پوچھنے کے لیے تو بہت سے سوالات ہیں' مثلاً"...... میں نے لمحاتی توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"مثلاً یہ کہ...... آپ کا ڈائریا اتنا اسپیشل قسم کا کیوں تھا کہ اسے ٹھیک ہونے میں ایک ماہ سے زیادہ کا عرصہ لگ گیا؟

یہ تو دو تین یا چار دن کا کھیل ہوتا ہے۔ ایک ہفتے کے بعد تو انسان چلنے پھرنے' بلکہ زندگی کے ہنگاموں میں حصہ بٹانے کے قابل ہو جاتا ہے۔ آپ پچھلی دو پیشیوں پر عدالت میں حاضر نہیں ہوئے۔ اتنی طویل غیر حاضری سمجھ میں آنے والی نہیں' پھر یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ آپ اس دوران کس ڈاکٹر کے زیر علاج رہے اور ضرورت پڑنے پر گواہی کے لیے مذکورہ ڈاکٹر صاحب کو بھی عدالت میں بلایا جا سکتا ہے' کیونکہ...... بہر حال وہ ڈاکٹر قابلِ دیدار ہے' جو ایک ماہ تک آپ کی ڈی ہائیڈریشن سے نبرد آزما رہا' اور بالآخر اسے شکست دے کر آپ کو موت کے منہ سے کھینچ لایا......" میں نے توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی' پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"شاید آپ کو معلوم نہ ہو کہ میں میڈیکل کی طرف جاتے جاتے وکالت کی جانب آ گیا تھا۔ آج اگر میں وکیل نہ ہوتا' تو ڈاکٹر ہوتا۔ پیشہ ورانہ راہ کی اس تبدیلی کی کہانی بڑی دلچسپ ہے' لیکن میں اس معاملے کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا' کیونکہ اگر میں نے ایسا کیا تو وکیل استغاثہ فوراً اسے پیشتر "آبجیکشن یور آنر" کا نعرہ بلند کر دے گا' اور میں اپنے فاضل دوست کو کوئی زحمت نہیں دینا چاہتا لہٰذا...... مختصراً یہ سمجھ لیں کہ بیماری کا سرٹیفکیٹ دے دینا کافی نہیں۔ اس ڈاکٹر صاحب کو بھی میری میڈیکل جرح کا سامنا کرنا ہوگا' جو آپ کے ڈائریا سے مہینہ بھر کھیلتا رہا۔ خیر...... میں ہر صورت میں آپ کی "خواہش" پوری کروں گا۔"

میں نے کچھ نہ کہتے ہوئے بھی سب کچھ کہہ دیا تھا' یہ الگ بات کہ "اس کہنے" میں جرح والا روایتی انداز نہیں تھا' تاہم میں جج اور حاضرینِ عدالت کو یہ باور کرانے میں کامیاب رہا تھا کہ استغاثہ کے گواہ کی بیماری ایک ڈھکوسلے سے زیادہ کچھ نہیں تھی۔



میں چند لمحات کے لیے خاموش ہوا' تو اظہر ندیم پریشانی کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ میں نے اسے سوالات کی دھار پر رکھ لیا۔

"اظہر صاحب! آپ کی غیر حاضری میں عدالتی کارروائی کہیں سے کہیں جا پہنچی ہے۔ ایسے بہت سے سوالات سر اٹھائے کھڑے ہیں' جن کا جواب صرف آپ ہی کو دینا ہے لہٰذا بسم اللہ کریں اور بتائیں......" میں نے لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"وقوعہ کے روز یعنی مقتول کی موت سے قبل میرے مؤکل نے پچیس منٹ مقتول کے کمرے میں گزارے تھے۔

وہ پانچ پینتالیس پر کمرے میں داخل ہوا' اور چھ دس پر وہاں سے باہر نکلا' اور اپنے گھر چلا گیا۔ جب وہ آفس سے رخصت ہوا' تو اس کے جانے کے بعد وہاں صرف دو افراد رہ گئے۔ نمبر ایک مقتولہ اور نمبر دو آپ...... اور آپ دونوں اپنے اپنے کمرے میں موجود تھے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟"

وہ ہاتھ کی پشت سے اپنی پیشانی کو سہلاتے ہوئے بولا۔

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"

"آپ نے پولیس کو بیان دیا ہے کہ ملزم کے دفتر سے رخصت ہونے اور فہیم زبیری کی آمد کے درمیان نہ تو کوئی شخص مقتولہ کے کمرے میں داخل ہوا' اور نہ ہی وہ اپنے کمرے سے باہر نکلی تھی' حتیٰ کہ اس دوران آپ کے اور مقتولہ کے مابین بھی کوئی بات چیت نہیں ہوئی' اسی بنا پر آپ کو یقین ہے کہ میرے مؤکل ہی نے میڈیم عالم آرا کو قتل کیا ہے۔

آپ نے مقتول کو زندہ حالت میں آخری مرتبہ اس وقت دیکھا' جب آپ اسے فہیم زبیری کے فون کے بارے میں بتانے کے لئے اس کے کمرے میں گئے۔ ملزم اس وقت مقتولہ کے کمرے میں موجود تھا۔ اس کے بعد فہیم زبیری کی زبانی آپ کو پتا چلا کہ عالم آرا کو قتل کر دیا گیا۔ ازاں بعد فہیم زبیری کے مشورے پر پہلے آپ نے پولیس اسٹیشن فون کیا اور پھر مقتولہ کی بوڑھی والدہ کو صورت حال سے آگاہ کیا۔

"ایم آئی رائٹ؟"

"یس......" وہ کمزور سی آواز میں بولا۔ "واقعات اسی ترتیب سے پیش آئے تھے۔"

"لیکن مسٹر اظہر......استغاثہ کے گواہ فہیم زبیری کا بیان آپ کی اس "ترتیب" کی دھجیاں اڑا رہا ہے۔شاید آپ کو معلوم نہیں کہ اپنی گواہی کے موقع پر فہیم زبیری نے معزز عدالت کو بتایا ہے کہ مقتولہ نے وقوعہ کے روز شام چھ بج کر پندرہ منٹ پر اسے فون کر کے اپنے دفتر آنے کو کہا تھا' جبکہ میرا موکل چھ دس پر دفتر سے رخصت ہو گیا تھا۔وقت کی یہ ترتیب بتاتی ہے کہ جب ملزم مقتولہ کے کمرے سے باہر نکلا' وہ زندہ تھی۔وہ زندہ تھی تو اس نے فہیم زبیری کو فون کیا تھا نا......اینی ہاؤ!" میں نے ٹھوس انداز میں توقف کیا' پھر گہری سنجیدگی سے کہا۔

"فہیم زبیری نے معزز عدالت کو مزید بتایا ہے کہ جب وہ مقتولہ سے ملنے اس کے دفتر پہنچا' تو سب سے پہلے وہ آپ کے کمرے میں گیا تھا۔آپ دونوں کے درمیان رسمی علیک سلیک ہوئی' آپ نے فہیم کو بتایا کہ اس کی آمد کے حوالے سے مقتولہ' اور آپ میں بات ہو چکی ہے۔فہیم کو فون کرنے کے بعد مقتولہ نے آپ سے کہا تھا' کہ فہیم جیسے ہی آئے' اسے مقتولہ کے کمرے میں بھیج دیا جائے' اور فہیم زبیری کے مطابق آپ نے ایسا ہی کیا تھا' لیکن......آپ کا تو بیان یہ ہے کہ ملزم کے رخصت ہونے کے بعد مقتولہ اور آپ کے درمیان کوئی بات چیت نہیں ہوئی؟"

"مم......مجھے لگتا ہے فہیم صاحب کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے......" وہ گڑبڑائے ہوئے انداز میں بولا۔

"کیسی غلط فہمی......؟" میں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

"جو باتیں......میں نے فہیم صاحب کو بتائیں......وہ میڈم نے مجھ سے......اس وقت کی تھیں' جب ملزم رخصت نہیں......ہوا تھا......" وہ بکھرے ہوئے انداز میں بولا۔

"انہیں سمجھنے میں فرق آیا ہے۔"

صاف دکھائی دے رہا تھا کہ وہ جھوٹ کا سہارا لینے کی کوشش کر رہا تھا' لیکن اس نازک موقع پر میں اسے کسی سہارے تک رسائی نہیں دلا سکتا تھا' لہٰذا کڑے لہجے میں' میں نے اس سے پوچھا۔



"یعنی آپ کا مطلب ہے......مقتولہ نے فہیم زبیری کو فون کرنے سے پہلے ہی آپ کو اس سلسلے میں ہدایات جاری کر دی تھیں......یہ تو انتہائی نامعقول اور سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے اظہر صاحب؟"

"میڈم خاصی موڈی تھیں......" وہ بہانے بازی کی راہ پر ایک اور جست بھرتے ہوئے بولا۔ "وہ کسی وقت کچھ بھی کر سکتی تھیں......"

"بہت خوب......" میں نے استہزائیہ انداز میں کہا' پھر جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے استغاثہ کے گواہ سے سوال کیا۔

"اظہر صاحب! آپ نے وقوعہ کے روز پولیس کو بتایا تھا کہ میرے موکل نے میڈم عالم آرا کو قتل کرنے کے بعد اس کی قیمتی جیولری اور نقدی پر بھی ہاتھ صاف کر دیا......"

"آبجیکشن یور آنر" وکیلِ استغاثہ نے نیم دلی سے اعتراض جڑ دیا۔ "وکیلِ صفائی استغاثہ کے معزز گواہ پر خوامخواہ دباؤ ڈال رہے ہیں۔گواہ نے کسی بھی مرحلے پر یہ الفاظ استعمال نہیں کیے کہ ملزم نے مقتول کو قتل کیا ہے۔ایسے حتمی الفاظ محض گواہ نہیں' بلکہ عینی شاہد ہوں' انہوں نے اپنی آنکھوں سے ملزم کو یہ قتل کرتے دیکھا ہو۔گواہ نے تو وہ حالات و واقعات معزز عدالت کے سامنے رکھے ہیں' جس کی روشنی میں ملزم ایک قاتل اور چور کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آ رہا ہے لہٰذا......وہ تھوڑی دیر کے لئے رکا' پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"لہٰذا میں معزز عدالت سے استدعا کرتا ہوں کہ وکیلِ صفائی کو ایسے حربوں سے باز رہنے کی تاکید کی جائے' جن میں الفاظ کی تبدیلی' معنی اور مفہوم کو کچھ کا کچھ بنا کر پیش کر رہی ہو۔"

قبل اس کے کہ جج وکیلِ استغاثہ کی درخواست پر غور فرمانے کے بعد میرے لئے کوئی ہدایت جاری کرتا' میں نے وکیلِ مخالف کی طرف دیکھتے ہوئے تشکرانہ لہجے میں کہا۔

"تھینک یو مائی ڈیئر......آپ نے ایک نہایت ہی اہم نکتہ اٹھایا ہے۔اس کے لئے میں آپ کا احسان مند ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ آپ کو ایسی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔"

وہ طنز میں بجھے ہوئے ان تیروں کی بارش میں معاندانہ نظر سے مجھے گھور کر رہ گیا۔

میں فیصلہ کن انداز میں استغاثہ کے گواہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"مسٹر اظہر! آپ نے وقوعہ کے روز بیش قیمت بریسلیٹ اور پینڈنٹ کو مقتول کے جسم پر سجا دیکھ لیا تھا' اسی لئے آپ نے ان زیورات کی چوری کی نشان دہی بھی کی۔ ازیں علاوہ تیس ہزار روپے کی نقدی کا بھی معاملہ ہے۔ آپ نے پولیس کو بتایا تھا کہ مقتولہ نے آپ کے ذریعے ہی تیس ہزار روپے کا ایک چیک کیش کرا کے رقم اپنی میز کی دراز میں رکھ دی تھی۔" میں نے لمحاتی توقف کر کے گہری سانس لی' اور اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"کیا آپ معزز عدالت کو یہ بتانا پسند فرمائیں گے کہ مقتولہ نے وہ تیس ہزار روپے کا چیک کس مقصد سے کیش کرایا تھا؟"

"بالکل ...... کیوں نہیں ......" وہ حتمی انداز میں بولا۔ "میڈم نے وہ رقم مسٹر فہیم زبیری کو دینا تھی۔ یہ بات انہوں نے مجھے دوپہر کو بتا دی تھی۔"

"اوکے......" میں نے سرسری انداز میں کہا۔ "اس کا مطلب ہے مقتولہ آپ پر بہت زیادہ اعتماد کرتی تھی؟"

"جی ہاں......اس میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں۔"

"ویری گڈ!" میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "آپ کو مقتولہ کے پاس کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا تھا؟"

"یہی کوئی......ساڑھے چار' پونے پانچ سال!"

"میرا خیال ہے "ایروایڈورٹائزز" کو قائم ہوئے بھی کم و بیش اتنا ہی عرصہ ہوا ہے۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "یا چار چھ ماہ زیادہ ہوئے ہوں گے......؟"

"جی......آپ کا اندازہ کافی حد تک درست ہے۔"

وہ اطمینان بھرے لہجے میں بولا۔ "ایروایڈا ٹائزز لگ بھگ ساڑھے پانچ سال قبل وجود میں آئی تھی۔"



میں نے ایک خاص مقصد کے تحت اپنے انداز میں نرمی بھری تھی' تاکہ وہ مطمئن ہو جائے اور میں اس کی بے خبری میں ایسا کاری وار کروں کہ وہ وٹنس باکس میں چاروں خانے چت پڑا نظر آئے۔ اظہر ندیم کے بارے میں میری اب تک کی تحقیقات اور نفیس احمد کے سالے وقار حسین کی فراہم کردہ معلومات کو استعمال کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ میں نے گواہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

"مسٹر اظہر! اتنی طویل رفاقت کے بعد تو آپ مقتول کے بہت قریب آ گئے ہوں گے......میرا مطلب ہے' آپ کو اس کی ذات کے بارے میں اچھی خاصی معلومات حاصل ہوں گی؟"

"ظاہری سی بات ہے!" وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ "لیکن میں سمجھ نہیں پایا ہوں کہ آپ یہ سوال کیوں کر رہے ہیں......؟"

"میں سمجھاتا ہوں۔" میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ "میں دراصل' یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا آپ کو معلوم ہے مقتول نے اپنی زندگی میں دو ناکامیاب شادیاں بھگتی تھیں؟"

"جی مجھے اس بارے میں معلوم ہے۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "ان کی پہلی شادی صفدر عباس نامی ایک بزنس مین سے ہوئی تھیں' جو لگ بھگ تین سال تک رہی' اور پھر میڈم نے صفدر عباس سے خلع لے لی۔" وہ لمحے بھر کے لیے رکا پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"اس کے بعد میڈم نے ایک بیوروکریٹ سے شادی کی' جو صرف دو ماہ ہی قائم رہ سکی' لیکن میں ابھی تک آپ کے سوالات کے مقصد تک نہیں پہنچ پایا ہوں۔"

میں نے اس کی الجھن اور تذبذب کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنا "کام" جاری رکھا۔

"مسٹر اظہر! کیا یہ صحیح ہے کہ مقتول کا دوسرا شوہر یعنی افضل صمدانی اسمگلنگ ایسے گھناؤنے کام میں ملوث تھا' جبھی مقتول نے پہلی فرصت میں اس شخص سے جان چھڑا لی تھی' کیونکہ یہ تلخ حقیقت اس کے لیے قابل قبول نہیں تھی؟"

"لگتا ہے......آپ نے تو میڈم پر اچھی خاصی ریسرچ کر رکھی ہے۔" وہ حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔

"بہر حال جو آپ نے پوچھا وہ ایک سچائی ہے۔"

"کیا یہ بھی سچ ہے کہ جب مقتول نے صفدر عباس سے خلع حاصل کرنے کے بعد فضل صمدانی سے شادی کی تو یہ بات صفدر عباس کو پسند نہیں آئی تھی؟" میں نے بدستور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ظاہر ہے' اب صفدر عباس کا مقتول پر کوئی حق نہیں رہا تھا' اس لیے وہ محض باتیں ہی کر سکتا تھا' اور...... اس موقع پر اپنے غصے کا اظہار کرتے ہوئے اس نے خاصی سخت اور ترش باتیں کی تھیں۔"

"جی ہاں...... یہ حقیقت ہے۔" اس نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ "صفدر نے اس وقت کافی جھنجلاہٹ اور غصے کا اظہار کیا تھا۔"

"کیا آپ کو معلوم ہے' صفدر عباس کا بزنس کیا ہے؟"

"صفدر عباس بھی ایڈورٹائزنگ کے شعبے سے منسلک ہے۔" گواہ نے جواب دیا۔

میں نے استفسار کیا۔ "آپ تو صفدر عباس کی کمپنی سے اچھی طرح واقف ہوں گے کیونکہ یہ آپ ہی کی فیلڈ ہے؟"

"جی ہاں' صفدر عباس کی کمپنی کا نام "پروموشن ایڈورٹائزرز" ہے۔" اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "پروموشن ہماری بہت بڑی حریف کمپنی ہے۔"

میں نے سوالات کے زاویے کو ایک لخت تبدیل کر دیا' اور وٹنس باکس میں کھڑے استغاثہ کے گواہ سے سوال کیا۔

"اظہر صاحب! بارہ جولائی کی شام ملزم پیپر نائف کو اپنی میز پر چھوڑ گیا تھا' لیکن تیرہ جولائی کو جب وہ اپنی سیٹ پر پہنچا تو مذکورہ پیپر نائف کو غائب پایا۔ میں اس تفصیل میں نہیں جاؤں گا' آپ نے اسے احتیاط برتنے کی ہدایت کے ساتھ دوسرا پیپر نائف دے دیا تھا' وغیرہ' وغیرہ......" میں نے رک کر ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"مسٹر اظہر! پچھلی ایک گواہی پر استغاثہ کے گواہ اور "ایروایڈورٹائزرز" کے آرٹسٹ امتیاز احمد نے معزز عدالت کو بتایا تھا کہ بارہ جولائی کی شام ملزم کے جانے کے بعد آپ اس کی میز پر آئے تھے' اور جھنجلاہٹ آمیز انداز میں کچھ تلاش کر رہے تھے۔ کہیں امتیاز نے غلط بیانی سے تو کام نہیں لیا؟"



اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا' سنبھلی ہوئی آواز میں بولا۔

"آں...... ہاں...... میرا مطلب ہے' امتیاز نے ٹھیک ہی بتایا ہے......"

"معزز عدالت یہ جاننا چاہتی ہے کہ آپ اس شام ملزم کی میز پر کیا تلاش کرنے آئے تھے؟" میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔

"مم...... مجھے...... ایک فائل...... کی تلاش تھی......"

وہ پریشانی کے عالم میں بولا۔

"میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ "وہی...... بے بی پاؤڈر والے مسودے کی فائل نا......؟"

"ہاں' ہاں...... وہی۔" وہ کٹہرے کی ریلنگ کو تھامتے ہوئے بولا۔

"اگر میں یہ کہوں کہ......" میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آپ بے بی پاؤڈر والی فائل نہیں' بلکہ پیپر نائف کو چرانے کے لیے وہاں پہنچے تھے...... وہ پیپر نائف جس پر ملزم کے فنگر پرنٹس موجود تھے......؟"

"یہ کیا بکواس ہے......" بے ساختہ وہ تیز آواز میں چلایا۔

میں سمجھ رہا تھا کہ یہ بجھنے سے پہلے والا شمع کا بھڑکنا تھا' لہٰذا میں نے اس کی چلاہٹ کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔

"مسٹر اظہر! یہ بکواس نہیں حقیقت ہے۔ آپ کو کسی فائل کی نہیں' بلکہ اس پیپر نائف کی تلاش تھی' جو ایک عمدہ قسم کا آلۂ قتل ثابت ہو سکے' اور اس کے دستے پر کسی ایسے شخص کی انگلیوں کے نشانات بھی موجود ہوں' جسے قربانی کا بکرا بنانا بہت آسان ہو...... کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"آپ میری بات کو...... سمجھنے کی کوشش کریں وکیل صاحب......!" وہ اس مرتبہ جارحیت کے بجائے مریل سی آواز میں بولا۔ "اس وقت...... بے بی پاؤڈر والی پارٹی آفس میں بیٹھی تھی اور میں۔"

"پارٹی کا نام؟" اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی میں نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

"منصوری صاحب......!" وہ منمنایا۔

"کون منصوری؟" میرا لہجہ مزید سخت ہو گیا۔ "معزز عدالت مسٹر منصوری کا نام، ٹیلی فون نمبر، کمپنی کا نام اور ایڈریس جاننا چاہتی ہے......؟"

"آ......آپ کو......اس سے......کیا مطلب......؟"

وہ ہانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

"مجھے نہیں ......معزز عدالت کو مطلب ہے اس سے۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"آپ کی ذات جس نوعیت کے شکوک وشبہات میں گھِری ہوئی ہے اس کا تقاضا ہے کہ آپ کے بیان کی تصدیق کے لیے کسی مسٹر منصوری کو عدالت میں پیش کیا جائے اور اس سے حلفیہ پوچھا جائے کہ کیا وہ واقعی کسی بے بی پاؤڈر کے اشتہار کے سلسلے میں بارہ جولائی کی شام چھ بجے کے بعد آپ کے دفتر میں موجود تھا، لیکن...... مجھے یقین ہے کہ آپ میرے ان سوالات کے جوابات نہیں دو گے کیونکہ مسٹر منصوری ایک فرضی بلکہ حادثاتی کردار ہے۔" میں نے تھوڑا توقف کیا ایک گہری سانس خارج کی اور سلسلہ جرح کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"مسٹر اظہر! اگر تم سچے ہوتے تو کسی مسٹر منصوری کا تاریخ، جغرافیہ بیان کرنے میں ایک لمحے کی تاخیر نہ کرتے بہر حال تمہارے چہرے کو پوری طرح بے نقاب کرنے کے لیے مجھے دوسرا ہاتھ دکھانا پڑے گا......"

میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا تو وہ کٹہرے کی ریلنگ کو تھامے تھامے ہانپنے لگا۔ اس کی حالت قابل رحم تھی لیکن میں ان لمحات میں کسی نرمی کو جگہ نہیں دے سکتا تھا۔ لہٰذا جارحانہ انداز میں پوچھا۔

"اظہر ندیم! تمہیں ڈبل جاب کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟"

"ڈبل جاب......" وہ دھندلائی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگا۔

"ہاں ڈبل جاب!" میں نے چٹانی لہجے میں کہا۔

"پچھلے ایک سال سے تم ڈبل جاب کر رہے ہو بلکہ کر رہے تھے۔ فل ٹائم مقتول



میڈم عالم آرا کے ملازم اور پارٹ ٹائم "پروموشن ایڈورٹائزرز" کے ملازم اور...... مجھے پتا چلا ہے کہ "ایرو" کی سب سے بڑی حریف کمپنی "پروموشن" کا مالک صفدر عباس تمہیں خاصی ہینڈسم سیلری دیتا ہے تاکہ تم اس کا وفادار رہتے ہوئے......"

"آپ کو......" وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی ضعف زدہ اور شکست خوردہ آواز میں بولا۔ "یہ......بات کس نے ......بتائی ہے......"

"خود صفدر عباس نے بتائی ہے۔" میں نے نشانہ تاک کر اندھیرے میں تیر چھوڑا۔ میرا تیر خطا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ دہشت زدہ آواز میں بولا۔ "یہ نہیں ہو سکتا......صفدر صاحب ایسا بیان دے ہی نہیں سکتے...... ہمارے درمیان تو یہ طے ہوا تھا کہ۔"

وہ بولتے بولتے یک دم رک گیا۔ یوں لگتا تھا اسے اپنی سنگین غلطی کا احساس ہو گیا ہو۔ اس کے چہرے پر اور آنکھوں میں موت کے سائے لہراتے ہوئے دیکھے جا سکتے تھے۔ گویا اس نے ڈھکے چھپے الفاظ میں اپنے جرم کا اقرار کر لیا تھا۔

میں نے روئے سخن جج کی طرف موڑتے ہوئے کہا "دیٹس آل یور آنر......!"

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔



آئندہ پیشی پر جج نے میری توقع کے عین مطابق نفیس احمد کو باعزت رہا کرنے کے احکامات صادر کر دیئے۔ گزشتہ پیشی کے اختتام پر جو ڈرامائی سین دیکھنے میں آیا اس کے پیش نظر جج نے اظہر ندیم کو شامل تفتیش کر کے پولیس کو نیا چالان پیش کرنے کی ہدایات کر دی تھیں۔ پولیس کی اس تازہ ترین تفتیش کا جو نتیجہ نکلا ہو گا اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں آپ بہ خوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔

ہم عدالت کے کمرے سے باہر آئے تو ملزم کی بیوی شازیہ آب دیدہ ہو گئی۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں مجھ سے کہا۔

"وکیل صاحب! یہ سب آپ کی مہربانی اور کوشش سے ممکن ہوا ہے۔"

"مہربانی نہیں......صرف کوشش۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے

کہا۔ ''میرا کام کوشش کرنا تھا۔ وہ میں نے دیانت داری سے کی اور...... اس کوشش میں کسی اور کی کوشش کا بھی غالب ہاتھ ہے۔''

شازیہ نے چونک کر مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں موجود سوال کے پیش نظر میں نے وقار حسین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کے بھائی نے اپنے بہنوئی کی رہائی کیلئے بڑی دوڑ دھوپ کی ہے۔''

شازیہ کا چہرہ فخر کے احساس سے تمتمانے لگا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ''وکیل صاحب! میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی ۔ آپ نے میرے شوہر کو موت کے منہ سے نکالا ہے۔''

وقار حسین نے مذاق کے رنگ میں کہا۔ ''باجی! آپ بیگ صاحب کا اتنا زیادہ بھی شکریہ ادا نہ کریں۔ آپ کے اس عمل سے کہیں یہ ناراض ہی نہ ہو جائیں۔''

میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ہم سب کو اس ذات پاک کا شکریہ ادا کرنا چاہئے جو ہر عیب سے پاک ہے۔

اسی نے میری کوشش اور پیشے کی لاج رکھی' جس کے نتیجے کے طور پر نفیس احمد ایک سنگین جرم میں سے بال بال بچ گیا ورنہ......''

میں نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا' تو نفیس احمد نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔ ''میں تو صرف اتنا ہی کہوں گا کہ بیگ صاحب نے بھری عدالت میں کھرے کھوٹے کی پہچان کرادی ہے۔''

میں انہیں خوش باش' ہنستے مسکراتے چھوڑ کر اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔





# خوب سیرت

سیرت اور صورت عموماً ایک دوسرے کی ضد واقع ہوئی ہیں۔ بہت ہی کم ان میں اتفاق اور ہم آہنگی دیکھنے کو ملتی ہے۔ مونا میں یہ دونوں خوبیاں مجھے یک جا نظر آئی تھیں۔ وہ جتنی خوب صورت دکھائی دیتی تھی' ازاں بعد اس سے کہیں بڑھ کر خوب سیرت بھی واقع ہوئی۔ زیرِ نظر کہانی اسی میمونہ المعروف بہ مونا کی ہے۔

''کہانی'' درحقیقت معاشرے کا چہرہ ہوتی ہے۔ یہ مکھڑا حسین بھی ہوتا ہے' اور سنگین بھی۔ اس میں پڑھائے جانے والے واقعات اور دکھائے جانے والے مناظر خوش کن بھی ہو سکتے ہیں' اور کراہت آمیز بھی۔ کہانی کار کسی مخصوص سوچ یا نظریے میں بند ہو کر قلم نہیں چلاتا' بلکہ وہ معاشرتی زندگی کے مختلف گوشوں کو الفاظ کے پیراہن میں اجاگر کرتا ہے' اور اس فطری عمل میں وہ انتہائی غیر جانب دار ہوتا ہے۔ اسے کسی کی خوشنودی مقصود ہوتی ہے اور نہ ہی کسی کی دل آزاری کرنا چاہتا ہے۔ وہ سچائی کی آواز کو انسانی سماعت تک پہنچاتا ہے' اور حقیقت کو بے نقاب کر کے لوگوں کی آنکھوں کے سامنے لاکھڑا کرتا ہے اور...... اگر وہ ایسا نہیں کرتا' تو پھر وہ کھرا لکھاری نہیں' بلکہ معاشرے کے کسی مخصوص طبقے یا کسی طبقے کے مخصوص کردار کا ایجنٹ کہلائے گا۔ سنجیدہ حلقوں میں ایسے لکھنے والے کی توقیر دو کوڑی سے زیادہ کی نہیں ہوتی۔ بہرحال دنیا کے ہر معاشرے میں کھوٹے اور کھرے سکوں کی کوئی کمی نہیں۔

اب یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ میں یعنی مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ایک کامیاب وکیل ہوں اور لکھنے لکھانے سے کبھی میرا کوئی سنجیدہ یا باقاعدہ تعلق نہیں رہا۔ یہاں لکھنے سے میری مراد کہانی لکھنا ہے۔ مجھے اس بات کی بے حد خوشی ہے کہ لکھنے والوں نے میرے کیسز کی روح کو متاثر نہیں ہونے دیا۔ قارئین کی دلچسپی اور تفریحِ طبع کے لئے انہوں نے میرا بھرپور ساتھ دیا ہے۔ اس کے لئے میں ان کا بے حد مشکور ہوں۔

مونا کی کہانی کے حوالے سے اس داستان میں شامل تمام کرداروں کے نام اور مقام میں نے مکمل طور پر تبدیل کر دیئے ہیں‘ جیسا کہ میں نے اس کہانی کے مرکزی کردار کو میمونہ عرف مونا کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے۔ بعض معاشرتی کردار اتنے معروف اور ہر دلعزیز ہوتے ہیں کہ پردہ داری کے تقاضے نبھانا لازمی ٹھہرتا ہے۔

اس طویل تمہید کے بعد میں اصل واقعہ کی طرف آتا ہوں۔

ایک روز میں اپنے دفتر میں کلائنٹس کے ساتھ مصروف تھا کہ میری سیکرٹری نے انٹر کام پر بتایا۔ ’’سر! مونا صاحبہ آپ سے ملنے آئی ہیں۔‘‘

’’کون مونا......؟‘‘ میں نے سرسری لہجے میں استفسار کیا۔

سیکرٹری نے بتایا۔ ’’مسز میمونہ!‘‘

’’کیا مونا صاحبہ کا آج کا اپائنٹمنٹ تھا؟‘‘ میں نے پوچھا۔

باوجود کوشش کے بھی مجھے یاد نہ آسکا کہ سیکرٹری کس میمونہ عرف مونا کی بات کر رہی تھی‘ تاہم اس کے لہجے سے شناسائی جھلکتی تھی۔

سیکرٹری نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ’’نہیں سر! اپائنٹمنٹ تو نہیں ہے۔‘‘

’’ٹھیک ہے پھر مونا صاحبہ کو ان کی باری پر اندر بھیج دیں۔‘‘ میں نے کہا۔

’’اوکے سر!‘‘ اس نے مختصراً کہا اور انٹر کام کا ریسیور رکھ دیا۔

سیکریٹری کی آواز سے مجھے محسوس ہوا کہ میرے جواب سے اسے خاصی مایوسی ہوئی تھی۔ فوری طور پر میری سمجھ میں یہی آیا کہ یہ مونا اس کی کوئی جاننے والی ہوگی۔ خیر میں نے توجہ اپنے چیمبر میں موجود کلائنٹ کی طرف مبذول کر دی۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد جب مذکورہ کلائنٹ مطمئن ہونے کے بعد رخصت ہو گیا‘ تو میں نے سیکرٹری سے رابطہ کر



لیا۔

’’اس وقت وزیٹنگ لابی میں کتنے کلائنٹس بیٹھے ہیں؟‘‘ اس کے ’’ہیلو سر‘‘ کہتے ہی میں نے پوچھا۔

یہ سوال میں نے سیکرٹری کی ’’مایوسی‘‘ کے پیشِ نظر کیا تھا۔ میں نے یہ محسوس کیا تھا‘ کہ وہ مونا کو اس کی باری سے پہلے میرے پاس بھیجنا چاہتی تھی‘ جس کا یہی مطلب ہو سکتا تھا کہ مونا سے اس کی شناسائی ہے۔

سیکرٹری نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

’’سر! اس وقت وزیٹنگ لابی میں کُل تین افراد موجود ہیں۔ سرمد صاحب اور ان کی بیوی اپنے بیٹے کا انتظار کر رہے ہیں۔ وقار کے بغیر ان کا آپ سے ملنا سود مند نہیں ہوگا۔‘‘ وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوئی‘ پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔ ’’اور تیسری مسز میمونہ ہیں۔‘‘

’’اور تم مونا...... یا مسز میمونہ کو جانتی ہو۔‘‘

’’جی سر!‘‘ وہ پُرجوش انداز میں بولی۔

’’ٹھیک ہے۔‘‘ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ’’مسٹر اینڈ مسز سرمد کو وقار کا انتظار کرنے دو‘ فی الحال تم مونا صاحبہ کو میرے پاس بھیج دو۔‘‘

’’اوکے سر! اس نے فرماں برداری سے کہتے ہوئے ریسیور رکھ دیا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد میمونہ عرف مونا میرے چیمبر میں داخل ہوئی۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی میں چونک اٹھا۔ مونا کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا‘ جن کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ آیا‘ اس نے دیکھا‘ اور فتح کر لیا!

میں بھی مونا کی سادگی اور پرکاری سے بے حد متاثر ہوا۔ اس کی شخصیت میں ایک خاص قسم کا اعتماد پایا جاتا تھا۔ مونا کی عمر تیس پینتیس کے درمیان ہوگی۔ وہ حسن و خوبصورتی کا زندہ شاہکار تھی۔

میں نے پیشہ وارانہ مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا‘ اور اپنی میز کی دوسری جانب بچھی کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ نہایت ہی سلیقے سے

ایک طرف کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی' پھر اپنے قیمتی پرس کو میز پر رکھنے کے بعد امید بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا میری سیکرٹری سے آپ کی کوئی جان پہچان ہے؟"

"جی ...... یہاں آپ کے دفتر میں آ کر پتا چلا کہ وہ مجھے جانتی ہے۔" اس نے گول مول جواب دیا۔ "اب تو میں بھی اس سے واقف ہو گئی ہوں۔"

میں وقت ضائع کیے بغیر فوراً مطلب کی بات پر آ گیا۔

"ہاں تو مونا! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"میں ایک سنگین نوعیت کی سچویشن میں پھنس گئی ہوں۔" اس نے کرب آمیز سنجیدگی سے کہا۔ "کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کروں اور ...... کوئی نہ کوئی فیصلہ کرنا بھی ضروری ہے۔ میں اسی لیے آپ کے پاس آئی ہوں کہ آپ کوئی بہتر مشورہ دیں۔"

"آپ جس سچویشن کا شکار ہیں' وہ ہمارے ملکی قوانین کے دائرے ہی میں آتی ہے نا؟" میں نے استفسار کیا۔

"جی ہاں! ......" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "یہ سراسر ایک قانونی معاملہ ہے؟"

میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ "تو پھر سمجھیں کہ آپ بالکل ٹھیک جگہ پر آ گئی ہیں۔"

"تھینک یو بیگ صاحب؟" وہ اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا۔ "مونا صاحبہ! آپ پہلے مجھے اپنے مسئلے کے بارے میں بتائیں۔ باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔"

پھر میں نے رف پیڈ اور قلم سنبھال لیا' اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

چند لمحات کی خاموشی کے بعد' اس نے مجھے اپنے اور اپنے مسئلے کے بارے میں بتانا شروع کیا۔ میں اس کے بیان میں سے غیر ضروری باتوں کو حذف کر کے خلاصہ آپ کی



خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ میرے ساتھ ساتھ آپ بھی مونا کے مسئلے سے آگاہ ہو جائیں۔



یہ جان کر مجھے حیرت ہوئی کہ مونا کا تعلق شوبز سے تھا۔ وکالت کا پیشہ زندگی کا ایسا مصروف شعبہ ہے کہ اس سے منسلک شخص کو پھر کسی اور طرف دھیان دینے کی فرصت ہی نہیں ملتی' حتیٰ کہ اس کی فیملی کو بھی اکثر و بیشتر اس سے شکایت رہتی ہے کہ وہ اتنا وقت انہیں نہیں دیتا' جو ان کا حق بنتا ہے۔

میرے ساتھ بھی کچھ اسی قسم کی صورت حال تھی۔ میں اپنے کلائنٹس اور کیسز کے ساتھ اس قدر الجھا رہتا کہ کسی اور جانب توجہ مرکوز کرنے کی مجھے زیادہ مہلت نہیں ملتی تھی۔ ایک لحاظ سے میں اینٹی سوشل ہوتا جا رہا تھا۔ یہی سبب تھا کہ مجھے ٹی وی دیکھنے کا بھی بہت ہی کم موقع ملتا۔ ٹی وی کا استعمال میرے نزدیک نیوز تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ چنانچہ ٹی وی کے لیے اس بے رغبتی کی وجہ سے مونا کا چہرہ میری نظروں سے نہیں گزرا تھا۔ وہ ٹی وی کی خوبصورت اور خوش گلوکارہ تھی۔

مونا کے فن کے بارے میں معلومات حاصل ہونے کے بعد یہ بات بھی صاف ہو گئی' کہ میری سیکرٹری نکہت نے اس کے معاملے میں خصوصی دلچسپی کیوں لی تھی۔ وہ یقیناً مونا کو ٹی وی پر گاتے ہوئے سنتی رہتی ہو گی۔ لہٰذا جب اسے میرے دفتر میں دیکھا' تو فوراً پہچان گئی۔ میرے استفسار پر مونا نے جو مختصر ڈپلومیٹک اور مکمل جواب دیا' اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے گفتگو کا سلیقہ بھی آتا تھا' جب میں نے مونا سے پوچھا تھا کہ کیا میری سیکرٹری سے اس کی کوئی جان پہچان ہے' تو اس نے زیرلب مسکراتے ہوئے جواب میں کہا تھا' جی آپ کے دفتر میں آ کر مجھے پتا چلا کہ وہ مجھے جانتی ہے۔ اب تو میں بھی اس سے واقف ہو گئی ہوں۔

اسی ٹی وی گلوکارہ مونا نے اپنے حالات بیان کرنے سے قبل مجھ سے وعدہ لیا تھا' کہ میں اس کے معاملات کو صیغۂ راز میں رکھوں گا' اور میں نے اس سے وعدہ کرتے ہوئے یہ واضح کر دیا تھا' کہ میں ہر مؤکل کے راز کا امین ہوں' اور بے دھڑک جو چاہو' مجھ

سے کہہ سکتی ہے۔ میری یہ تسلی بھری بات سن کر وہ مطمئن ہوگئی تھی۔

مونا کی کہانی میں بڑے پیچ وخم تھے' لیکن میں چونکہ آپ سے اختصاری بیان کا وعدہ کر چکا ہوں' لہٰذا بہت زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔

مونا اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ تین افراد کی یہ فیملی گلبرگ کے علاقے میں رہتی تھی۔ صدر میں مونا کے باپ علی سلطان کی کپڑے کی دکان تھی۔ اس دکان کا کاروبار ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔ لہٰذا گھر میں کسی معاشی محرومی کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ کاروبار اپنا تھا۔ گھر ذاتی تھا' اور گھر میں اللہ کی دی ہوئی ہر نعمت موجود تھی۔ چنانچہ زندگی ہنسی خوشی بسر ہو رہی تھی۔

اس ہموار اور خوش گوار زندگی میں پہلا انتشار اس وقت پیدا ہوا' جب مونا کی والدہ سفینہ بیگم پر فالج کا اٹیک ہوا۔ یہ اٹیک اچانک اور خطرناک تھا۔ تاہم علی سلطان کی بروقت اور ان تھک کوششوں کے نتیجے میں سفینہ کو اتنا زیادہ نقصان نہیں پہنچا' جس کی اس نوعیت کی بیماری میں توقع کی جاتی ہے۔ علی سلطان نے بہترین ہسپتال میں اپنی بیوی کا پرائیویٹ علاج کروایا' اور فالج کے اٹیک کو بڑی حد تک سنبھال لیا گیا۔ اس بیماری کے خوفناک اثرات سفینہ کے نچلے دھڑ تک ہی محدود رہے۔ وہ موت کے منہ میں جانے سے تو بچ گئی' تاہم چارپائی کی ہو کر رہ گئی تھی۔ علی سلطان اور مونا نے اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ سفینہ بیگم زندہ ان میں موجود تھی۔

جن دنوں سفینہ بیگم پر فالج کا اٹیک ہوا' مونا میٹرک میں تھی۔ ظاہر ہے' اس ناگہانی افتاد کے باعث اس کی اسٹڈی بری طرح متاثر ہوئی تھی' مگر اس نے ہمت نہیں ہاری' اور کوشش کر کے میٹرک کر لیا۔

علی سلطان نے اپنی بیوی کی دیکھ بھال اور نگہداشت کے لیے ایک ملازمہ بھی رکھ لی تھی' جو دن بھر سفینہ بیگم کے ساتھ رہتی تھی۔ مذکورہ ملازمہ پڑھی لکھی ہونے کے علاوہ خاصی سمجھ دار بھی تھی' اور اسے مریضوں کو سنبھالنے کا وسیع تجربہ تھا۔ اس ملازمہ کی آمد کے بعد علی سلطان اور مونا کافی مطمئن ہو گئے تھے۔

مونا نے انٹر کے بعد گریجویشن بھی کر لیا' لیکن سفینہ بیگم کی کیفیت میں کوئی بہتری نہ



آ سکی۔ ڈاکٹر علاج تو کر رہے تھے' لیکن ان کے انداز میں وہ پہلے والی چستی اور اعتماد دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ان کے انداز اور باتوں سے جھلکتا تھا کہ سفینہ بیگم کو باقی کی زندگی اسی معذوری کے ساتھ گزارنی ہوگی۔

اگرچہ ڈاکٹروں نے اپنی زبان سے یہ مایوسانہ بات نہیں کی تھی' تاہم علی سلطان سمجھ گیا تھا' کہ حالات کس طرف جا رہے ہیں۔ علی سلطان ہمت اور حوصلے والا شخص تھا۔ جب ڈاکٹروں نے مایوسی اختیار کی' تو اس نے اپنے کسی مخلص دوست کے اصرار پر ایک مستند اور تجربہ کار حکیم سے رجوع کیا۔ مذکورہ حکیم کی بڑی شہرت تھی۔

حکیم صاحب نے مریض کا تفصیلی معائنہ فرمایا۔ اس کے بعد علی سلطان کا مفصل انٹرویو بھی کیا' اور کافی سوچ بچار کے بعد کہا۔ ’’آپ نے میرے پاس آنے میں کافی دیر کر دی ہے۔ بہرحال' میں کوشش کرتا ہوں۔ آگے اللہ مالک ہے۔‘‘

’’یعنی آپ زیادہ پُرامید نہیں ہیں؟‘‘ علی سلطان نے گمبھیر لہجے میں پوچھا۔

’’میں اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوں سلطان صاحب!‘‘ حکیم صاحب نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ’’لیکن جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہے' آپ نے مجھ سے رجوع کرنے میں خاصی تاخیر کر دی ہے۔ مریض کئی سال سے اس بیماری میں مبتلا ہے۔ کسی بھی بیماری کے لیے اس کی پسندیدہ رہائشی جگہ مریض کا جسم ہوتی ہے۔ اگر اسے جسم کے اندر خوش آمدید کہا جائے' تو اس کی تئیں' اس سے اچھی اور کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ آرام وسکون سے مریض کے بدن میں ڈیرے ڈال کر بیٹھ جاتی ہے۔ میری تشخیص کے مطابق فالج مریض کے جسم کے نچلے حصے میں ٹھہر گیا ہے۔ اسے وہاں سے بھگانا اتنا آسان نہیں ہو گا۔‘‘

حکیم صاحب کے فتوے کو سننے کے بعد علی سلطان نے کہا۔ ’’لیکن حکیم صاحب! میں نے سفینہ کے علاج کے سلسلے میں ایک لمحے کی غفلت نہیں برتی۔ اپنا وقت اور پیسہ دل کھول کر صرف کیا ہے۔ اچھے سے اچھے ڈاکٹر کو دکھایا ہے' اور مہنگے سے مہنگا علاج کروایا ہے' اور کئی سال گزر جانے کے بعد بھی علاج جاری ہے' اس میں ایک دن کا بھی ناغہ نہیں ہوا۔‘‘

"علاج' علاج میں بڑا فرق ہوتا ہے سلطان صاحب!" حکیم صاحب نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ "میں ڈاکٹروں کے علاج سے واقف نہیں ہوں کہ اتنے سالوں میں دیکھا ہے' کہ انگریزی دواؤں سے عموماً مرض کو دبا دیا جاتا ہے اور مریض سمجھتا ہے' وہ ٹھیک ہو گیا۔ حالانکہ مرض بدن کے اندر ہی چھپ کر کہیں بیٹھ جاتا ہے' اور کچھ عرصے کے بعد شکل بدل کر ایک نئی بیماری کی صورت میں ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔"

اس ملک میں بسنے والے لوگوں کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے' کہ اپنے آپ کو بہتر اور برتر ظاہر کرنے کے لیے کسی نہ کسی کی برائی اور کمتری یا کوتاہی ضرور بیان کرتے ہیں' اور یہ سب رویہ پیشہ ورانہ شعبوں میں کچھ زیادہ ہی نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ حالانکہ اگر دوسروں کی خامیاں گنوانے کے بجائے اپنے کام پر توجہ دی جائے' تو نہ صرف یہ کہ وہ کام مزید نکھر جائے گا' بلکہ اگر کہیں کوئی چھوٹی موٹی خامی موجود بھی ہے' تو وہ اس توجہ کے باعث خوبی میں بدل جائے گی۔

مسابقت کا یہ عمومی منفی رویہ طب کے شعبے میں بھی نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر حضرات عموماً حکیموں کے علاج اور ادویہ کو قابل بھروسا نہیں سمجھتے۔ ان کے خیال میں جڑی بوٹیوں' مختلف معدنیات اور نمکیات کو کوٹ چھان کر دوائی کے طور پر استعمال کروانا انتہائی خطرناک ہے۔ ادویہ کو کسی کنٹرول کے تحت مستند لیبارٹریز ہی میں تیار ہونا چاہیے۔ بعض انتہا پسند ڈاکٹر تو یہاں تک بھی کہہ دیتے ہیں کہ یہ طریقہ علاج انسان کی زندگی سے کھیلنے کے مترادف ہے۔ اس کے جواب میں بعض حکماء بھی ڈاکٹروں کے بارے میں بڑی خراب رائے رکھتے ہیں۔ ازیں علاوہ ان ڈاکٹروں اور حکیموں کے اپنی برداری میں بھی کئی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ ایک ڈاکٹر دوسرے ڈاکٹر کو برا کہتا ہے' اور ایک حکیم دوسرے کو نا تجربہ کار۔ یہ وہی منفی مسابقت ہے' جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے' اور سب سے زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ یہ خطرناک منفی وصف ہماری زندگی کے ہر شعبے' اور معاشرے کے ہر طبقے میں بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔

حکیم صاحب کے گمبھیر خیالات سننے کے بعد علی سلطان نے پوچھا۔ "حکیم صاحب! تو آپ کب سے علاج شروع کر رہے ہیں؟"



"علاج تو ابھی اور اسی وقت شروع ہو سکتا ہے۔" حکیم صاحب نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "لیکن اس کے لیے میری ایک شرط ہوگی۔"

"جی......!" علی سلطان نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

حکیم صاحب نے حتمی لہجے میں فرمایا۔ "میری دوا کے ساتھ آپ مریض کو اور کسی کی دوا استعمال نہیں کروائیں گے۔"

"اس کا مطلب ہے ڈاکٹروں کا علاج روکنا ہوگا؟" علی سلطان نے استفساریہ انداز میں کہا۔

"روکنا نہیں...... بلکہ چھوڑنا ہوگا۔" حکیم صاحب اٹل لہجے میں بولے۔

"مگر صرف انجکشن لگتا ہے' اور چند گولیاں ہیں......" علی سلطان نے نیم معترض انداز میں کہا۔

"انجکشن تو اس مرض میں انتہائی خطرناک ہے۔" حکیم صاحب نے ایک اور فتویٰ صادر فرمایا۔ "میں تو اپنی دوا کے ساتھ کسی دوسرے معالج کی دی ہوئی ایک گولی استعمال کرانے کے حق میں بھی نہیں ہوں۔"

علی سلطان اپنی بیوی کی جزوی معذوری سے بے حد پریشان تھا۔ ہر معقول شوہر ایسے معاملات میں پریشان ہوتا ہی ہے۔ علی سلطان کی دلی خواہش تھی کہ جیسے بھی ہو' اس کی بیوی بھلی چنگی ہو جائے۔ جب انسان "جیسے بھی ہو" والی سچویشن میں مبتلا ہو' تو پھر وہ بڑے سے بڑا فیصلہ بھی بہ آسانی کر لیتا ہے۔

اس نے قبلہ حکیم صاحب کی بات پوری توجہ سے سنی اور ان کے خاموش ہونے پر کہا۔ "ٹھیک ہے حکیم صاحب! میں آج ہی سے ڈاکٹری علاج بند کر دیتا ہوں۔ آپ مجھے یقین دلائیں کہ آپ کی دوا استعمال کرنے سے میری بیوی اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جائے گی۔"

"یقین دلاؤں......!" علی سلطان نے بات سنبھالنے کی کوشش کی۔ "کوئی تو ایسی امید ہو کہ......"

"آپ نے پچھلے چار پانچ سال سے اپنی بیوی کو ڈاکٹروں کے علاج پر ڈال رکھا

ہے۔'' حکیم صاحب قطع کلامی کرتے ہوئے خفگی آمیز لہجے میں بولے۔'' اور فائدے کا عالم یہ ہے کہ وہ بے چاری ابھی تک بستر سے اٹھنے کے قابل بھی نہیں ہوئی...... اور میرا علاج شروع ہونے سے پہلے ہی آپ کو گارنٹی چاہیے۔ کیا آپ نے ڈاکٹروں اور ہسپتال والوں سے بھی مریض کی صحت یابی کی کوئی گارنٹی مانگی تھی؟''

''آپ ناراض نہ ہوں حکیم صاحب!'' علی سلطان نے معذرت بھرے لہجے میں کہا۔'' میں نے پریشانی میں ایسا کہہ دیا ہے۔''

حکیم صاحب نے دوٹوک انداز میں کہا۔'' سلطان صاحب! پہلی بات تو یہ کہ میرے علاج کے ساتھ کسی اور معالج کی دوا نہیں چل سکتی۔ دوسری بات یہ کہ میں اس سلسلے میں آپ کو کوئی گارنٹی نہیں دے سکتا۔ میں ان معالجین میں سے نہیں ہوں جو ''شرطیہ علاج'' اور ''منی بیک گارنٹی'' جیسے نعرے لگاتے ہیں۔ مرض گھوڑے کی رفتار سے آتا ہے' اور جوں کی رفتار سے جاتا ہے!''

''لیکن اس جوں کو رینگتے ہوئے بھی چار پانچ سال ہو گئے ہیں۔'' علی سلطان نے دکھی لہجے میں کہا۔''اس کی رفتار کو......''

حکیم صاحب نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔''سلطان میاں! اگر تمہاری بیوی پچھلے چار پانچ سال سے محتاجی کی زندگی گزار رہی ہے' تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ یہ سوال تو تمہیں ان ڈاکٹروں سے پوچھنا چاہیے' جو ایک طویل عرصے سے اس کا علاج کر رہے ہیں۔'' اس کے لہجے میں طنز کی آمیزش تھی۔ ایک لمحے کے لیے توقف کے بعد اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔''بہرحال میں نے تمہاری بیوی کا تفصیلی معائنہ کر لیا ہے' تم اچھی طرح سوچ سمجھ کر کوئی فیصلہ کرنا' میں کسی قسم کی کوئی گارنٹی تو نہیں دے سکتا' البتہ اللہ کے گھر سے مجھے امید ہے کہ میرے علاج سے تمہاری بیوی بالکل ٹھیک ہو جائے گی' لیکن یہ دنوں کا کھیل نہیں۔ اس میں دو چار مہینے یا اس سے زیادہ وقت بھی لگ سکتا ہے۔'' وہ ایک مرتبہ پھر متوقف ہوا' اور ایک گہری سانس خارج کر کے اور اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔'' اگر تمہارا ارادہ بن جائے تو میرے مطب پر آ کر بتا دینا۔ میں علاج کے سلسلے کی ابتدائی دوائیں تمہیں دے دوں گا' اب میں چلوں گا۔''



علی سلطان اور اس کے مشیروں کا یہ متفقہ فیصلہ سب سے زیادہ حکیم صاحب کے لیے سود مند ثابت ہوا' کیونکہ دس روز بعد ہی سفینہ بیگم کا انتقال ہو گیا۔ موت برحق ہے' اور اس کا ایک وقت مقرر بھی ہے۔ جب سفینہ کی موت کا وقت آیا' تو وہ چل بسی' حکیم صاحب اس حوالے سے خوش قسمت رہے کہ انہیں متوفی کے علاج کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ اگر وہ علی سلطان کی آمادگی پر سفینہ کو دیسی دوائیں دے دیتے' تو عین ممکن تھا' یہ خیال کیا جاتا کہ سفینہ کی موت کے ذمے دار وہی ہیں۔ ایسے موقع پر زبان خلق کو پکڑا نہیں جا سکتا' اور لوگوں کا عمومی رجحان کچھ اس قسم کا ہوا کرتا ہے۔

سفینہ بیگم کی موت نے علی سلطان کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ رفتہ رفتہ اس صدمے میں کمی واقع ہوتی گئی۔ مونا کا حال بھی اپنے باپ سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھا' تاہم ان دونوں نے ایک دوسرے کی خاطر خود کو سنبھالنا شروع کر دیا۔ انسان کسی کام کے لیے کوشش کرے' تو اس کی کوشش ضرور رنگ لاتی ہے۔ ایک سال کے اندر اندر وہ دونوں نارمل ہو گئے۔ زندگی واپس اپنی ڈگر پر آ گئی۔ اسی رفتار سے ایک آدھ سال گزر گیا۔ اس کے بعد ان دونوں کے خصوصاً مونا کی زندگی میں ایک نیا موڑ آیا۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے' علی سلطان کی صدر کے علاقے میں کپڑے کی دکان تھی۔ اس کے مستقل گاہکوں میں' یامین شاہ نامی ایک شخص بھی شامل تھا' اور وہ اس کا ایک اچھا گاہک تھا۔ وہ جب بھی دکان پر آتا تو چار پانچ سوٹ سے کم نہیں خریدتا تھا' اور اکثر و بیشتر وہ اپنے دوستوں کو بھی ساتھ لاتا تھا' اور ظاہر ہے اس کے دوست بھی زیادہ نہ سہی' ایک ایک دو دو سوٹ کا کپڑا ضرور خریدتے تھے۔ اس تناظر میں علی سلطان یامین شاہ کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔

ایک دفعہ علی سلطان کسی شادی میں مدعو تھا۔ اس نوعیت کی تقریبات میں وہ مونا کو بھی اپنے ساتھ رکھتا تھا' تاکہ اس کا دل بہلا رہے' اور وہ خود کو دنیا کی بھیڑ میں تنہا محسوس نہ کرے۔ سفینہ کے انتقال کے بعد اسے باپ کے علاوہ ماں کا کردار بھی ادا کرنا پڑ رہا تھا۔ بچے چاہے کتنے بھی بڑے کیوں نہ ہو جائیں انہیں ماں کی ہمیشہ ضرورت رہتی ہے۔

اسی تقریب میں علی سلطان کو یامین شاہ نظر آ گیا۔ دونوں کی نظریں ملیں تو یامین انہی

کی طرف آ گیا' پھر وہ بھی اس میز پر بیٹھ گیا' جہاں علی سلطان اور مونا بیٹھے ہوئے تھے۔ اگلے ہی لمحے ان لوگوں میں شائستہ گفتگو ہونے لگی۔

دنیا جہاں کی باتوں کے دوران علی سلطان نے اپنی بیوی کی طویل بیماری اور پھر انتقال کے بارے میں بتایا۔ مونا کو اپنی اکلوتی اولاد کی حیثیت سے بھی متعارف کرایا۔ علاوہ ازیں مونا کو بھی بتایا کہ یامین شاہ اس کی دکان پر سب سے زیادہ معتبر کسٹمر ہے۔ اس روز وہ ایک فیملی کی طرح گھل مل کر باتیں کرتے رہے' اور خوشی خوشی وہاں سے رخصت ہوئے۔

اگلے روز چھٹی کا دن تھا۔ اس کے بعد جب علی سلطان نے اپنی دکان کھولی تو اس کا پہلا گاہک یامین شاہ ہی تھا۔ یامین عموماً شام کے وقت اس کی دکان پر آیا کرتا تھا۔ اتنی صبح (صدر کی صبح عموماً گیارہ بارہ بجے ہوتی ہے) اپنی دکان پر اسے دیکھ کر علی سلطان کو حیرت ہوئی' تاہم اس نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا۔

یامین شاہ نے اس کی دکان کے اندر آنے کے بعد کہا۔ ''سلطان صاحب! آپ مجھے اپنی دکان میں دیکھ کر اس قدر حیران کیوں ہو رہے ہیں؟''

''آپ کبھی اتنی صبح آئے نہیں ہیں نا...... اس لیے!'' علی سلطان نے نرمی سے کہا۔

''وہ دراصل بات یہ ہے کہ......'' یامین شاہ نے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''جو لڑکا میری دکان کھولتا ہے' وہ تھوڑا لیٹ ہو گیا ہے۔ اس وقت دکان میں صفائی ستھرائی کا کام ہو رہا ہے۔ میں نے سوچا کہ آپ کے پاس بیٹھ کر تھوڑی گپ شپ لگائی جائے۔''

یامین شاہ اسلحہ ڈیلر تھا۔ لکی اسٹار کے قریب ''شاہ ٹریڈرز'' کے نام سے اس کی دکان تھی' جہاں وہ باقاعدہ لائسنس رکھنے والوں کو ہتھیار اور ان کے راؤنڈز فروخت کرتا تھا۔ علی سلطان کی دکان یامین شاہ کی دکان سے تین چار گلیوں کے فاصلے پر تھی۔

علی سلطان نے کہا۔ ''میں تو یہی دیکھ کر حیران ہوا تھا' کہ اتنی صبح آپ خریداری کے لیے کیسے آ گئے۔''

''خریداری کے لیے تو میں آیا ہی کرتا ہوں۔'' یامین شاہ نے ذومعنی انداز میں کہا۔ ''کبھی کسی اور مقصد کے لیے بھی آ جانا چاہیے۔ آپ کیا کہتے ہیں؟''



''ہاں' ہاں' کیوں نہیں ضرور......!'' علی سلطان نے جلدی سے کہا' مگر سوچ میں پڑ گیا کہ یامین شاہ نے ایسی مبہم بات کیوں کی ہے۔

آج سے پہلے وہ کبھی گپ شپ کرنے اس کی دکان پر نہیں آیا تھا۔ آج ایسی کیا بات تھی۔ اس لمحے علی سلطان کو ایک روز پہلے والی ملاقات یاد آ گئی' جب وہ لوگ شادی کی تقریب میں ملے تھے' اور خوب شیر و شکر ہو کر انہوں نے باتیں کی تھیں۔ علی سلطان نے سوچا' شاید یہ آمد اسی بے تکلفی کی ہی کوئی کڑی ہے۔

علی سلطان کے ذہن میں یامین شاہ کی یہ بات بھی اٹکی ہوئی تھی۔ ''خریداری کے لئے تو میں آیا ہی کرتا ہوں' کبھی کسی اور مقصد کے لئے بھی آ جانا چاہیے۔''

علی سلطان نے اس سے پوچھا۔ ''آج کل اسلحے کا بزنس کیسا چل رہا ہے؟''

''ہمارا بزنس تقریباً ایک ہی جیسا رہتا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''عموماً ہمارے پاس لگے بندھے گاہک آتے ہیں' ان میں بھی زیادہ تعداد شکار کے شوقین افراد کی ہوتی ہے' جن کے پاس بڑی عمدہ قسم کی شکاری رائفلیں ہوتی ہیں' اور وہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں بھی رہتے ہیں۔ اس لیے ہمارے پاس جیسے ہی کوئی امپورٹڈ پیس آتا ہے' وہ ہاتھوں ہاتھ نکل جاتا ہے' بلکہ بعض لوگوں نے تو پہلے سے ہی فرمائش کر رکھی ہوتی ہے' کہ وہ فلاں رائفل یا فلاں گن ہاتھ لگے تو ان کے لیے رکھ لی جائے۔'' وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے موقف ہوا' پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ''علاوہ ازیں ہماری دکان پر گن کی ریپئرنگ کا بھی کام تسلی بخش ہوتا ہے۔ کبھی آپ ادھر کا چکر لگائیں نا۔ میں آپ کو ایک سے بڑھ کر ایک آئٹم دکھاؤں گا۔''

''انشاء اللہ! میں ضرور چکر لگاؤں گا۔'' علی سلطان نے اس کا دل رکھنے کے لیے کہا۔

یامین شاہ نے پوچھا۔ ''ویسے تو آپ کو کون سی گن پسند ہے؟''

مجھے اسلحے وغیرہ کا شوق نہیں رہا۔'' علی سلطان نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سادگی سے کہا۔

''اسلحہ تو مرد کی شان ہے جناب!'' وہ فخریہ انداز میں بولا۔ ''وقت کے ساتھ ساتھ

ہر شے کا مزاج اور انداز بدل گیا ہے۔ کسی زمانے میں گھوڑا اور تلوار مرد کی شناخت اور شان ہوا کرتے تھے' ان کی جگہ گاڑی اور ہتھیار نے لے لی ہے' اور یہ دونوں چیزیں وقت کی ضرورت بھی ہیں۔"

"میں آپ کی بات سے اختلاف تو نہیں کروں گا شاہ جی۔" علی سلطان نے معتدل لہجے میں کہا۔ "واقعی' آج کل کی زندگی میں ان دونوں چیزوں کا بڑا عمل دخل ہے' یا دوسرے الفاظ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ موجودہ دور کی ضرورت ہیں۔ میرے پاس گاڑی تو ہے' لیکن اسلحے وغیرہ سے میں نے ہمیشہ پرہیز ہی کیا ہے۔"

"آپ کبھی میری دکان پر آئیں گے' تو میں آپ کو ایک خوب صورت چھوٹی سی گن دکھاؤں گا۔" یامین شاہ نے اکسانے والے انداز میں کہا۔ "جرمنی میڈ ہے۔ ایزی ہینڈل' لائٹ ویٹ اور لباس میں چھپانا انتہائی آسان۔ آپ اس گن کو ہاتھ میں لے کر دیکھیں گے تو آپ کی طبیعت باغ باغ ہو جائے گی۔ مجھے امید ہے' آپ اس کی لس اور چھب سے ایسے متاثر ہوں گے کہ پرہیز توڑنے پر مجبور ہو جائیں گے۔"

علی سلطان کو اس کی کاروباری باتیں سن کر یقین ہو گیا کہ وہ ایک کامیاب اسلحہ ڈیلر تھا' جس طرح گھر آئے ہوئے مہمان کا دل توڑنا اچھا نہیں سمجھا جاتا' بالکل اسی طرح دکان پر آئے ہوئے یامین شاہ کی دل شکنی علی سلطان کو مناسب نہ لگی' چنانچہ اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"شاہ جی! میں ایک آدھ روز میں ضرور آپ کی دکان پر آؤں گا' اور اس گن کا دیدار کروں گا۔ جس کی آپ نے اتنی تعریفیں کی ہیں اور ...... اگر اس گن نے واقعی میرا دل موہ لیا' تو خرید بھی لوں گا' لیکن ایک گمبھیر مسئلہ ہے۔"

علی سلطان نے متفکرانہ انداز میں بات مکمل کی' تو شاہ جی نے جلدی سے پوچھا۔

"کیا مسئلہ ہے جناب؟"

"میرے پاس اسلحے کا لائسنس وغیرہ تو نہیں ہے۔" وہ متاملانہ لہجے میں بولا۔ "کیا آپ لائسنس کے بغیر بھی اسلحہ فروخت کرتے ہیں؟"

"سچی بات بتاؤں سلطان صاحب!" یامین شاہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "میں نے



بزنس میں ایمان داری کو ہمیشہ شامل رکھا ہے' اور اسلحے کی فروخت کے لیے حکومت پاکستان نے جو بھی قوانین رکھے ہیں' میں ان کی پوری پاس داری کرتا ہوں۔ میری دکان پر کسی نوعیت کی کوئی بے قاعدگی آپ کو دیکھنے کو نہیں ملے گی' اور جہاں تک آپ کے لائسنس کا تعلق ہے' تو اس کا بھی کوئی نہ کوئی بندوبست ہو ہی جائے گا۔ آپ کے ساتھ تو گھر والی بات ہے۔"

"گھر والی بات۔" ان الفاظ نے علی سلطان کو ایک مرتبہ پھر چونکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ اچھی طرح سمجھ گیا کہ یامین شاہ آج اس کی دکان پر کسی اور ہی مقصد سے آیا ہے' وہ اس سے کوئی خاص بات کہنا چاہتا ہے' اور اسلحے کے موضوع پر گفتگو کر کے وہ مذکورہ بات کے لیے گراؤنڈ بنا رہا ہے۔' ایسی کون سی بات ہو سکتی تھی؟' یہ سوال علی سلطان کو مسلسل ستا رہا تھا۔

اس نے کرید کے سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ "شاہ جی! آپ میرے لیے لائسنس کا بندوبست کریں گے۔ آج کل تو ہر قسم کے اسلحے کے لائسنس پر گورنمنٹ نے پابندی لگا رکھی ہے؟"

"گورنمنٹ کی پابندی اپنی جگہ۔" وہ معنی خیز انداز لہجے میں بولا۔ "میں اگر چاہوں تو اس پابندی کے دوران بھی آپ کے لیے لائسنس کا انتظام ہو جائے گا۔"

"آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی شاہ جی!" علی سلطان نے متذبذب لہجے میں کہا۔ "آپ پوری ایمان داری اور اسلحے کی فروخت کے قوانین کے اندر رہتے ہوئے دکان چلاتے ہیں' پھر حکومت کی جانب سے عائد کردہ پابندی کے باوجود بھی کس طرح میرے لیے لائسنس ......!"

"میں سمجھاتا ہوں آپ کو۔" وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔ "بات دراصل یہ ہے کہ لائسنس ٹرانسفر کا آفس ہر وقت کھلا رہتا ہے۔ گورنمنٹ نے نئے لائسنس کے اجراء پر پابندی عائد کر رکھی ہے' مگر لائسنس کی خرید و فروخت کے لیے ایسی کوئی قدغن نہیں ہے۔ کوئی شخص اپنی مرضی سے اپنا لائسنس کسی دوسرے شخص کے نام ٹرانسفر کرا سکتا ہے۔ بس احتیاطاً "خرید و فروخت" کے الفاظ کے بجائے "ٹرانسفر" کی ٹرم استعمال ہوتی ہے۔"

اس صورت میں تو ظاہر ہے' لائسنس فروخت کرنے والا اچھی خاصی رقم وصول کرتا ہو گا' جس کا باقاعدہ کہیں اندراج یا حساب بھی نہیں ہوتا ہوگا۔" علی سلطان نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

"بے شک ایسا ہی ہوتا ہے۔" یامین شاہ تائیدی لہجے میں بولا۔ "لیکن آپ اس سلسلے میں فکرمند نہ ہوں۔ میں آپ کی زیادہ رقم خرچ نہیں ہونے دوں گا۔ سمجھ لیں کہ عام لائسنس فیس پر ہی آپ کا کام ہو جائے گا۔"

"مگر کیسے......؟" سلطان نے الجھن زدہ حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "بات دراصل یہ ہے جناب کہ بعض لوگ جن کی سیاسی اور سماجی حلقوں میں بڑی گہری رسائی ہوتی ہے' اور حکومت کے بااثر افراد سے بھی روابط ہوتے ہیں' وہ موقع محل دیکھ کر اپنے لیے ایک سے زائد لائسنس حاصل کر لیتے ہیں۔ بعد ازاں' وہ اپنی ضرورت کے تحت انہیں فروخت نہیں کرتے' بلکہ اپنے پاس ہی رکھتے ہیں' یا اپنے کسی جاننے والے کے نام تحفتاً ٹرانسفر کروا دیتے ہیں۔ میں ایسے ہی ایک شخص سے آپ کے لیے بھی لائسنس حاصل کرلوں گا۔"

"جب میں ایسے کسی شخص کو اور وہ شخص مجھے جانتا ہی نہیں' تو اپنا لائسنس وہ کیسے میرے نام ٹرانسفر کردے گا؟" علی سلطان نے ایک اہم سوال اٹھایا۔

یامین شاہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "میرے خیال میں' آپ ایک ایسے شخص کو اچھی طرح جانتے ہیں' اور وہ بھی آپ سے بہ خوبی واقف ہے!"

"ایسا شخص کون ہوسکتا ہے شاہ جی!" علی سلطان الجھ کر رہ گیا۔

"آپ اس کا نام بھی لے رہے ہیں۔" یامین شاہ نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ "اور یہ بھی پوچھ رہے ہیں' ایسا شخص کون ہوسکتا ہے......؟"

"نام لے رہا ہوں......" علی سلطان کی الجھن دوچند ہوگئی۔ "یعنی ......شاہ جی......! آپ......؟"

"بالکل صحیح پہچانا۔" وہ ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ "میرے پاس دو تین لائسنس پڑے ہیں' میں ان میں سے ایک آپ کے نام ٹرانسفر کردیتا ہوں۔"

"لیکن......؟"

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔" علی سلطان نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا' کہ یامین شاہ نے حتمی لہجے میں کہا۔ "آپ انکار نہیں کریں گے۔ آپ اس لائسنس اور اسی چھوٹی سی گن کو میری جانب سے ایک تحفہ سمجھ کر رکھ لیں گے۔ میں اس سلسلے میں آپ سے ایک پیسہ وصول نہیں کروں گا۔"

"مگر تحائف کا بدلہ دوطرفہ ہوتا ہے۔!" علی سلطان نے متذبذب لہجے میں کہا۔ "آپ کی یہ پیشکش میری سمجھ میں سے بالاتر ہے۔"

یامین اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "میں آپ سے بالکل اتفاق کرتا ہوں کہ تحائف کا تبادلہ یک طرفہ نہیں ہوا کرتا۔ اس سلسلے میں نے آپ پر کوئی پابندی تو عائد نہیں کی۔ اگر آپ بھی مجھے محبت سے کوئی تحفہ دیں گے تو میں اسے خوشی سے قبول کرلوں گا۔"

"تو پھر پہل میری طرف سے ہوگی۔" علی سلطان نے پرجوش انداز میں کہا۔

"کپڑا تو آپ اکثر میری دکان سے لے جاتے ہیں۔" علی سلطان نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آپ کے تحفے کے لیے کوئی منفرد اور نئی چیز ہونی چاہیے۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔" یامین شاہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "میں آپ کی طرف سے آنے والے تحفے کا انتظار کروں گا' اس کے بعد ہی وہ خوب صورت گن مع لائسنس آپ کی خدمت میں پیش کروں گا' اس دوران میں' میں ٹرانسفر والا دستاویزی کام نمٹا لیتا ہوں۔"

"ہاں' یہ بالکل مناسب رہے گا۔" علی سلطان نے تائیدی انداز میں کہا۔

یامین شاہ بڑی محبت سے ہاتھ ملا کر رخصت ہوگیا۔



ہر گزرتے دن کے ساتھ ان کے درمیان دوستی گہری ہوتی چلی گئی۔ تحفے تحائف کے تبادلے کا ایسا سلسلہ چل نکلا تھا' جس نے ان کی باہمی دوستی کو دکان سے گھر تک پہنچا دیا۔ یامین اکثر چھٹی کے روز علی سلطان کے گھر چلا جاتا۔ پہلے پہل تو وہ مونا سے سلام دعا کی حد تک ہی علیک سلیک کرتا تھا' اس کا زیادہ تر وقت علی سلطان سے گپ شپ میں گزرتا' لیکن پھر وقت کے اس تناسب میں رفتہ رفتہ تبدیلی آنے لگی۔

اب بھی وہ ملنے تو علی سلطان ہی سے جاتا' لیکن وہ زیادہ گفتگو مونا سے کرنے لگا تھا۔ مونا بھی اس سے اچھی خاصی گھل مل گئی تھی' بلکہ بے تکلف ہوگئی تھی کہیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس دوران یامین شاہ نے کبھی مونا کو بیٹی کہا تھا' اور نہ ہی مونا نے کبھی اسے انکل کہنے کی زحمت گوارا کی تھی۔ وہ بے تکلف دوستوں کی طرح ایک دوسرے کے قریب ہوتے جارہے تھے۔

ان کی بڑھتی ہوئی یہ قربت جلد ہی علی سلطان کی نگاہ میں آگئی۔ اس نے بیٹی کو سمجھانے کی کوشش کی اور نہ ہی یامین سے کوئی گلا شکوہ کیا' بلکہ ایک روز تنہائی میں اس نے کسی تمہید کے بغیر دوٹوک انداز میں بات کرنے کا فیصلہ کیا' اور یامین سے پوچھا۔ "شاہ جی ایک بات سچی سچی بتائیں؟"

"آپ نے پوچھا بے لوث اور بے تکلف دوستی ہے۔"

یامین شاہ نے جواب دیا۔ "جھوٹی جھوٹی کچھ بتانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پوچھیں' آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔"

"میں نے محسوس کیا ہے کہ پچھلے کچھ عرصہ سے آپ مونا میں گہری دلچسپی لے رہے





ہیں۔"

"پچھلے کچھ عرصہ نہیں' بلکہ اس روز سے جب تقریب میں ہم پہلی مرتبہ ایک دوسرے سے متعارف ہوئے تھے۔" یامین شاہ نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "کیا آپ نے محسوس کیا کہ مونا کا بھی رجحان بڑے واضح انداز میں میری طرف ہے؟"

"ہاں' میں نے اس کی دلچسپی اور سنجیدگی کو نوٹ کیا ہے۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "اس لئے میں نے آج آپ سے واضح بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ آپ نے اس سلسلے میں اپنے طور پر کیا سوچ رکھا ہے؟"

یامین شاہ نے چند لمحات تک خاموش رہنے کے بعد جواب دیا۔ "یہ بڑی اچھی بات ہے کہ ہم آپس میں ہمدرد اور مخلص دوست ہیں' لہٰذا مجھے اپنے دل کی بات کہنے میں کوئی دشواری یا دقت محسوس نہیں ہوگی۔" وہ لمحے بھر کے لئے متوقف ہوا' ایک گہری سانس خارج کرکے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "سچی بات تو یہ ہے کہ پہلی ملاقات میں مونا نے مجھے بہت زیادہ متاثر کیا تھا' اور اسی وقت سے میں نے سوچ لیا تھا' کہ ایک نہ ایک دن میں اسے اپنی زندگی میں شامل کرکے رہوں گا۔ لہٰذا میں نے ایک خاص پلاننگ کے تحت پیش قدمی شروع کردی۔"

وہ ایک مرتبہ پھر تھما' ٹٹولتی ہوئی نظروں سے علی سلطان کے چہرے کا جائزہ لیا' جیسے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کررہا ہو کہ اسے اس کی بات ناگوار تو نہیں گزر رہی۔ علی سلطان نے صاف نیت اور سچے دل کے ساتھ اس کے ساتھ دوستی کی تھی' لہٰذا اس کی بات بری لگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ یامین شاہ پر ایک مخلص دوست ہونے کے ناتے اندھا اعتماد کرتا تھا۔ یامین شاہ نے مطمئن ہونے کے بعد دوبارہ بولنا شروع کیا۔ "آپ سے اچھی علیک سلیک تو تھی ہی' میں نے اپنے نیک مقصد کے حصول کے لئے بڑے دھیمے انداز میں آپ کی طرف بڑھنا شروع کیا' چنانچہ وہ علیک سلیک' گہری دوستی میں بدل گئی' اس طرح مجھے آپ کے گھر میں آنے جانے کا موقع ملا۔ مونا کے قریب آنے کے لئے اور اس کا دل جیتنے کے لئے یہ سب ضروری تھا' اور خدا کا شکر ہے۔" اس نے ایک آسودہ اور گہری سانس خارج کی' پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔ "مجھے اپنی کوشش اور خدا کی مدد پر

پورا بھروسہ تھا' لہٰذا میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ آج ہم دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں' دل سے پسند کرتے ہیں' اور شادی کرنا چاہتے ہیں۔ دیٹس آل۔"

علی سلطان نے توجہ سے اس کی بات سنی' اور آخر میں گمبھیر لہجے میں بولا۔" شاہ جی اس وقت میری شخصیت دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ایک طرف میں آپ کا دوست ہوں' تو دوسری جانب مونا کا باپ بھی' اور مونا کی ماں بھی ہوں۔ آپ کی اور آپ کے دل کی بات میں نے اچھی طرح سن لی۔ اب میں اس موقع پر مونا سے بات کروں گا' اس کے بعد ہی کسی فیصلے پر پہنچ پاؤں گا۔"

ٹھیک ہے۔ یہ تو آپ کا حق ہے۔" یامین شاہ نے گہری سنجیدگی سے کہا۔" میں بڑی بے چینی سے آپ کے فیصلے کا انتظار کروں گا۔"

فیصلے والی بات تو علی سلطان نے رسماً ہی کہی تھی' ورنہ وہ حالات کے رخ کو بڑی اچھی طرح دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک دکاندار تھا۔ روزانہ بھانت بھانت کے لوگوں سے اس کا واسطہ پڑتا تھا۔ وہ لوگوں کے رویوں' ان کی نفسیات اور طبیعت سے بھی آگاہ تھا' اور یامین کی عادات موڈ اور مزاج کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ اسے اس رشتے میں کوئی خامی یا عیب دکھائی نہ دیا' لہٰذا چند روز بعد ہی اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

ظاہر ہے' اس کا فیصلہ مونا اور یامین کے حق میں تھا۔ ان کی شادی ہو گئی۔

مونا شادی کے بعد یامین کے گھر گلشن اقبال میں منتقل ہوئی' تو اکیلا گھر علی سلطان کو کاٹنے لگا۔ اس کی تنہائی بیٹی اور داماد (دوست) سے پوشیدہ نہیں تھی اور ان کو اس کا بہت احساس بھی تھا' لہٰذا انہوں نے محبت کے بل بوتے پر علی سلطان کو مجبور کر دیا کہ وہ گلبرگ والے گھر کو کرائے پر اٹھا کر ان کے پاس رہنے کے لئے آ جائے۔

وہ بیٹی کے گھر میں رہنے کے حق میں نہیں تھا' لہٰذا یامین شاہ نے اس کی تنہائی دور کرنے اور اسے اپنے گھر میں بسانے کے لئے ایک حکمت عملی اختیار کی۔ اس کے گھر میں دو منزلیں تھیں۔ زیریں منزل پر وہ خود رہائش پذیر تھا' اور بالائی منزل خالی پڑی تھی۔ اس نے اپنے سسر کو پیش کش کی۔

"سلطان صاحب! آپ ایک کام کریں۔" یامین شاہ نے گہری سنجیدگی سے



کہا۔" ایک لمحے کے لئے بھول جائیں کہ یہ گھر آپ کی بیٹی کا گھر ہے۔ صرف یہ سوچیں کہ میں آپ کا دوست ہوں۔ آپ اپنی نہ سہی لیکن میری تنہائی دور کرنے کے لئے تو یہاں آ کر رہ سکتے ہیں۔ میرے گھر کی بالائی منزل خالی پڑی ہے۔ آپ اسے آباد کریں۔"

" کان سیدھی طرح پکڑیں یا ہاتھ گھما کر' اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" علی سلطان نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔" بات تو ایک ہی ہے۔"

بات ایک کہاں ہے جناب!" یامین نے ہوشیاری سے کہا۔" آپ کیا سمجھ رہے ہیں' میں آپ کو اپنے گھر میں قیام کی پیشکش بلا وجہ ہی کر رہا ہوں؟"

" بلا وجہ بالکل نہیں۔" علی سلطان نے کہا۔" اور آپ نے وجہ بیان بھی کر دی ہے۔"

" وہ تنہائی دور کرنے والی بات تو ایک بہانہ ہے۔"

" تو پھر.....؟" علی سلطان نے الجھن بھرے انداز میں کہا۔

یامین شاہ بولا۔" میں اس خوب صورت اخلاقی بہانے کی آڑ میں دراصل اپنا ایک اور مقصد پورا کرنا چاہتا ہوں۔"

" کون سا مقصد شاہ جی؟" اس کی الجھن سوا ہو گئی۔

یامین شاہ نے ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا۔" سلطان صاحب آپ جانتے ہیں کہ میں ایک کاروباری آدمی ہوں۔ اپنا فائدہ نقصان سوچے بغیر میں ایک سانس بھی نہیں لیتا۔ آپ کے یہاں آ کر رہنے میں میرا ایک مالی فائدہ ہے۔ آپ کو گلبرک والے گھر کا جو کرایہ ملے گا' وہ آپ مجھے میرے گھر کی بالائی منزل کا کرایہ سمجھ کر دے دیا کیجیے گا۔ اس طرح آپ کی سوچ پر کوئی بوجھ رہے گا' اور نہ ہی آپ کو یہاں رہنا آکورڈ محسوس ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی میرا مالی فائدہ بھی ہو جائے گا۔ آپ اپنے دوست کے مالی فائدے کا ذریعہ نہیں بنیں گے۔"

علی سلطان نے اپنے دوست (داماد) کی محبت اور اخلاص کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور چند روز بعد گلبرگ کے علاقے کو خیرباد کہہ کر گلشن اقبال میں آ بسا۔

زندگی مخصوص رفتار سے آگے بڑھنے لگی۔ شادی کے ڈیڑھ سال بعد مونا کے یہاں

بیٹے کی ولادت ہوئی۔علی سلطان نے بچے کا نام نبیل تجویز کیا۔اس کی تجویز کو مانتے ہو یامین شاہ نے اپنے بیٹے کا نام نبیل شاہ رکھ دیا۔

جب زندگی اپنی مخصوص رفتار سے آگے بڑھ رہی ہوتی ہے، تو انسان مطمئن ہو جاتا ہے کہ اب سب کچھ ایسے ہی ٹھیک ٹھاک رہے گا۔ وہ سوچنے کی ضرورت محسوس کرتا ہے، اور نہ ہی زحمت کہ اس پُر سکون زندگی کے جلو میں فتنے اور ہنگامے بھی چھپے ہوتے ہیں، موقع کی تاک میں گھات لگائے ہوئے، اور انہیں جیسے ہی موقع ملتا ہے، وہ وار کرنے سے نہیں چوکتے۔شادی کے چار سال بعد مونا کی زندگی میں اچانک ایک اور موڑ آیا۔

علی سلطان کی دکان جس سٹریٹ پر واقع تھی، وہاں ڈاکوؤں کے ایک منظم مسلح گروہ نے دھاوا بول دیا۔علی سلطان کی دکان سمیت لگ بھگ چھ دکانوں کے مالکان کو اور دکانوں کے اندر موجود مرد و زن گاہکوں کو جیولری اور رقم سے محروم کر دیا گیا۔ یامین شاہ نے علی سلطان کو جو لائٹ ویٹ گن تحفے میں دی تھی۔وہ ہر وقت اس کے لباس میں جسم پر موجود رہتی تھی، لیکن کبھی اس کے استعمال کی نوبت نہیں آئی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ انتہائی سنگین صورتحال سے دوچار ہوا تھا۔پتا نہیں، اس کے دماغ میں کیا آئی اس نے گن نکال کر ڈاکوؤں پر فائرنگ کر دی۔اس وقت مسلح ڈاکو "مال غنیمت" سمیٹ کر واپسی کی راہ پر تھے۔علی سلطان کی فائرنگ سے ایک ڈاکو موقع پر ہلاک ہو گیا اور دو شدید زخمی ہوئے۔ ڈاکوؤں کی جوابی فائرنگ نے علی سلطان کے جسم کے چیتھڑے اڑا دیئے۔اس نے اپنے ہی خون میں لت پت چند لمحے تڑپ کر جان دے دی۔ڈاکو اپنے گھائل اور مردہ ساتھی کو چھوڑ کر جائے وقوعہ سے فرار ہو گئے۔

یہ اتنا بڑا صدمہ تھا کہ دونوں میاں بیوی ٹوٹ کر رہ گئے۔وہ دونوں ہی دو رشتوں سے بیک وقت محروم ہو گئے۔ یامین شاہ کا دوست اور سسر رخصت ہوا تھا، جبکہ مونا کے لئے علی سلطان باپ بھی تھا اور ماں بھی۔

علی سلطان کی المناک موت کے بعد یامین شاہ نے اس کے کاروبار کو فروخت کر کے حاصل ہونے والی رقم کو مونا کے اکاؤنٹ میں جمع کرا دیا۔البتہ گلبرگ والے گھر کو بیچنے کے بارے میں نہیں سوچا، کیونکہ پراپرٹی کی قیمت ہمیشہ بڑھتی رہتی ہے۔مذکور مکان بہ



دستور کرائے پر اٹھا رہا، اور اس کا کرایہ بھی مونا کے اکاؤنٹ میں جمع ہوتا رہا۔ یامین شاہ اکیلا آدمی تھا۔وہ علی سلطان کے کاروبار کو سنبھال نہیں سکتا تھا، ملازموں پر کام چھوڑنا دانشمندی نہ ہوتی۔ لہٰذا اس نے مونا کی مشاورت سے صدر والی کپڑے کی بھری پری دکان مناسب قیمت پر فروخت کر دی تھی۔زندگی کے چپ چاپ چند سال مزید آگے سرک گئے۔ ایک روز اتفاق سے مونا کی ملاقات ایک ایسے شخص سے ہو گئی، جو کالج کے زمانے میں اس کا کلاس فیلو رہا تھا۔ مذکورہ شخص کا نام امتیاز تھا۔وہ نبیل شاہ کے ہمراہ ایک شاپنگ سنٹر سے نکل رہی تھی کہ امتیاز کا اچانک سامنا ہو گیا۔

وہ دونوں گم صم ایک دوسرے کو دیکھتے چلے گئے۔ یوں محسوس ہوتا تھا، جیسے وقت تھم کر رہ گیا ہو، پھر امتیاز کی حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔ "مونا......تم......؟"

"ہاں، میں مونا ہی ہوں۔" مونا نے زیر لب مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"تم تو ذرا بھی نہیں بدلی ہو۔" وہ سر تا پا اس کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ "گزرنے والے ماہ و سال نے تمہاری خوب صورتی اور تر و تازگی کو متاثر کرنے کے بجائے اور بڑھا دیا ہے۔"

"اور تم بھی بالکل ویسے ہی ہو۔" مونا نے کہا۔ "بس ذرا موٹے ہو گئے ہو......اور تمہاری توند نکل آئی ہے۔"

"ایکسر سائز کا بالکل وقت نہیں ملتا۔" وہ اپنی ابھری ہوئی توند پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "مصروفیت اس قدر ہے کان کھجانے کی فرصت نہیں۔"

"تو اس کام کے لیے ایک آدھ ملازم رکھ لو۔" مونا نے بے ساختہ کہا۔

امتیاز کھلکھلا کر ہنس دیا۔

مونا کو اچھی طرح یاد تھا کہ کالج کے زمانے میں امتیاز کی صحت اور باڈی فٹنس قابل رشک ہوا کرتی تھی۔ نہ صرف یہ کہ وہ خود باقاعدہ ایکسر سائز کیا کرتا تھا، بلکہ دوسروں کو بھی اس کی تاکید کرتا رہتا تھا۔لوگ بڑی توجہ اور دلچسپی سے اس کی باتیں سنا کرتے تھے۔

امتیاز کے بے حد اصرار پر وہ تینوں ایک قریبی ریسٹورنٹ میں آ بیٹھے۔ وہ سالوں بعد ملے تھے۔ لہٰذا مونا اس کی پیش کش کو ٹھکرا نہ سکی۔ ماضی کا کوئی تعلق دار عرصہ دراز بعد

اچانک مل جائے' تو گئے دنوں کی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ وہ دونوں بھی اسی نوعیت کی کیفیت سے گزر رہے تھے۔

کھانے پینے کا آرڈر دینے کے بعد ان میں گفتگو ہونے لگی۔ امتیاز نے نبیل شاہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تم نے شادی کر لی؟''

''ہاں' میری شادی کو آٹھ' ساڑھے آٹھ سال ہو گئے ہیں۔'' مونا نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''نبیل میرا اکلوتا بیٹا ہے۔''

امتیاز نے نبیل کو پیار کیا' اور مونا سے پوچھا۔ ''نبیل کے ڈیڈی کیا کرتے ہیں؟''

''وہ اسلحہ کے ڈیلر ہیں۔'' مونا نے جواب دیا۔

''باپ رے باپ......!'' امتیاز اس طرح اچھلا جیسے کسی خوفناک شے کو دیکھ لیا ہو۔ ''کیا تم نے اسلحے کے کسی اسمگلر سے شادی کر لی ہے...... تمہارے والدین نے کیا دیکھ کر...... میرا مطلب ہے......''

امتیاز کے یہ جملے سراسر مذاق کے زمرے میں آتے تھے' اور ایسا کہتے ہوئے اس کے چہرے سے بھی شرارت جھلک رہی تھی۔ لہٰذا مونا نے اس کے تبصرے کا برا منانے کے بجائے یامین شاہ کے بزنس کی تفصیل بیان کر دی۔ اس کے ساتھ ہی سفینہ بیگم اور علی سلطان کی المناک اموات سے بھی اسے آگاہ کیا۔ امتیاز اس کے حالات سے ناواقف تھا۔ مونا کے والدین کی اموات پر اس نے گہرے دکھ و رنج کا اظہار کیا۔

چند لمحات تک ان کے درمیان رنجیدہ سکوت طاری رہا پھر مونا نے استفسار کیا۔ ''تم نے شادی کر لی؟''

''نہیں...... میں ابھی تک کنوارا گھوم رہا ہوں۔'' امتیاز نے جواب دیا۔

مونا اس کی عادت اور مزاج سے بہ خوبی آگاہ تھی۔ وہ بہت جولی طبیعت کا مالک تھا' اور انتہائی سنجیدہ ماحول میں بھی جملے بازی سے ہنسنے یا مسکرانے پر مجبور کر دیتا تھا۔ لہٰذا کوئی اس کی حرکتوں کا برا نہیں مانتا تھا۔ سب اس کے انداز اور اسٹائل سے واقف تھے۔

مونا نے ماحول کی کشیدگی کو کم کرنے کے لیے اس سے پوچھا۔ ''کیا بڑھاپے میں پہنچ کر شادی کرو گے؟''



''آج کل ایک نیا ٹرینڈ چلا ہے مونا۔'' وہ یک لخت سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''یہ رجحان بڑی تیزی سے پروان چڑھ رہا ہے کہ لڑکیاں' جوان مردوں کی بہ نسبت ادھیڑ عمر کے مردوں سے شادی کو ترجیح دینے لگی ہیں۔ اس حوالے سے تو جیسے جیسے میری عمر آگے بڑھ رہی ہے' اچھے سے اچھے رشتے کے چانس بھی بڑھتے جا رہے ہیں...... تمہارا کیا خیال ہے؟''

''میرا خیال تم سے بالکل مختلف ہے امتیاز!'' مونا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لڑکیاں دراصل ایک خاص درجہ سے ادھیڑ عمر مردوں کی جانب دیکھنے لگی ہیں۔ تم اسے ان کی مجبوری کہہ سکتے ہو۔''

''مجبوری...... کیسی مجبوری؟'' امتیاز نے الجھن زدہ لہجے میں استفسار کیا۔

کالج کے زمانے میں بھی ان کے درمیان ایسی بحث و تکرار ہوتی رہتی تھی۔ کوئی بھی اپنے مؤقف سے ہٹنے اور ہار ماننے کو تیار نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ وہ متنازع موضوع کو چھوڑ کر کسی نئے ٹاپک کو پکڑ لیا کرتے تھے' یہ الگ بات کہ کچھ دیر کے بعد وہ ٹاپک بھی بحث و تکرار کی شکل اختیار کر لیتا تھا۔

مونا نے اس کے سوال کے جواب میں گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''ان بے چاریوں کی مجبوری یہ ہے کہ لڑکوں اور جوان مردوں میں سے اکثر کے چال چلن مشکوک ہوتے جا رہے ہیں۔ جس کے بارے میں تحقیق کرو' وہ کسی نہ کسی برائی میں مبتلا رہتا ہے۔ کوئی کسی سیاسی تنظیم میں گھسا ہوا ہے' اور کوئی نشے کے ہاتھوں تباہ و برباد...... کسی کو کام کرنے کی عادت نہیں' اور کوئی اس امید پر بیٹھا ہے کہ لڑکی والے اسے گھر خرید کر دے دیں گے' اور کاروبار بھی کرائیں گے' چھوٹی موٹی نوکریاں کرنے کا کیا فائدہ...... اور ان میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے' جو اپنی بیوی کے حوالے سے ذہن میں بڑے اونچے خواب سجائے بیٹھا ہے۔ وہ لوگ ریکھا' ہیما اور بابرہ کا انتظار کر رہے ہیں' حتیٰ کہ کویتا' گیتا اور ماریہ پر کمپرومائز کرنے کو تیار نہیں۔ اب تم ہی بتاؤ امتیاز...... کوئی لڑکی اس قسم کے مردوں سے شادی کو کیوں تیار ہو گی۔ لہٰذا انہوں نے مجبور' سنجیدہ اور بردبار مردوں کی طرف دیکھنا شروع کر دیا ہے۔''

"تم بھی تو عورت ہو...... اس لیے عورتوں کی ہی طرف داری کرو گی۔"

"طرف داری کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہوتی۔ یہ درحقیقت حمایت ہی کی ایک شکل ہے۔" مونا نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "بس' طرف داری کرتے ہوئے غیر جانب دار اور ایمان دار رہنا چاہیے۔"

امتیاز نے گہری نظروں سے اسے دیکھا' اور معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "ماضی میں ہماری کوئی بحث نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئی تو اب کیا خاک ہو گی؟"

"اس لیے ہمیں بحث کے چکر میں پڑنا ہی نہیں چاہیے۔" مونا نے سادگی سے کہا پھر پوچھا۔ "امتیاز! یہ تو بتاؤ کہ آج کل تم کیا کر رہے ہو...... ایسی کون سی مصروفیت ہے کہ تمہیں سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں؟"

"ٹی وی پر ہوتا ہوں۔" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

"ٹی وی پر......" مونا نے حیرت آمیز انداز میں پوچھا۔ "کیا تم نے ایکٹنگ وغیرہ شروع کر دی ہے؟"

"نہیں...... ایکٹنگ تو شروع نہیں کی......"

"پھر......؟" مونا کی حیرت دو چند ہو گئی۔

وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "وہ بات دراصل یہ ہے کہ...... میں لوگوں کو تو یہی بتاتا ہوں کہ میں پروڈکشن کنٹرولر ہوں' لیکن تم سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔"

"اگر تم پروڈکشن کنٹرولر نہیں ہو تو پھر حقیقت کیا ہے؟"

"تم مجھے کوآرڈی نیٹر کہہ سکتی ہو۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "میرا بنیادی کام تو ایکسٹراز سپلائی کا ہے۔ اس کے ساتھ ہی پروڈکشن کے چھوٹے موٹے کام بھی کرتا رہتا ہوں' اور یونٹ کے ہمراہ لوکیشنز پر جانے کا بھی اتفاق ہوتا رہتا ہے۔"

"ہوں......" مونا نے پُرسوچ انداز میں گہری سانس خارج کی۔

"وہ مونا......" امتیاز نے ایسے بے ساختگی سے اسے مخاطب کیا' جیسے اچانک اسے کوئی اہم بات یاد آ گئی ہے۔



مونا نے جواب میں سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

وہ اضطراری لہجے میں بولا۔ "کالج کے زمانے میں تمہیں گانے کا بہت شوق ہوا کرتا تھا' اور تمہاری آواز بھی ماشاءاللہ اچھی تھی۔ بعض تجربہ کار لوگوں کا خیال تھا کہ اگر تم باقاعدہ ریاض کرو تو ایک منجھی ہوئی گلوکارہ کے روپ میں ابھر کر سامنے آ سکتی ہو......" وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا' پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ "کیا تمہیں اب بھی گانے کا شوق ہے؟"

مونا کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے اندر سوئے ہوئے ایک خوب صورت جذبے کو بیدار کر دیا ہو۔ انسان کا کوئی شوق ہو' وہ حالات کے زیر اثر اس کے اندر کہیں چھپ کر سو تو سکتا ہے' لیکن کبھی ختم نہیں ہوتا۔ مونا کے ساتھ بھی یہی مسئلہ تھا۔ وہ باقاعدہ سنگر تو نہیں بن سکتی تھی' تاہم اس کے دل و دماغ میں گانے کا شوق باقی تھا' اور سچی بات تو یہ ہے کہ اس نے سنگر بننے کے لیے کوئی بھی سنجیدہ کوشش بھی نہیں کی تھی۔

وہ امتیاز کی طرف دیکھتے ہوئی بولی۔ "شوق اپنی جگہ موجود ہے۔"

"اگر موقع ملے تو اپنے شوق کو پورا کر سکتی ہو؟"

"کیوں نہیں۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

امتیاز نے کہا۔ "اگر تم کہو میں تمہارے لیے اپنے باس سے بات کروں؟"

"باس کون......؟" مونا نے پوچھا۔

امتیاز نے بتایا۔ "دراصل' میں منیر صاحب کے لیے کام کرتا ہوں' وہ پروڈکشن کنٹرولر ہیں۔ میں زیادہ تر ایکسٹراز انہیں کو سپلائی کرتا ہوں' لیکن تمہیں میں ایک دیرینہ دوست کی حیثیت سے متعارف کراؤں گا' اور ہاں......" وہ لمحے بھر کو تھما' پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔ "ایک بات میں تمہیں پہلے ہی بتا دوں۔ ابتداء میں کسی مالی فائدے کی توقع نہ کرنا۔"

"میرے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔" مونا نے فخریہ لہجے میں کہا۔ "میں پیسے کمانے کے لیے نہیں بلکہ اپنے شوق کی تسکین کے لیے گانا شروع کروں گی۔"

"ٹھیک ہے پھر میں اپنے باس سے بات کرتا ہوں۔" امتیاز نے کہا۔ "پھر آڈیشن کے لیے تمہیں بلا لوں گا۔"

"تم اپنے باس سے بات کرو اور میں اپنے باس سے بات کر لیتی ہوں۔" مونا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "آگے اللہ مالک ہے۔"

"تمہارا باس......"

"میں نبیل کے ڈیڈی کی بات کر رہی ہوں۔" مونا نے فوراً وضاحت کی۔

"او کے!" امتیاز نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

پھر ان دونوں کے درمیان ٹیلی فون نمبرز کا تبادلہ ہوا اور جلد ملاقات کا وعدہ کر کے ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔ راستے میں نبیل نے امتیاز کے بارے میں مونا سے چند سوالات کیے جس کے اس نے تسلی بخش جوابات دیے۔

رات کو مونا نے سیاق و سباق کی روشنی میں یامین شاہ سے بات کی۔ اس نے پوری توجہ سے بیوی کی بات سنی پھر حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

"پہلے کیوں نہیں بتایا کہ تمہیں گانا بھی آتا ہے؟"

"شاید یہ بات بتانے کا کبھی موقع ہی نہیں آیا۔" وہ سادگی سے بولی۔

"گانا سننے کا تو مجھے بھی شوق ہے...... بلکہ تھا......!" یامین شاہ نے کہا۔ "اب تو یہ ماضی کا قصہ ہو کر رہ گیا ہے۔"

مونا نے واضح طور پر محسوس کیا کہ اپنے شوق کا ذکر کرتے ہوئے وہ ماضی کے دریچوں میں جھانکنے لگا تھا۔ وہ اس وقت اپنا کیس لیے بیٹھی تھی۔ اس لیے یامین کو ماضی کے حوالے سے اس نے کوئی سوال یا کرید مناسب نہ سمجھی۔ اس نے سوچا کہ بعد میں وہ کبھی اسے ٹٹولے گی۔

اس نے یامین سے پوچھا۔ "تو پھر آپ کی اجازت ہے نا...... میں ایڈیشن کے لیے جاؤں؟"

"آڈیشن کے لیے تو تم بعد میں جاؤ گی۔" یامین شاہ نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"پہلے ہم باپ بیٹا تمہارا آڈیشن لیں گے۔ یہاں سے پاس ہونے کے بعد ہی تمہیں فارورڈ کیا جائے گا۔"

آئندہ چند روز میں مونا نے یامین شاہ اور نبیل شاہ کو متعدد گانے سنائے۔ یامین نے



بعض مقامات پر اس کی آواز میں موجود تکنیکی خامیوں کی نشان دہی بھی کی اور اسے مفید مشوروں سے نوازا۔ مونا کو اس وقت شدید حیرت ہوئی جب اس نے یامین کے مشوروں پر عمل کر کے اپنی آواز کو بہتر محسوس کیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ یامین ساز و آواز اور موسیقی کے اسرار و رموز سے بہ خوبی آگاہ ہے۔ زیادہ تعجب کی بات یہ تھی کہ یامین شاہ نے اب تک اپنے اس گُن کو بڑی خوب صورتی سے چھپا رکھا تھا۔

"کمال ہے۔" مونا نے شکایتی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ نے موسیقی کے حوالے سے اپنی جان کاری کے بارے میں تو کبھی بتایا ہی نہیں؟"

یامین شاہ نے جواب دیا۔ "شاید یہ بات بتانے کا کبھی موقع ہی نہیں آیا تھا۔"

مونا سمجھ گئی کہ وہ اس موضوع پر فی الحال کوئی بات نہیں کرے گا۔ اس نے سوچا کہ جب نبیل شاہ اسکول گیا ہو گا تو تنہائی میسر آتے ہی وہ یامین شاہ کو پکڑ کر بیٹھ جائے گی اور اس سے ایک ایک بات پوچھ کر رہے گی۔ اسے شک نہیں بلکہ یقین ہونے لگا تھا کہ یامین کے ماضی میں کوئی ایسا اسرار موجود ہے جس کا ذکر کبھی اس کی زبان پر نہیں آیا۔

اس نے سوچوں کی دنیا سے باہر آتے ہوئے اپنے شوہر سے پوچھا۔ "آپ نے کیا مجھے ٹیسٹ میں پاس کر دیا۔ اب تو مجھے ٹی وی کے آڈیشن کی اجازت ہے نا؟"

"اجازت ہے...... مگر ایک بات کا خاص خیال رکھنا۔" یامین شاہ نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "تمہیں ایک مخصوص حد میں رہنا ہو گا۔ تمہیں گانے کا شوق ہے اس شوق سے آگے ایک قدم بھی نہیں بڑھانا ورنہ پھر تباہی اور بربادی کے سوا کچھ حصے نہیں آئے گا۔" وہ بولتے بولتے لمحے بھر کو خاموش ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ "شوبز کی دنیا کو میں تم سے کہیں زیادہ بہتر طور جانتا ہوں۔ وہاں کی چکا چوند انسانی دماغ کو مسخر اور آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے۔ لوگوں کی سوچ اور نیت کو بدلتے دیر نہیں لگتی خاص طور پر جب اردگرد بہلانے پھسلانے اور بہکانے والے افراد کی کمی نہ ہو۔"

"کیا آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں ہے؟" مونا نے ٹھہری ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

وہ بولا۔ "اعتماد ہے...... اسی لیے تو اجازت دے رہا ہوں۔"

"میں آپ کے اعتماد پر ایک ذرا آنچ بھی نہیں آنے دوں گی۔"

"میں نہیں جانتا‘ تم نے جس امتیاز علی کا ذکر کیا ہے‘ وہ کون ہے؟ کیسا آدمی ہے؟"

یامین شاہ نے گھمبیر انداز میں کہا۔ "اگر تمہیں اس پر بھروسا ہے تو ٹرائی کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔"

مونا نے کہا۔ "امتیاز کے بارے میں‘ میں آپ کو تفصیلاً بتا چکی ہوں۔ وہ کالج کے زمانے میں میرا کلاس فیلو رہا ہے۔ بڑا ہی زندہ دل ہنس مکھ‘ خیر خواہ ...... ہر صورت میں دوسروں کا بھلا سوچنے والا‘ ان کا خیال رکھنے والا اور پھر...... میں خود بھی کوئی بچی نہیں ہوں۔ اگر مجھے اس ماحول میں کوئی بھی ایسی بات نظر آئی‘ جو کسی بھی حوالے سے بعد میں میرے لیے کوئی مشکل کھڑی کر سکتی ہو‘ تو میں اسی لمحے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر واپس آ جاؤں گی۔"

"مجھے تم سے یہی امید ہے مونا!" یامین شاہ نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"میں آپ کی امید کو کبھی ٹوٹنے نہیں دوں گی۔"

"وش یو بیسٹ آف لک!"

"تھینک یو یامین!"



یامین شاہ نے چونکہ اسے دل سے آڈیشن کی اجازت دی تھی۔ لہٰذا اس کے اندر ایک خاص قسم کا اعتماد آ گیا تھا۔ اسی اعتماد نے آڈیشن کے دوران میں گویا جادو کا اثر دکھایا‘ اور وہ سو میں سے سو نمبر حاصل کر کے کامیاب ہو گئی۔ آڈیشن لینے والوں کو خود بھی اس کی کارکردگی پر شدید اچنبھا ہوا تھا۔ ایسی مثالیں بہت کم دیکھنے کو ملتی تھیں۔

ٹی وی سے تعلق رکھنے والے بعض موسیقی کے جید افراد نے اسے مفید مشورے دیئے‘ اور اس نے خود بھی جان توڑ کوشش کی‘ جس کے نتیجے میں ایک سال کے اندر ہی وہ ٹی وی کی مشہور گلوکارہ بن گئی۔ اب تک کے...... اس کے کام اور کارکردگی پر یامین شاہ نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک اور خوش اسلوبی سے چل رہا تھا۔

لیکن بہ ظاہر اس ٹھیک ٹھاک کے اندر وقت اپنی پوشیدہ پیچیدہ چالیں بڑے غیر محسوس انداز میں چل رہا تھا۔ وقت کا سب سے بڑا کمال یہی تو ہے کہ اس کی پیش رفت



اور پینترے بازی کسی کی سمجھ میں نہیں آتی‘ اور جب اس کی خفیہ "سازش" کا احساس ہوتا ہے‘ تو پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا ہے۔

مونا کی زندگی میں بھی اچانک ایک نیا موڑ آ گیا۔ اچانک ان معنوں میں کہ وہ اس کی توقع نہیں کر رہی تھی ورنہ...... وقت کرتا ہے پرورش برسوں‘ حادثہ ایک دم ہی نہیں ہوتا۔

مونا کی خوش قسمتی یا بدقسمتی یہ تھی کہ وہ اور اس کی آواز ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر خوب صورت تھیں۔ منیر حسین پروڈکشن کنٹرولر کے ایک ڈائریکٹر دوست کی اس پر نظر پڑی‘ تو وہ مونا پر ریجھ گیا۔ ڈائریکٹر امیر خواجہ نے اپنے پروڈیوسر سے اس کے حسن و خوب صورتی کا خاص طور پر تذکرہ کیا۔ ویسے بھی جب سے مونا نے ٹی وی پر باقاعدہ گلوکاری شروع کی تھی‘ وہ ہر خاص و عام کی توجہ کا مرکز بن گئی تھی۔ ہر شخص نے اپنے اپنے ظرف‘ عادت اور مزاج کے مطابق اس پر نظر ڈالی تھی۔ مذکورہ پروڈیوسر بھی مونا کو گاتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ امیر خواجہ نے پروڈیوسر کو مشورہ دیا کہ مونا کو کسی ڈرامے میں کاسٹ کرنا چاہیے۔ گلوکارہ کی حیثیت سے وہ ناظرین کے دلوں میں اپنا مقام بنا چکی تھی۔ اس کا چہرہ فوٹو جینک اور اسکرین ٹیسٹ اے ون تھا۔ گانا گاتے ہوئے اس نے چہرے کے اتار چڑھاؤ اور تاثرات سے بھی یہ ثابت کر دیا تھا کہ اداکاری اس کے بس کا کام ہے۔ اس شعبے میں وہ اگر معمولی سی محنت بھی کرے گی‘ تو ایک دم ہٹ ہی نہیں‘ بلکہ سپرہٹ ہو جائے گی‘ اور اس کے ساتھ ہی وہ سیریل بھی ہٹ ہو جائے گا‘ جس کی کاسٹ میں وہ مرکزی کردار ادا کر رہی ہو گی۔

مذکورہ پروڈیوسر کو امیر خواجہ کی اصلاح بے حد پسند آئی۔ وہ ایک نئے سیریل کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ اس نے مونا کو اپنے سیریل میں کاسٹ کرنے کا فیصلہ کیا۔ مونا کو پیشکش کی گئی تو اس کے اندر سنسنی سی دوڑ گئی۔ یہ اس کے لیے بڑے اعزاز کی بات تھی۔ اس نے بے حد مسرت کا اظہار کرتے ہوئے وہ آفر قبول کر لی۔

یہ ٹھیک ہے کہ مونا کو بنیادی طور پر گلوکاری کا شوق تھا‘ اور وہ اسی شوق کی تکمیل کے لیے ٹی وی پر آئی تھی‘ لیکن وہاں آمد و رفت کے دوران میں دوسرے شعبوں کے لوگوں سے بھی اس کا میل ملاپ ہوتا رہا۔ سب ہی اس کی آواز کے ساتھ اس کی خوبصورتی کی بھی

تعریف کرتے تھے۔ ازیں علاوہ بیشتر نے اسے یہ مشورہ دیا تھا' کہ وہ گلوکاری کے ساتھ ساتھ اداکاری پر بھی توجہ دے۔

انسان کو مسلسل اگر ایک ہی نوعیت کے مشورے ملتے رہیں' اور مشورہ دینے والوں کے خلوص میں بھی کوئی کمی اور شک نہ ہو تو لامحالہ انسان کچھ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ سال بھر کے دوران مونا کو یقین ہو گیا کہ اس کے اندر زبردست اداکارانہ صلاحیتیں موجود ہیں' اور اگر اس نے ایکٹنگ کے شعبے میں قدم رکھا دیا' تو کامیابی اس کا مقدر ہو گی' اسی لیے نئے سیریل میں کام کرنے کی پیشکش نے اسے ایکسائٹڈ کر دیا تھا۔

اس روز رات میں مونا نے یامین شاہ کو اس پیشکش کے بارے میں بتایا۔ یہ بات سن کر یامین کے چہرے کے تاثرات ایک دم بدل گئے۔ مونا کو سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یامین کو یہ معاملہ سخت ناگوار گزرا تھا' تاہم فوری طور پر کوئی سخت ردعمل ظاہر کرنے کے بجائے اس نے گھمبیر لہجے میں کہا۔

"تم مجھے پوری تفصیل سے بتاؤ۔ جو جو باتیں ہوئیں ترتیب وار بیان کرو۔ کوئی معمولی نکتہ بھی مس نہیں ہونا چاہیے۔"

مونا کو اس کا انداز عجیب لگا۔ یامین کے تیور اچھے دکھائی نہیں دیتے تھے' تاہم نہایت ہی جامع اور مختصر الفاظ میں پروڈیوسر سے ہونے والی میٹنگ اور اس کی پیشکش کا احوال بیان کر دیا۔

"میں نے تم سے کہا تھا نا مونا!" مونا کے خاموش ہونے پر وہ برہمی سے بولا۔ "اپنی مصروفیات کو صرف گانے کی حد تک ہی محدود رکھنا۔ ایک قدم بھی آگے نہ بڑھانا' ورنہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔"

مونا سیریل میں کام کرنے کے لیے تیار ہو چکی تھی' لہٰذا اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ "اس میں حرج ہی کیا ہے۔ جیسے گانا گانا ہے...... ویسے ہی ایکٹنگ کرنا بھی۔"

وہ اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے بولا۔ "اور میں نے یہ بات تمہارے ذہن میں بٹھانے کی کوشش کی تھی' کہ شوبز کی دنیا کو میں تم سے بہتر جانتا ہوں۔ لگتا ہے' وہاں کی چکاچوند نے تمہاری آنکھوں کو واقعی خیرہ کر دیا ہے۔ جبھی تمہاری مت ماری گئی ہے۔"



یامین کے جارحانہ اور حاکمانہ انداز نے مونا کے اندر ضد کو بیدار کر دیا۔ وہ اپنے مؤقف کی حمایت میں بولی۔

"یامین! آپ کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو رہے ہیں' ورنہ یہ تو ایک معمولی سی بات ہے۔"

"یہ معمولی بات نہیں ہے مونا۔" وہ اصراری انداز میں بولا۔ "تم نادانی کر رہی ہو۔ میں تمہیں اس کی ہرگز اجازت نہیں دے سکتا' بس یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔"

"آخری فیصلہ کرنے میں اتنی جلدی نہ کریں یامین۔" مونا نے قدرے تیز لہجے میں کہا۔ "آپ مجھے نادان اور ناسمجھ کیوں تصور کرتے ہیں۔ میں سال بھر سے وہاں جا رہی ہوں۔ وہاں کے ایک ایک شخص کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ کوئی مجھے کیوں کر بے وقوف بنا سکتا ہے' پھر آپ کو تو مجھ پر اعتماد کرنا چاہیے۔"

"اس کا مطلب ہے' تم نے سیریل میں کام کرنے کا حتمی فیصلہ کر لیا ہے۔" یامین نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "اسی لیے میری کوئی بات بھی تم پر اثر انداز نہیں ہو رہی؟"

"آپ ایسا ہی سمجھ لیں۔" وہ بھی اڑ گئی۔

"تو تمہیں میرے جذبات کا ذرا سا بھی احساس نہیں؟"

"آپ تو بہت زیادہ احساس کر رہے ہیں نا میرا۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ بیوی کی شاکی اور حتمی انداز کو دیکھتے ہوئے غصیلے لہجے میں بولا۔ "میری بات تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے نا...... آج کے بعد تمہاری گلوکاری بھی بند۔"

"آپ اتنا بڑا ظلم نہیں کر سکتے یامین۔" وہ چیخ کر بولی۔

"برائی کی راہ سے روکنے کے لیے میں تمہاری نظر میں ظالم ہو گیا۔" یامین نے گھور کر اسے دیکھا۔ "اگر ٹی وی کے کسی سیریل میں ایکٹنگ کرنا برائی کی راہ پر چلنے کے مترادف ہے' تو پھر وہاں جا کر گلوکاری کرنا کون سی نیکی اور عبادت کا کام ہے۔ مجھے گانے کی اجازت دیتے ہوئے آپ نے یہ کیوں نہیں سوچا تھا؟"

اس لہجے اور انداز میں مونا نے پہلے کبھی بات نہیں کی تھی' اس لیے بھی یامین کو کچھ

زیادہ ہی تاؤ آ رہا تھا۔ مونا کے چبھتے ہوئے استفسار کے جواب میں اس نے زہر خند لہجے میں کہا۔ "میں نے اس وقت بھی سوچا تھا' لیکن تمہارے شوق کے سامنے مجبور ہو گیا۔ تمہاری خوشی نے مجھے مجبور کر دیا تھا۔"

"اب بھی میرے شوق اور خوشی کا ہی معاملہ ہے یامین۔"

"گلوکاری کا شوق بے ضرر تھا' لیکن اداکاری والا معاملہ......" وہ بولتے بولتے معنی خیز انداز میں خاموش ہو گیا' پھر خود کلامی کرتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولا۔ "غلطی مجھ ہی سے ہوئی ہے ......اس میں تمہارا زیادہ قصور نہیں ہے مونا۔ مجھے سحرش والے تلخ تجربے کو یاد رکھنا چاہیے تھا۔"

"تلخ تجربہ......سحرش!" مونا نے حیرت بھرے انداز میں دہرایا۔ "یامین! یہ کس سحرش کا کون سا تلخ تجربہ تھا؟"

"کچھ نہیں......کچھ نہیں!" وہ جلدی سے بات بناتے ہوئے بولا" وہ کوئی غیر متعلق واقعہ تھا۔"

یامین کے انداز نے مونا کو شکوک و شبہات کے گہرے سمندر میں پھینک دیا۔

اس نے ٹٹولنے والے انداز میں کہا۔ "اگر وہ کوئی غیر متعلق واقعہ تھا' تو پھر اس کا یہاں ذکر کیسے آ گیا؟"

"تم فضول باتیں نہ کرو۔" وہ نگاہ چراتے ہوئے بولا۔ "بس' ایک بات ذہن میں رکھو تم ٹی وی کا رخ نہیں کرو گی۔"

یامین شاہ کے دوٹوک اور حتمی انداز کو دیکھتے ہوئے مونا نے بات بڑھانی مناسب نہیں سمجھی' اور خاموش ہو گئی' تاہم اس کے ذہن میں خطرناک سوچوں کا نیا محاذ کھل گیا تھا۔ ماضی کے حوالے سے یامین نے خاصی مبہم باتیں کی تھیں' اور اب سحرش اور کسی تلخ تجربے کا ذکر نکل آیا تھا۔ مونا کو یقین ہو گیا کہ یامین کے ماضی کی راکھ میں کوئی نہ کوئی سنسنی خیز واقعہ دبا ہوا ہے۔ جس کا تعلق گلوکاری اور شوبز سے ہے' جبھی وہ ان کے ذکر پر جذباتی ہو جاتا تھا۔ اس نے دل میں ٹھانی' کہ پہلے وہ یامین کے ماضی کو سمجھنے کی کوشش کرے گی۔ اس کے بعد ہی وہ اس سے کھل کر بات کر سکے گی۔



انسان اگر کسی بات کے لیے جی میں ٹھان لے' تو پھر اسے منزل تک پہنچنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ مونا جی جان سے یامین کے ماضی کو "دریافت" کرنے کی کوشش میں لگ گئی تھی۔ چند ہی روز میں گوہرِ مقصود ہاتھ آ گیا۔ سحرش نامی ایک لڑکی ماضی بعید میں یامین شاہ کی زندگی کا حصہ رہی تھی' اور اسی کے سبب یامین نے ایک عظیم الشان ذہنی اور قلبی صدمہ اٹھایا تھا۔

مونا کو حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق کسی زمانے میں وہ سحرش کے بہت قریب ہو گیا تھا' اور اس کے بغیر زندگی کا تصور بھی محال سمجھتا تھا۔ مونا کی طرح سحرش کو گلوکاری کا شوق تھا۔ وہ اپنے رشتہ داروں اور سہیلیوں کے سامنے گایا کرتی تھی۔ اکثر لوگوں کا مشورہ تھا کہ وہ ٹی وی یا فلم انڈسٹری میں ضرور قسمت آزمائے۔ بعض گھرانے اس زمانے میں فلم انڈسٹری اور وہاں کام کرنے والوں کو اچھا نہیں سمجھتے تھے' لہٰذا سحرش نے ٹی وی پر ٹرائی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

جب یامین شاہ کو اس کے فیصلے کا علم ہوا تو اس نے سخت مخالفت کی۔ اس کے تئیں' فلم انڈسٹری ہو یا ٹی وی' سحرش کو شوبز کی دنیا میں قدم ہی نہیں رکھنا چاہیے۔ بہرحال مخالفت کے باوجود سحرش نے ضد کر کے یامین کو ٹی وی کی حد تک راضی کر لیا۔

سحرش شکل و صورت کی بھی اچھی تھی' لہٰذا اسے ٹی وی پر گاتے ہوئے ابھی چند ہی ماہ ہوئے تھے کہ ایک ٹیلی فلم میں اداکاری کی پیشکش ہو گئی۔ یامین شاہ نے اس موقع پر بھی مخالفت کی' لیکن سحرش کی خوشی کے سامنے اس کی مخالفت ٹھہر نہ سکی اور سحرش ٹیلی فلم' لانگ پلے' سیریز سے ہوتے ہوئے سیریل تک جا پہنچی۔ ظاہر ہے' اس کے ساتھ ہی سحرش کی مصروفیت میں بھی بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ نتیجے کے طور پر وہ رفتہ رفتہ یامین شاہ سے بھی دور ہوتی چلی گئی۔

سحرش کا سارا وقت اسٹوڈیو میں گزرتا۔ یامین شاہ کو ہر پل یہی محسوس ہوتا تھا' اس نے سحرش کو کھو دیا ہے۔

اس کے احساس نے بہت جلد حقیقت کا روپ دھار لیا۔ اس روز یہ خبر بجلی بن کر اس پر گری کہ سحرش نے اپنے پرڈیوسر سے شادی کر لی تھی۔

سحرش کے حوالے سے ماضی کا یہ تلخ تجربہ یامین شاہ کے ذہن میں ہمیشہ تازہ رہتا تھا۔ مونا سے شادی اور بعد کی خوشگوار زندگی نے اگرچہ ماضی کے صدمے کو بڑی حد تک کم کر دیا تھا' تاہم جب مونا نے ٹی وی پر گلوکاری کا ارادہ کیا' تو اس کے زخم دوبارہ ہرے ہو گئے تھے۔ مونا کی خواہش اور جوش وخروش کو دیکھتے ہوئے اس نے یہی سوچا کہ ضروری تو نہیں ماضی کی بازگشت یہاں بھی سنائی دے۔ اسی خیال کے تحت...... ضروری ہدایت کے ساتھ اس نے مونا کو ٹی وی پر گلوکاری کی اجازت دے دی تھی' لیکن جب مونا کو سیریل میں اداکاری کی آفر ہوئی تو اس کا دماغ گھوم گیا۔ اسے یقین ہوگیا کہ ماضی خود کو دہرانے جا رہا ہے۔ اگر اس موقع پر اس نے ڈھیل کا مظاہرہ کیا' تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مونا کو کھو دے گا' لہٰذا وہ نرمی اور مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر سختی پر اتر آیا۔

یامین شاہ کے ماضی اور حال کے خدشات سے پوری واقفیت حاصل کرنے کے بعد مونا نے اس سے بات کی۔

"یامین میں آپ کے احساسات اور جذبات کو اچھی طرح سمجھ رہی ہوں' لیکن یقین جانیں' آپ کے خدشے بے بنیاد ہیں۔ ایسا کچھ نہیں ہوگا' جیسا ماضی میں سحرش کے حوالے سے آپ کے ساتھ پیش آ چکا ہے' کیونکہ سحرش اور مونا میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔" مونا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"زمین آسمان کا...... کیا فرق ہے؟" یامین نے خفگی آمیز لہجے میں پوچھا۔

مونا نے متحمل انداز میں جواب دیا۔ "سحرش سے محض آپ کی جذباتی وابستگی تھی' کوئی قانونی یا اخلاقی بندھن نہیں تھا' جب کہ مونا یعنی میں...... آپ کی بیوی ہوں' آپ کے بچے کی ماں ہوں اور دس سال سے آپ کے ساتھ خوش وخرم گزار چکی ہوں۔ میرے ذہن میں صرف اور صرف آپ ہی ہیں۔ کوئی آپ کی جگہ نہیں لے سکتا' اس لیے آپ پروڈیوسر' ڈائریکٹر اور ہیروز وغیرہ جیسے "خطرات" کو ذہن سے نکال دیں۔"

"ایسی ہی اطمینان دلانے والی باتیں کبھی سحرش نے بھی کی تھیں۔" وہ دکھی لہجے میں بولا۔ "لیکن سارا اطمینان اور تسلی خاک میں مل گئی۔ شوبز کی دنیا بڑی گندی جگہ ہے مونا...... یہاں کسی وقت بھی کچھ ہو سکتا ہے؟"



"میں نے کہا نا' کچھ نہیں ہوگا۔"

مونا قدرے سخت لہجے میں بولی۔

"میں مونا ہوں...... سحرش نہیں!"

"کچھ بھی ہے...... مگر میں اس خطرناک تجربے کی اجازت نہیں دے سکتا۔" وہ حتمی لہجے میں بولا۔

"آپ کی یہ احتیاط اور ضد محض اس لیے ہے کہ آپ گرم دودھ سے اپنا منہ جلا چکے ہیں' اسی لیے چھاچھ کو ہاتھ لگانے سے بھی ڈر رہے ہیں' پھونک پھونک کر پینا تو بہت دور کی بات ہے۔"

"تم ایسا ہی سمجھ لو۔" وہ غیر متزلزل لہجے میں بولا۔

"میں کسی بھی قیمت پر تلخ تجربات کو دہرانے کے حق میں نہیں ہوں...... حتیٰ کہ چھاچھ کو پھونک کر پینے کے بجائے میں دہی کھا کر اوپر سے ٹھنڈے پانی کا گلاس پینے کو ترجیح دوں گا۔"

"لیکن میں اس سیریل میں کام کرنے کا فیصلہ کر چکی ہوں۔" مونا کو بھی ضد ہوگئی۔

"تمہیں یہ فیصلہ بدلنا ہوگا۔" وہ تحکمانہ انداز میں بولا۔

"یہ نہیں ہوسکتا یامین۔"

"اگر یہ نہیں ہوسکتا' تو بہت برا ہوگا۔"

"ایسے مواقع زندگی میں انسان کو کبھی کبھی ملتے ہیں۔" وہ ناراضی سے بولی۔ "ان کو ٹھکرانا عقل مندی نہیں۔"

"تم ایک ڈرامہ سیریل میں کام کرنے کے لیے میری بات کو ٹھکرا رہی ہو۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

"تمہاری نظر میں یہ بڑا دانش مندی کا کام ہے...... ہیں نا؟"

"آپ میری بات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہے!"

"سب سمجھ رہا ہوں۔" وہ معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "تمہاری یہ ضد' یہ اصرار اور یہ بحث وتکرار مجھے بہت کچھ سمجھا رہا ہے۔ شوبز کی چکا چوند نے سحرش کی

طرح تمہارا دماغ بھی خراب کر دیا ہے۔"

مونا کو یوں محسوس ہوا' جیسے یامین نے سحرش سے نتھی کر کے اسے کوئی غلیظ گالی دی' اس کے کردار پر شک کیا ہے' اور اس کی وفا کو ملیا میٹ کر دیا۔

وہ دکھے ہوئے دل کے ساتھ احتجاجی لہجے میں بولی۔

"یامین! آپ نے سحرش کی مثال دے کر میری توہین کی ہے۔"

"تم اسے توہین نہ سمجھو۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

"بلکہ میں نے حقیقت بیان کی ہے' جس بیوی کی سمجھ میں شوہر کی بات نہ آئے' اور وہ اپنی من مانی کرنے پر تلی ہو۔ اس کے بارے میں ایسا ہی سوچا جا سکتا ہے۔ اگر میں پروڈیوسرز اور ڈائریکٹرز کے کردار سے واقف نہ ہوتا تو شاید اتنے سخت رویے کا مظاہرہ نہ کرتا۔"

مونا کا پندار کسی کانچ کے محل کے مانند کرچی کرچی ہو کر اس کے احساس میں پیوست ہو گیا۔ وہ ان لمحات میں جس روحانی اور ذہنی اذیت سے گزری اس کا احوال الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ اس گہری چوٹ کے نتیجے میں وہ ادب و آداب بھول گئی اور "آپ" سے "تم" پر آنے میں اسے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

وہ زخمی شیرنی کے مانند غراہٹ آمیز لہجے میں بولی۔

"یامین! میں بڑے افسوس کے ساتھ کہوں گی کہ تمہیں ڈائریکٹرز اور پروڈیوسرز کے کردار کا تو بہ خوبی علم ہے' لیکن اس بیوی کے کردار کے بارے میں کچھ نہیں جانتے' جو پچھلے دس سال سے تمہاری ساتھ ایک چھت کے نیچے زندگی گزار رہی ہے۔ آج مجھے احساس ہوا کہ تمہاری نظروں میں میری کیا وقعت ہے۔ تم نے مجھے بازاری ہونے کا طعنہ دیا ہے۔"

یامین شاہ صورت حال کی سنگینی اور نزاکت کو بھانپ گیا' جلدی سے بولا۔

"مونا! میں تو تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا' تم نے میری باتوں کا غلط مطلب لے لیا۔"

اس نادان کو یہ اندازہ نہیں تھا' کہ کمان سے نکلا ہوا تیر کبھی واپس نہیں آتا۔





مونا نے سلگتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں کوئی ننھی بچی نہیں ہوں کہ تم مجھے زمانے کی اونچ نیچ سمجھانے بیٹھ جاؤ...... اور یہ مت سمجھو کہ میں نے تمہاری باتوں کا کوئی دوسرا مطلب لیا ہے۔ میں وہی سمجھی ہوں' جو تم نے کہا ہے۔ میرے حوالے سے تمہاری نیت کھل کر سامنے آ چکی ہے...... اب تو چاہے کچھ بھی ہو۔ میں اس سیریل میں ضرور کام کروں گی۔ چاہے اس کے لیے مجھے کتنا بھی نقصان کیوں نہ اٹھانا پڑے۔"

"اگر یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے تو پھر ہماری راہیں جدا جدا ہو جائیں گی۔" یامین شاہ نے سفاکی سے کہا۔

مونا کے احساسات اور جذبات اس قدر مجروح ہو چکے تھے' کہ کسی خطرناک نتیجے کی پروا کیے بغیر اس نے بھی کہہ دیا۔ "مجھے بھی کسی ایسے شخص کے ساتھ رہنے کا کوئی شوق نہیں' جو میرے کردار کو شک کی نظروں سے دیکھتا ہو...... جسے میرے احساس اور خوشی کی کوئی پروا نہ ہو۔"

"دیکھ لو...... اگر ہمارے راستے جدا ہو گئے' تو سب کچھ ختم ہو جائے گا۔" یامین نے دھمکی آمیز انداز میں کہا۔ "ہو جائے مجھے کچھ بھی نہیں چاہیے تم سے۔" وہ غصیلے لہجہ میں بولی۔

"نبیل شاہ بھی نہیں؟" یامین بپھرے ہوئے انداز میں بولا۔ "نبیل میرا بیٹا ہے۔" وہ ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے بولی۔ "میں اسے اپنے ساتھ رکھوں گی۔"

"نبیل صرف تمہارا ہی نہیں۔ میرا بھی بیٹا ہے۔" وہ مونا سے ایسے بات کر رہا تھا' جیسے وہ اس کی بیوی نہ بلکہ کوئی پارٹی ہو' جس سے وہ اسلحہ کی ڈیل کر رہا ہو۔ "میں اس گھر میں سے اور اپنے اکاؤنٹس میں تمہیں سب کچھ دینے کو تیار ہوں' لیکن نبیل کو اپنے پاس ہی...... رکھوں گا۔"

"یہ نہیں ہو سکتا...... نبیل میرے ساتھ رہے گا۔" وہ ضدی لہجے میں بولی۔ "میں اس کے حصول کے لئے کورٹ سے رجوع کروں گی۔"

"نبیل اس عمر سے نکل گیا ہے' جہاں کورٹ بچے کو ماں کی تحویل میں دینے کے قانونی احکام صادر کرتا ہے۔" یامین شاہ نے نکتہ طرازی کرتے ہوئے کہا۔ "تم کورٹ کی

دیواروں سے سر پٹخ کر رہ جاؤ گی‘ لیکن نبیل شاہ کو مجھ سے نہیں لے سکو گی۔“

”میں کسی ایسے قابل وکیل کی خدمات حاصل کروں گی‘ جو تمہیں ناکوں چنے چبوا دے گا۔“ مونا نے ترکی بہ ترکی کہا۔ ”میں اتنی آسانی سے ہار ماننے والی نہیں ہوں۔“

”تم میری طرف سے ابھی اور اسی وقت آزاد ہو......قانونی کارروائی بعد میں ہوتی رہے گی۔“ یامین شاہ نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ”لہٰذا تمہارا کورٹ میں جانے کا شوق ہو یا ٹی وی کی ڈرامہ سیریل میں کام کرنے کا ذوق‘ تم مکمل آزادی اور خود مختاری سے شوق وذوق پورے کرسکتی ہو۔ مجھے تمہارے قطعاً کوئی پروا نہیں۔ آج سے تم میری زندگی کا حصہ نہیں ہو۔تم یہاں سے نکل کر کسی وکیل یا کسی پروڈیوسر سے ڈیل کرتی ہو‘ یہ تمہاری صوابدید پر ہے......“ میمونہ عرف مونا اس سلسلے میں مجھ سے ملنے آئی تھی۔





میں نے ابتدا میں کہا تھا کہ مونا کی زندگی کے حالات واقعات کو مختصراً آپ کی خدمت میں پیش کررہا ہوں‘ لیکن نہ چاہتے ہوئے بھی ان حالات وواقعات کا احوال خاصا طویل ہوگیا‘ اور اس کی بھی ایک خاص وجہ ہے۔

مونا کی زبانی اس کی زندگی کی کہانی اور اس کوششوں کی تفصیل سن کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کا کیس شائد کورٹ میں نہ جائے۔ میاں بیوی کے درمیان اٹھنے والے تنازع اکثر باہمی افہام وتفہیم ہی سے نمٹ جاتے ہیں‘ اور اگر عدالت سے رجوع کرنے کی نوبت آئے بھی‘ تو بس ایک دو پیشی کی مار ہی ثابت ہوتے ہیں‘ اور مونا کے کیس میں مجھے ایک پیشی کی بھی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی تھی‘ لہٰذا عدالتی کارروائی کے سلسلے میں کام آنے والے صفحات کو بھی میں نے مونا کی داستان بیان کرنے کے لئے استعمال کرلیا ہے۔ اس کہانی میں دلچسپی اور سنسنی خیزی تو اپنی جگہ پر ہے ہی۔ اس کے ساتھ ہی اور بہت کچھ ہے‘ جو بعض لوگوں کے لئے سبق آموز اور بعض کے لئے عبرت آمیز ثابت ہوسکتا ہے۔ خاص طور پر وہ میاں بیوی جو ذرا ذرا سی بات کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیتے ہیں‘ ان کے لئے اس کہانی میں اور خاص طور پر اس کے انجام میں درس عبرت اور سبق زندگی ہے‘ اگر وہ اس سے استفادہ کرنا چاہیں تو‘ کیونکہ جب تک انسان کی اپنی مرضی‘ نیت اور کوشش شامل نہ ہو اسے کچھ بھی حاصل نہیں ہوسکتا۔

عدالتی موشگافیوں سے خالی‘ مونا کی پیچ در پیچ داستان حیات پیش کرنے کا ایک خاص تعمیری مقصد ہے۔ اگر پڑھنے والوں میں کسی ایک بھی شادی شدہ جوڑے ......خصوصاً صاحب اولاد شادی شدہ جوڑے نے سبق حاصل کرلیا‘ اور اپنی زندگی کو تباہ

ہونے سے بچالیا' تو یہ ایک بہت بڑی نیکی ہوگی۔

مونا کی کہانی سننے کے بعد میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔" میں ایک وکیل ہوں۔لوگ میرے پاس اپنے مقدمات لے کر آتے ہیں جن میں' میں ان کی قانونی مدد کرتا ہوں۔ پچانوے فی صد مقدمات کو سیٹل کرنے کے لئے عدالت سے رجوع کرنا پڑتا ہے' اور باقی پانچ فیصد کیسز کو میں یہیں اپنے دفتر میں نمٹادیا کرتا ہوں۔اگر فریقین عدالتی بکھیڑوں میں پڑے بغیر راضی نامہ کے لئے تیار ہوں' تو میں دونوں پارٹیوں کو اپنے پاس بلاکر "کچھ لو اور کچھ دو" کی بنیاد پر ان کا مسئلہ حل کروادیا کرتا ہوں۔آپ کا کیس بھی مجھے اسی نوعیت کا لگ رہا ہے۔"

"شاید آپ نے میری کہانی کے آخری حصے کو توجہ سے نہیں سنا' اس لئے ایسا کہہ رہے ہیں مونا نے متذبذب انداز میں کہا۔" یہاں صورت حال قدرے مختلف ہے۔"

"خاتون! میں نے آپ کا کہا ہوا ایک ایک لفظ توجہ سے سنا ہے' اور اسی پر غور وفکر کرنے کے بعد ہی بات کررہا ہوں۔" میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

وہ بولی۔" آپ نے ابھی جن پانچ فیصد افراد کا ذکر کیا ہے نا' میں ان میں شامل نہیں ہوں' میرے کیس میں معاملہ بالکل مختلف ہوگا۔ نہ تو میں اپنے مؤقف سے پیچھے ہٹنے والی ہوں' اور نہ ہی یامین کے رویے میں لچک پیدا ہونے کا امکان ہے۔لہٰذا کورٹ کچہری تو کرنی پڑے گی اور اپنا کیس جیتنے کے لئے کسی تجربہ کار اور قابل وکیل کی ضرورت ہوتی ہے......اس لئے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی ہوں۔"

"آپ کا کہنا بجا۔" میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا' لیکن ...... میں اپنے مؤکل کے لئے مشیر کا کام بھی کرتا ہوں' اور موقع بہ موقع اسے اپنے مفید مشوروں سے بھی نوازتا رہتا ہوں' جو یقیناً قانون کی ہی روشنی میں اور اس کی حمایت میں ہوتے ہیں۔" میں لمحے بھر کے لئے متوقف ہوا' ایک گہری سانس خارج کی' پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔" پہلے آپ بتائیں کہ اپنے حالات کی روشنی میں آپ مجھ سے کس قسم کی مدد حاصل کرنا چاہتی ہیں' اس کے بعد میں اپنی رائے دوں گا۔"

دیکھیں بیگ صاحب!" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔" یامین کسی بھی قیمت پر



اس بات کے لئے تیار نہیں ہوگا کہ میں ڈرامہ سیریل میں کام کروں۔وہ تو یہاں تک کہہ چکا ہے' کہ اگر میں اس کی بات نہیں مانوں گی تو خود کو اس کی طرف سے فارغ ہی سمجھوں' یعنی اپنے تئیں اس نے مجھے اپنی زندگی سے نکال ہی دیا ہے' جہاں تک میرا تعلق ہے......"

وہ لمحے بھر کے لئے متوقف ہوئی' پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔" میں کسی بھی قیمت پر اپنے مقصد سے پیچھے ہٹنے والی نہیں ہوں۔ میں نے یامین سے ہونے والی جھڑپ کا جو احوال آپ کو سنایا ہے' وہ پانچ روز پہلے کی بات ہے۔اب تو میں نے ڈرامہ سیریل میں کام کرنے کا کنٹریکٹ بھی سائن کرلیا ہے۔ دو چار روز میں اس سیریل کی شوٹنگ شروع ہونے والی ہے۔اس سلسلے میں کسی بیک گیئر کمپرومائز کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔یہ ہم دونوں کے لئے اصولوں اور مقاصد کی جنگ ہے ہم کسی بھی قیمت پر مذاکرات کی میز پر آنے کو تیار نہیں ہوں گے' لہٰذا باہمی افہام وتفہیم اور مصالحت کے بارے میں تو سوچنا ہی وقت ضائع کرنے کے مترادف ہے......! میں آپ کے پاس اس لئے آئی ہوں بیگ صاحب کہ آپ یامین شاہ سے میری جان چھڑائیں......میری جانب سے آپ عدالت میں خلع کا کیس فائل کردیں۔یامین شاہ کے لئے اب میرے دل میں کوئی گنجائش نہیں۔"

اس کا انداز فیصلہ کن تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں ذرا سی بھی دشواری محسوس نہ ہوئی' کہ وہ عزم کو پورا کرکے ہی رہے گی' تاہم پھر بھی میں نے اپنا فرض پورا کرتے ہوئے کہا۔" موناصاحبہ! اگر واقعی آپ نے یامین شاہ کو چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا ہے' تو پھر خلع کا کیس دائر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔" آپ کی کہانی تو یہ بتارہی ہے کہ اِدھر آپ نے ڈرامہ سیریل میں پہلا ٹیک دیا' اُدھر یامین شاہ آپ کو طلاق دے دے گا' پھر خواہ مخواہ آپ اپنے حقوق سے کیوں دستبردار ہوتی ہیں' خلع کی صورت میں آپ کو سب کچھ چھوڑنا ہوگا' جب کہ طلاق کی صورت میں مہر کے علاوہ ......"

جہاں تک مہر کی رقم کا تعلق ہے......" وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول پڑی۔" نکاح کے وقت ڈیڈی نے مہر معجّل رکھوایا تھا' اور یامین نے میرا گھونگٹ اٹھانے

کے بعد پہلا کام مہر کی ادائیگی کا کیا تھا۔ مہر کی رقم مبلغ پچاس ہزار روپے تو میں دس سال پہلے ہی وصول کر چکی ہوں' اور جہاں تک دیگر لین دین کا سوال ہے یامین نے بھی مجھے کھلی آفر دی ہے کہ میں اس کے گھر سے جو کچھ بھی لے جانا چاہوں' اور اس کے اکاؤنٹس سے جو کچھ حاصل کرنا چاہوں' وہ مجھے دینے کو تیار ہے' لیکن میں اس لین دین کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتی۔ میرے پاس اپنا اتنا کچھ موجود ہے کہ میں تن تنہا بڑی خوش اسلوبی سے ایک نئی خوش گوار زندگی کا آغاز کر سکتی ہوں۔ میری پہلی اور آخری ترجیح نبیل شاہ کا حصول ہے۔ اس کے سوا مجھے کسی شے کی ضرورت نہیں۔"

میں نے اس کے خطرناک ارادوں کی سنگینی کو بھانپتے ہوئے کہا۔ "کیا آپ کو اس بات کو احساس ہے کہ آپ اپنی انا کی تسکین اور ضد کی تکمیل کے لئے ہنستی بستی ازدواجی زندگی کو تباہ برباد کر رہی ہیں؟"

"جی ہاں' مجھے حالات کی نزاکت کا بہ خوبی احساس ہے۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "لیکن بیگ صاحب! یہ میری انا کی تسکین یا ضد کی تکمیل کا معاملہ نہیں!"

بات ختم کرتے ہی اس کے چہرے پر دکھ اور کرب کے آثار نمودار ہو گئے۔ میں نے تشویش ناک لہجے میں استفسار کیا۔ "تو......تو پھر؟"

وہ زخمی لہجے میں بولی۔ "بیگ صاحب! یامین شاہ نے میری کردار کے حوالے سے مجھے جو گالی دی ہے اسے میں کسی طور پر ہضم نہیں کر سکتی۔ وہ اگر میری نیت اور کردار کو نشانہ بنائے بغیر محبت اور خلوص سے مجھے سمجھانے کی کوشش جاری رکھتا' تو ممکن ہے اس کے پیہم اصرار کے آگے میں ہی سپر ڈال دیتی' لیکن اس نے تو مجھے سحرش کے برابر لا کھڑا کیا۔ عورت اپنی زندگی کا بڑے سے بڑا صدمہ برداشت کر سکتی ہے' سنگین سے سنگین حالات میں گزارہ کر سکتی ہے' لیکن یہ بات اسے کسی طور پر گوارا نہیں ہوتی کہ کوئی اس کے کردار پر انگلی اٹھائے' اس کی وفا کو شک کی نگاہ سے دیکھے۔ چاہے وہ اس کی عزت کا رکھوالا' اس کا شوہر ہی کیوں نہ ہو! میں آپ کو بتا نہیں سکتی کہ میرے پندار کو کتنی شدید چوٹ پہنچی ہے۔ بیگ صاحب! یامین نے ڈرامہ سیریل کے پروڈیوسر اور ڈائریکٹر سے مجھے منسوب کر کے



ایسی گندی اور غلیظ باتیں کی ہیں' کہ میں آپ کے سامنے بیان نہیں کر سکتی۔ اگر اس نے مجھے اکیلا اور لاوارث سمجھا ہوا ہے' تو یہ اس کی بھول ہے۔ میرے لیے نبیل بہت بڑا سہارا ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے مجھے کسی کی ضرورت نہیں' اور ویسے بھی بیگ صاحب......!" وہ لمحے بھر کے لئے متوقف ہوئی پھر فلسفیانہ انداز میں بولی۔ "جس کھانے میں کیڑے نکل آئیں' اسے کھانا ممکن نہیں رہتا...... اب یامین شاہ کے ساتھ زندگی گزارنے کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔"

اس کا فیصلہ اپنی جگہ ویلیڈ تھا' لیکن میاں بیوی کا رشتہ اتنا نازک اور پیچیدہ ہے کہ اس کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ دن بھر ایک دوسرے کی شکل سے شدید نفرت ہوتی ہے' شام تک بول چال بند' ہر شے کا بائیکاٹ' لیکن رات بھیگتے ہی سب ٹھیک ہو جاتا ہے' اگلی صبح راضی خوشی اچھے میاں بیوی کی طرح رہ رہے ہوتے ہیں' اسی لیے کہا جاتا ہے' میاں بیوی کے تنازع میں فیصلہ کرتے ہوئے جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے۔

میں نے ازدواجی زندگی کے تمام نشیب وفراز مونا پر واضح کر دیئے' لیکن اس کے باوجود بھی اس کے پایۂ استقامت میں کوئی لرزش پیدا نہ ہوئی' تو میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے' میں آپ کی جانب سے خلع کا کیس تیار کر لیتا ہوں۔ اس سلسلے میں آپ کو میری ایک فوری ہدایت پر عمل کرنا ہوگا۔"

"جی فرمائیں...... میں آپ کی ہر بات ماننے کو تیار ہوں۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

میں نے کہا۔ "آپ پہلی فرصت میں اپنے لئے رہائش کا الگ بندوبست کر لیں۔ جب کیس عدالت میں لگ گیا' تو پھر تم دونوں کا ایک چھت کے نیچے زندگی گزارنا نہ صرف یہ کہ انتہائی نامناسب ہوگا' بلکہ خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے!"

"یہ پوائنٹ میرے ذہن میں بھی تھا۔" وہ فخریہ انداز میں بولی۔ "آپ کی طرف آنے سے پہلے میں نے اپنی رہائش کا علیحدہ انتظام کر لیا ہے۔ میں نے شہر کے ایک پوش علاقے میں چھ ماہ کے لیے کرائے کا اپارٹمنٹ حاصل کر لیا ہے۔ میں کل ہی نبیل کے ساتھ اس اپارٹمنٹ میں شفٹ ہو جاؤں گی۔ اس کے ساتھ میں نے گلبرگ والے اپنے

کرائے دار کو بھی نوٹس دے دیا ہے کہ وہ تین ماہ کے عرصے میں اپنے لیے کوئی اور گھر تلاش کر لے۔ میں نے سوچا ہے کہ اس گھر کو سیل آؤٹ کر کے کسی پوش علاقے میں کوئی اپارٹمنٹ خرید لوں گی۔ اس خریداری میں اگر کچھ رقم ملانا بھی پڑی تو مجھے کوئی فکر نہیں۔ ڈرامہ سیریل کے سلسلے میں ابھی جو میرا کنٹریکٹ ہوا ہے' اس کا ابتدائی چیک دو چار روز میں ملنے والا ہے...... آگے اللہ مالک ہے!"

"یہ آپ نے بالکل درست فرمایا کہ آگے تو اللہ ہی مالک ہے۔" میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ "آپ کا خیال ہے نبیل شاہ کے ساتھ آپ کل ہی مذکورہ اپارٹمنٹ میں شفٹ ہو جائیں گی۔ کیا یامین نبیل کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنے گا؟"

"یہ کام میں اس وقت کروں گی' جب یامین اپنی دکان پر ہو گا۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "اپنے اپارٹمنٹ میں پہنچنے کے بعد میں فون کر کے یامین کو بتا دوں گی کہ دیکھو...... ہماری راہیں کس طرح جدا ہو گئیں؟ اسے میرے جانے کا صدمہ ہو یا نہ ہو' لیکن نبیل کی جدائی اسے تڑپا کر رکھ دے گی...... رہی سہی کسر عدالت کا بلاوا پوری کر دے گا۔ وہ تلملا کر رہ جائے گا...... اور میں یہی چاہتی ہوں۔"

مونا کے چہرے پر چمکتی خوشی میں انتقام کے جذبات بھی واضح طور پر دیکھے جا سکتے تھے۔ میں نے ایک اہم نکتے کی جانب متوجہ کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔ "نبیل شاہ کی عمر اس وقت کیا ہو گی؟"

"وہ آٹھ سال کا ہو چکا ہے۔" مونا نے بتایا۔

"نبیل کے حوالے سے وہ آپ پر قانونی دباؤ ڈال سکتا ہے۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "اس سلسلے میں یامین شاہ کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ اس عمر کے بچے کو خلع کی یا طلاق کی صورت میں عدالت ماں کی تحویل میں دینے کے لیے احکام صادر نہیں کر سکتی۔"

"اس کا مطلب ہرگز نہیں کہ عدالت بچے کو زبردستی باپ کے حوالے کر دے گی۔" مونا نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔

"ہاں...... بالکل!" میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ "آپ کا کہنا درست ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں۔"



اس نے پوچھا۔ "ایسی صورت حال میں قانون کیا کہتا ہے؟"

"قانون کے سامنے ایسی سچویشن میں فیصلہ صادر کرنے کے لیے دو راستے ہوتے ہیں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "اگر باپ بچے کو اپنے پاس رکھنے کے لیے اصرار کر رہا ہو تو قانون اس کے اصرار کو سپورٹ کرتا ہے' الا یہ کہ ماں ٹھوس بنیادوں پر یہ ثابت کر دے کہ بچے کا باپ کے پاس رہنا اس کی زندگی اور مستقبل کے لیے انتہائی خطرناک ہے۔ اس صورت میں عدالت بچے کو ماں کے حوالے کر دیتی ہے۔ لیکن شرط وہی ہے کہ ماں' بچے کے باپ کی نااہلی' نالائقی اور غیر ذمہ دار ثابت کر دے تو...... اور میرے خیال میں' یہ کام آپ کے لیے بہت مشکل ہو گا...... جب کہ یامین کے لیے یہی کام بہت آسان ہو گا۔"

"اور دوسرا راستہ کون سا ہے؟" اس نے گھمبیر لہجے میں استفسار کیا۔

"جب دونوں جانب برابر کا زور ہو تو پھر عدالت بچے کی مرضی پیش نظر رکھتے ہوئے فیصلہ کرتی ہے۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ "بھری عدالت میں بچے سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ وہ دونوں میں سے کس کے ساتھ رہنا پسند کرتا ہے' وہ کہاں خود کو محفوظ اور خوش سمجھتا ہے؟ بچہ جس فریق کی سمت اشارہ کر دے اسی کے حوالے کر دیا جاتا ہے تاہم' اس صورت میں فریق دیگر بچے سے میل ملاقات کے لیے چند قانونی باریکیاں بھی ہیں' جو فیصلہ دیتے وقت عدالت دونوں فریقوں پر واضح کر دیتی ہے۔"

"اگر فیصلہ نبیل کے انتخاب پر منحصر ہے' تو مجھے ایک سو ایک فیصد یقین ہے وہ میرے ہی حق میں ووٹ دے گا۔" مونا نے پر وثوق انداز میں کہا۔ "وہ میرے ساتھ باپ کے حالیہ رویے سے پوری طرح آگاہ ہے اور اس سے سخت خفا بھی ہے۔ وہ مجھے چھوڑ کر یامین شاہ کے پاس رہنا ہرگز پسند نہیں کرے گا۔"

"اس نوعیت کے کیسز میں اٹھانوے فی صد بچوں کا ووٹ ماں ہی کے حق میں ہوتا ہے۔" میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "بچے باپ کی بہ نسبت ماں سے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ وہ ماں کی سختی اور زیادتی کو آسانی سے بھلا دیتے ہیں' لیکن اسی ماں کے ساتھ باپ کی طرف سے ہونے والی معمولی سی زیادتی کو بھی وہ ظلم عظیم گردانتے

ہیں۔ فوراً انہیں باپ ظالم اور ماں مظلوم نظر آنے لگتی ہے۔''

''بس تو پھر آپ بسم اللہ کریں۔'' وہ پرجوش لہجے میں بولی۔ ''جیت انشاء اللہ میری ہی ہوگی۔''

میں نے اس سے فیس وصول کی' چند ضروری کاغذات پر اس کے دستخط لیے اور آئندہ روز کیس دائر کرنے کا وعدہ کر کے اس اپنے دفتر سے رخصت کر دیا۔ وقت رخصت اس کا چہرہ جیت کی خوشی سے تمتما رہا تھا۔



آئندہ روز جب میں عدالت سے فارغ ہو کر دفتر میں پہنچا تو میری سیکرٹری نگہت نے بتایا ''سر! میڈم مونا کے چار فون آ چکے ہیں۔''

میں نے چیمبر کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا اور کہا۔ ''ٹھیک ہے' اب اگر ان کی کال آئے تو تم مجھے تھرو کر دینا۔''

''سر! وہ خاصی مضطرب لگ رہی تھیں۔'' نگہت نے مونا کے معاملے میں ذاتی دلچسپی لیتے ہوئے بتایا پھر ہچکچاہٹ آمیز انداز میں پوچھا۔ ''ان کے ساتھ خیریت تو ہے نا۔ وہ کل ہی تو آپ سے ملنے آئی تھیں۔''

''اسٹارز'' کا ایک اپنا ہی کریز ہوتا ہے۔ مونا کی شخصیت کے حوالے سے نگہت اسی قسم کے دلی جذبات کا اظہار کر رہی تھیں۔ میں نے گہری نظروں سے اس کی آنکھوں میں دیکھا' پھر استفساریہ انداز میں کہا ''ہاں' وہ کل مجھ سے ایک طویل ملاقات کر کے گئی تھیں...... پھر؟''

''سر! میرا مطلب ہے......؟'' نگہت گڑبڑا گئی۔ ''ان کے ساتھ کوئی پریشانی تو نہیں۔''

''مجھے تو تمہارے ساتھ کوئی پریشانی دکھائی دے رہی ہے۔'' میں نے بے ساختہ کہا۔ ''جب ہی تم مونا میڈم کے معاملے میں تشویش بھری دلچسپی لے رہی ہو...... ہوں؟''

''سوری سر!'' وہ معذرت آمیز لہجے میں بولی۔

''سوری کی بچی اور اللہ کی بندی!'' میں نے میٹھی ڈانٹ پلاتے ہوئے کہا۔ ''جب



تمہیں میڈم مونا خاصی مضطرب محسوس ہوئی تھیں' تو یہ سوال انہی سے کیوں نہیں پوچھ لیا؟''

''میں نے ان سے پوچھا تھا سر!'' وہ منمنائی۔

''پھر میڈم نے کیا جواب دیا؟''

''انہوں نے کہا جو بھی بات ہے' وہ آپ ہی کو بتائیں گی۔'' وہ قدرے شرمندہ ہوتے ہوئے بولی۔

''اس کا مطلب ہے معاملہ پرائیویٹ اینڈ کانفیڈینشل ہے۔''

''جی سر!'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے دھیرے سے بولی۔

''چنانچہ مجھے' اس بارے میں تمہیں بھی نہیں بتانا چاہیے۔''

اس نے ایک مرتبہ پھر سر کو اثباتی جنبش دی۔ ''جی سر!''

میں نے بے پروائی سے کندھے اچکائے اور اپنے چیمبر میں داخل ہو گیا۔

اگلے ہی لمحے انٹرکام کی گھنٹی بج اٹھی۔ انٹرکام پر عموماً نگہت ہی مجھ سے بات کیا کرتی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ ابھی تو میں اس کے پاس سے آیا ہوں پھر یہ انٹرکام......؟

میں پہلے اطمینان سے جا کر اپنی سیٹ پر بیٹھا' پھر انٹرکام ریسیور اٹھا کر ''ہیلو'' کہا۔ دوسری جانب سے نگہت کی مخصوص آواز ابھری۔

''سر! وہ مونا میڈم......!''

میں نے قطع کلامی کر دی۔ ''ٹھیک ہے...... اگر مونا کا فون ہے تو تم لائن مجھے دے دو۔''

''سر! فون نہیں...... میڈم خود آئی ہیں!'' نگہت نے پُرزور انداز میں انکشاف کیا۔

''اوہ......'' میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا' پھر معتدل لہجے میں کہا۔ ''او کے' میڈم مونا کو میرے پاس بھیج دو۔''

میں یہی سمجھا کہ وہ یہ جاننے کے لیے بے چین ہو گی کہ میں نے اس کے کیس کا کیا کیا۔ اسی سلسلے میں پہلے وہ مجھے فون کرتی رہی' اور اب بہ نفس نفیس چلی آئی تھی۔ اگلے ہی لمحے وہ میرے چیمبر میں داخل ہوئی' اور اس مرتبہ وہ کل کی طرح اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ہمراہ ایک آٹھ نو سالہ لڑکا بھی تھا۔

مجھے یہ اندازہ لگانے میں قطعاً کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ وہ اس کا اکلوتا بیٹا نبیل شاہ تھا۔ ازاں بعد میرا یہ اندازہ سو فیصد درست ثابت ہوا۔

رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے اسے بتایا۔ ”میں نے آج صبح ہی آپ کے خلع والا کیس عدالت میں دائر کر دیا ہے۔ انشاء اللہ! چند روز میں یامین شاہ کو عدالت میں حاضری کا نوٹس موصول ہو جائے گا۔“

”یہ آپ نے بہت اچھا کیا۔“ وہ جوشیلے انداز میں بولی۔ ”آپ نے مجھے خوش خبری سنائی ہے تو ایک خوش خبری مجھ سے بھی سنیں۔“

”ضرور سنائیں جی!“ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا کہ پتا نہیں، وہ کس قسم کی خوش خبری سنانے جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اس سے یہ بھی پوچھ لیا۔ ”پہلے یہ بتائیں، آپ اپارٹمنٹ میں شفٹ ہو گئیں؟“

”وہ سب ہو گیا ہے۔“ وہ سرسری لہجے میں بولی۔

”جی......؟“ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”بیگ صاحب! اس کیس میں آپ کے حرکت میں آتے ہی قدرت بھی مجھ پر مہربان ہو گئی ہے۔“ وہ اضطراری انداز میں بولی۔ ”پتا ہے، آج کیا واقعہ پیش آیا؟“

”میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”قدرت تو انسان پر ہمیشہ ہی مہربان رہتی ہے، لیکن یہ حقیقت بڑی مشکل سے حضرت انسان کی سمجھ میں آتی ہے۔ بہرحال، آپ بتائیں کہ آج کون سا اچھوتا واقعہ رونما ہوا ہے؟“

”وہ آپ نے کہا تھا نا کہ اگر ماں عدالت میں ثابت کر دے کہ بچے کا باپ نالائق، نااہل اور غیر ذمہ دار ہے، اس کی تحویل میں بچے کو چھوڑنا انتہائی خطرناک ثابت ہو سکتا ہے، تو عدالت ماں کے حق میں فیصلہ سنا دیتی ہے...... اور بچہ ماں کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔“ وہ ایک ہی سانس میں بولتی چلی گئی۔

”ہاں میں نے یہی کہا تھا۔“ میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ ”پھر......؟“

وہ جوش بھرے لہجے میں بولی۔ ”اور آپ نے یہ بھی کہا تھا کہ ایسا ثابت کرنا میرے بہت مشکل ہو گا، لیکن قدرت نے اس کا بڑا ٹھیک ٹھاک بندوبست کر دیا ہے۔“



”وہ کیا......؟“ میں نے الجھن زدہ حیرت سے پوچھا۔

”آج یامین نے ہم ماں بیٹے پر قاتلانہ حملہ کرایا ہے۔“

”کیا......؟“ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

”جی ہاں، میں سچ کہہ رہی ہوں۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ”اور یہ قاتلانہ حملہ پولیس کے ریکارڈ میں درج ہو گیا ہے۔“

”ونڈرفل!“ میں نے حقیقی حیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اور وہ واقعہ کیا ہے؟“

مونا سنسنی خیز انداز میں بتانے لگی۔ ”یامین شاہ کے دکان پر چلے جانے کے بعد جب میں نبیل شاہ کو گھر سے لے کر نکلی تو تھوڑی دیر ہی میں مجھے احساس ہو گیا کہ میری گاڑی کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ میں اس وقت پلاننگ کے مطابق، یامین شاہ کا گھر چھوڑ کر اپارٹمنٹ کی طرف جا رہی تھی۔ اپنا اور نبیل کا انتہائی ضروری سامان میں نے پہلے ہی وہاں شفٹ کر دیا تھا۔“

وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے مؤقف ہوئی پھر وہ سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”میں نے سب سے پہلے تو تعاقب گاڑی کا نمبر نوٹ کر لیا۔ وہ ایک ٹویوٹا ہائی لکس تھی۔ فوری طور پر میرا دھیان یامین شاہ کی طرف گیا تھا، کہ شاید اس نے کسی کو میری نگرانی پر مامور کر رکھا ہے۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ گھر پہنچنے سے پہلے کسی پولیس اسٹیشن میں جا کر اس واقعہ کی رپورٹ ضرور درج کراؤں گی۔“ وہ ایک مرتبہ پھر رکی، یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ آیا میں اس کی بات توجہ سے سن بھی رہا ہوں یا نہیں۔ مجھے مکمل طور پر اپنی طرف متوجہ پا کر وہ مطمئن انداز میں آگے بڑھی۔ ”تھوڑی ہی دیر میں متعاقب ٹویوٹا ہائی لکس نے میری گاڑی کو سائیڈ مارنا شروع کر دی۔ وہ بڑے بھرپور انداز میں یہ کوشش کر رہی تھی، کہ میری گاڑی کو الٹا دے۔ میں اس صورت حال سے بوکھلا گئی، تاہم میں نے اپنے حواس اور ہمت کو قابو میں رکھا، اور خود کو اس قاتل ہائی لکس کے حملوں سے بچانے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی دل ہی دل میں اپنی اور نبیل شاہ کی سلامتی کے لیے خدا سے دعا بھی کر رہی تھی، پھر اگلے ہی لمحے خدا نے میری دعا قبول کر

لی۔'' وہ ڈرامائی انداز میں متوقف ہوئی' پھر اضافہ کرتے ہوئے بتانے لگی۔

''کسی ٹریفک پولیس والے نے ہائی لکس کے مذموم عزائم کو بھانپ لیا تھا' اور وہ اپنی تیز رفتار موٹر بائیک پر تعاقب کرتے ہوئے ہماری طرف آ رہا تھا۔ ٹریفک والے کی آمد کو ہائی لکس نے فوراً محسوس کر لیا' اور ''میرے خیال کو'' دل سے نکال کر وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کرنے لگی' تاہم اس کی یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ ٹریفک پولیس والے نے اگلے ہی لمحے سگنل تک پہنچنے سے پہلے ہی ہائی لکس کو گھیر لیا۔ اس لمحے میں بھی وہاں پہنچ گئی۔ اس دوران ٹریفک پولیس والے نے ہائی لکس کے ڈرائیور کو باہر نکال لیا تھا' اور غالباً اس کے چالان کی تیاری کر رہا تھا۔ میں بھی فوراً اپنی گاڑی سے نکلی اور غصیلے لہجے میں ٹریفک والے سے کہا۔

''جناب! صرف چالان سے بات نہیں بنے گی۔ آپ اس شخص کو تھانے تک پہنچائیں۔ مجھ پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے۔ آپ میری گاڑی کی حالت دیکھ رہے ہیں؟'' اس کے ساتھ ہی میں نے اپنی گاڑی کی پچکی ہوئی سائیڈ کی جانب اشارہ بھی کیا۔

میرے تیور اور جارحانہ انداز کو دیکھتے ہوئے ٹریفک والے کے پاس کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ ہائی لکس والے کو حوالہ پولیس کر دے۔ موقع پر درجن بھر افراد بھی جمع ہو گئے تھے۔ لہٰذا ''مک مکا'' کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ہائی لکس سے برآمد ہونے والے شخص کا نام غلام عباس تھا۔ جب تھانے میں پولیس والوں نے میری شکایت پر اس کے ساتھ برتاؤ واقعی کیا تو اس نے اقرار کر لیا کہ یہ قاتلانہ حرکت اس نے یامین کے ایما پر کی تھی' جس کا مقصد مجھے خوف و ہراس میں مبتلا کرنا تھا۔ میں نے پولیس افسر کو بتایا کہ آج میری جانب سے خلع کا کیس دائر ہو گیا ہے۔ میرا شوہر اسی سلسلے میں یہ کمینی حرکتیں کروا رہا ہے۔ پولیس افسر نے مجھے یقین دلایا کہ میں بے فکر ہو جاؤں۔ وہ غلام عباس کو اپنی نگرانی میں رکھیں گے' اور کورٹ میں اس کی گواہی میرے کیس کے لیے تقویت کا باعث ہو گی۔''

وہ ایک مرتبہ پھر متوقف ہوئی' گہری اطمینان بخش سانس خارج کرنے کے بعد مجھ سے پوچھنے لگی۔ ''بیگ صاحب! دیکھیں' قدرت نے میرے حق میں کتنا پکا بندوبست کر دیا



ہے۔ جو شخص اپنی اولاد پر قاتلانہ حملہ کروا سکتا ہے' عدالت اس کی تحویل میں بچے کو کیسے دے سکتی ہے؟''

''ہاں' یہ پوائنٹ تو بہت ہی زبردست ہے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اگر غلام عباس نامی اس شخص نے یامین شاہ کے خلاف گواہی دے دی تو عدالت نبیل کو آپ کی تحویل میں دے دے گی۔''

''وہ کیسے گواہی نہیں دے گا۔'' مونا نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''وہ پولیس کی کڑی نگرانی میں ہے۔''

''ہاں' پولیس کی کڑی نگرانی میں تو ہے' لیکن ہماری پولیس کا حال آپ کو بھی معلوم ہے۔'' میں نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ ''اگر پولیس اور یامین شاہ میں کوئی ڈیل ہو گئی' تو ہم غلام عباس کو ڈھونڈتے ہی رہ جائیں گے۔''

''میرا خیال ہے' پولیس ڈیل کا رسک نہیں لیں گے۔'' وہ پر اعتماد لہجے میں بولی۔ ''اور اس کی چند وجوہات ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ میں نے کوشش کر کے اس واقعہ کی ایف آئی آر کٹوا دی ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے پولیس والوں کو یہ بھی بتا دیا کہ ہے میرا تعلق شوبز سے ہے۔ وہاں تھانے میں بھی میرے دو تین پرستار دریافت ہو گئے تھے۔ ازیں علاوہ' یہ بات بھی میں پولیس کے علم میں لا چکی ہوں' کہ میری جانب سے خلع کا کیس عدالت میں جا رہا ہے۔ ان حقائق میں پولیس یامین شاہ سے کوئی ڈیل کرنے کی حماقت نہیں کر سکتی۔ آپ کا کیا خیال ہے؟''

''آپ نے کام ایسا زبردست کیا ہے کہ میں بھی آپ ہی کا ہم خیال ہوں۔'' میں نے ستائشی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''رہی سہی کسر میں متعلقہ تھانے جا کر پوری کر دوں گا۔''

وہ میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد رخصت ہو گئی۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ عدالت نے اس کیس کا فیصلہ میری موکلہ میمونہ عرف مونا کے حق میں سناتے ہوئے نبیل شاہ کو اس کی تحویل میں دینے کے احکام صادر کر دیئے تھے۔ غلام عباس کی گواہی نے کیس کا پانسا مونا کی جانب پلٹ دیا تھا۔ یامین شاہ لاکھ شور

مچاتا رہا کہ وہ غلام عباس کو جانتا تک نہیں' لیکن غلام عباس کی گواہی کی موجودگی میں عدالت نے یامین شاہ کے شور کو لائق توجہ نہ جانا۔

یہ مونا کی زندگی کا ایک اور سنسنی خیز موڑ تھا۔



اگر دوبارہ مونا سے میری ملاقات نہ ہوئی ہوتی' تو شاید اس کی زندگی کا احاطہ کرنے والی یہ کہانی ادھوری ہی رہ جاتی اور مجھے اس بات کا افسوس بھی ہوتا' لیکن یہ سچ ہے کہ کارخانہ قدرت میں ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے!

کچھ عرصے پہلے مجھے ایک منتھلی میگزین کی تقریب رونمائی میں جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ تقریب ایک مقامی ہوٹل میں منعقد کی گئی تھی' جس میں پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے بھی کافی افراد مدعو تھے۔ وہیں مونا سے میری ملاقات ہوئی۔

وہ بڑے پرتپاک سے ملی۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے پوچھا۔ ''اور کیسی گزر رہی ہے زندگی؟ یامین شاہ نے پھر کبھی آپ پر قاتلانہ حملہ کرانے کی کوشش تو نہیں کی؟''

اس نے برا سا منہ بنایا اور بولی۔ ''یامین شاہ نامی کوئی شخص میری یادداشت میں دور دور تک موجود نہیں...... اور زندگی بہت اچھی گزر رہی ہے البتہ ٹی وی کا کام میں نے کم کر دیا ہے...... نئی نسل جو آ گئی ہے بیگ صاحب!''

''نئی نسل......؟'' میں نے استفساریہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ بولی۔ ''اتفاق سے نبیل شاہ اس تقریب میں موجود نہیں' ورنہ میں آپ کو اس سے ضرور ملواتی۔ آپ نے تو اسے آٹھ نو سال کی عمر میں دیکھا تھا۔ اب تو ماشاء اللہ! جوان ہو گیا ہے اور ٹی وی کا سپر اسٹار بھی ہے۔ وہ اپنی ایک سیریل کی شوٹنگ کے لیے بیرون ملک گیا ہوا ہے' اسی لیے ساتھ یہاں نظر نہیں آ رہا۔''

''اوہ......!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔ ''تو آپ نے بیٹے کو بھی اپنی ہی راہ پر لگا لیا ہے۔''

''اس میں میری مرضی یا زبردستی شامل نہیں تھی۔'' وہ صفائی پیش کرنے والے انداز میں بولی۔ ''وہ اپنی خواہش پر شوبز میں آیا ہے' اور پھر بیگ صاحب!'' وہ گہری سنجیدگی سے



بولی۔ ''اس فیلڈ میں پیسہ بھی ہے اور شہرت بھی۔ آج کل تو نئے نئے پرائیویٹ چینل آ گئے ہیں' جن سے بعض تو خاصا بھاری معاوضہ بھی ادا کرتے ہیں۔ انسان کو اور کیا چاہیے۔ میں تو اب ریٹائر ہو گئی ہوں۔ بس اکا دکا ڈراموں میں کام کر لیتی ہوں' البتہ نبیل کے سیریز کی ایک لمبی قطار لگی ہوئی ہے۔''

وقت کے ساتھ ساتھ اس کی عمر تو بڑھی تھی' تاہم اس کے چہرے کی رعنائی اور تازگی میں کوئی نمایاں کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ میں نے دھیمے لہجے میں مونا سے ایک ذاتی نوعیت کا سوال پوچھا۔

''جب آپ نے یامین شاہ کو چھوڑا' اس وقت آپ ٹی وی کی اسٹار بننے جا رہی تھیں' اور آپ کا سراپا ماشاء اللہ ایسا تھا کہ پیغام دینے والوں کو قطار لگ سکتی تھی۔ کیا آپ نے پھر کبھی شادی کے بارے میں نہیں سوچا؟''

وہ ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے ماضی کے دریچوں میں جھانکنے لگی' پھر اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں بیگ صاحب! اس زمانے میں میرے لئے اچھے اور معتبر رشتوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ اس میں بعض ایسے رشتے بھی تھے کہ میرے انکار پر سنجیدہ حلقوں میں اسے میری بے وقوفی خیال کیا گیا۔ ایک تو پروڈیوسر ہی تھے' جن کی بیوی کا کئی سال پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ میں نے ان جیسا نفیس شخص اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔ لیکن میں نے یامین شاہ سے الگ ہوتے وقت یہ پکا ارادہ کر لیا تھا کہ زندگی میں کبھی شادی نہیں کروں گی۔ شادی کو میں برا نہیں کہہ رہی ہوں' مگر میں اپنے پندار کے ہاتھوں مجبور تھی' میری خودداری اور انا اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ میں کسی یامین شاہ کو یہ کہنے کا موقع دوں' مونا اور سحرش میں کوئی فرق نہیں ہے۔''

''ہوں......'' میں ایک گہری اور پُرسوچ سانس خارج کر کے رہ گیا۔

وہ بولی۔ ''بیگ صاحب! آپ اسے میرا پاگل پن کہہ لیں' لیکن مجھے یہ کسی طور بھی گوارا نہیں کہ کوئی میری سیرت کو میلی نظروں سے دیکھے۔ میری نظر میں سیرت' صورت سے زیادہ اہم ہے۔''

''آپ خوب صورت ہی نہیں' بلکہ خوب سیرت بھی ہیں۔'' بے ساختہ میرے منہ سے

نکلا۔ ''اور آپ کا یہ پاگل پن...... آپ کی صورت اور سیرت سے بھی زیادہ حسین اور دلکش ہے۔''

وہ زیر لب مسکرائی اور سادگی سے بولی۔ ''اب تو میں نبیل شاہ کی شادی کی فکر میں لگی ہوئی ہوں۔''

''کوئی لڑکی وغیرہ دیکھ لی ہے؟'' میں نے شرارت آمیز انداز میں پوچھا۔

'' وہ بولی۔ ''لڑکیوں کی تو کوئی کمی نہیں' لیکن وہ کہتا ہے ابھی پانچ چھ سال تک تو اس بارے میں سوچیں بھی نہیں۔ وہ شادی سے زیادہ اپنے کیریئر کو چمکانے میں لگا ہوا ہے۔''

''آپ کی تو کوشش یہی ہو گی کہ شوبز ہی کے کسی درخشندہ ستارے کو اپنی بہو بنا لیں؟'' میں نے ٹٹولنے والے انداز میں استفسار کیا۔

''میری تو یہی خواہش ہے' لیکن اس کا خیال ہے کہ وہ جب بھی شادی کرے گا تو وہ لڑکی شوبز سے متعلق نہیں ہو گی۔'' وہ ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔

''عجیب پاگل انسان ہے...... خود شوبز میں گردن گردن تک دھنسا ہوا ہے' اس دنیا میں کام کرنا ٹھیک ہے' لیکن شادی نہیں۔''

''واقعی......'' میں نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''نبیل شاہ کی یہ سوچ تو بڑی عجیب ہے؟''

''بیگ صاحب! انسان کا خون کہیں نہ کہیں ضرور جوش مارتا ہے۔''

میں مونا کا اشارہ واضح طور پر سمجھ گیا تھا' لیکن میں نے اس سلسلے میں کوئی تبصرہ کرنا مناسب نہیں سمجھا' کیونکہ اس کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ خوب صورت و خوب سیرت عورت ایک کھلی حقیقت بیان کر رہی تھی۔

